قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2023 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ زبان شناسی
میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:10، اکتوبر 2023

مدیر : پروفیسر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
طباعت اور صحافت — مجید بیدار 7

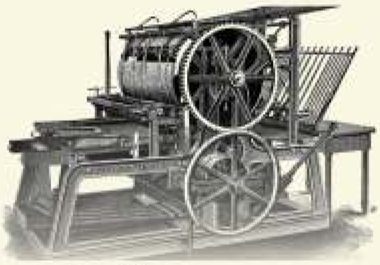

صحت زبان و بیان اور اردو املا — تابش مہدی 10
وضع اصطلاحات: مسائل و امکانات — صابر علی سیوانی 15
اردو کے تانیثی افسانوں میں احتجاجی عناصر — عشرت صبوحی 20
خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ 'روزنامچہ سیاحت' — فیضان حیدر 25
ادب اطفال کا تخلیقی عمل اور بچوں کی نفسیاتی کشمکش — ثاقب عمران 29
مشائخ دہلی کی فارسی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ — غلام اختر 33

نظیر اکبرآبادی کی نظمیہ شاعری — ندیم احمد 38
اردو تذکراتی تحقیق وتنقید میں حنیف نقوی کے امتیازات — محمد عبدالقادر 40
آزادی کے بعد اردو غزل کا بدلتا منظرنامہ — اعجاز احمد شاہ 44

زبان و تعلیم
طلبہ تعلیمی تناؤ کے نرغے میں — سید عاصم سہیل 47

لعل و گہر
مرمت خاں مرمت — سیفی سرونجی 51
گلابی اردو اور ملا رموزی — مختار ٹونکی 53
محقق قاضی عبدالودود — عارف حسن وسطوی 55

مظفر حنفی کی تحریروں میں ہندوستانی عناصر — محمد خوشتر 58

یاد رفتگاں
لذت کش آلام کا شاعر سید فضل المتین چشتی — نورین علی حق 61
ناشاد اورنگ آبادی — اطہر انصاری 64

نگر نگر اردو
تلنگانہ میں اردو کا منظرنامہ — شمس الہدیٰ دریابادی 66

ماحولیات
ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کے لیے طرز حیات میں تبدیلی — آفتاب عالم 70

خصوصی گفتگو
صالح ابن تابش سے انٹرویو — خیال اثر 73

نیا آسمان نئے ستارے
اردو میں تاریخی ناول نگاری — عمار شاہد 75

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 78

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 89

ہماری بات

ہندوستان ایک کثیر لسانی، ثقافتی اور مذہبی ملک ہے یہاں طرح طرح کی بولیاں، زبانیں اور کلچر ہیں۔ ہر خطے اور علاقے کی شناخت و پہچان اس کی زبان اور تہذیب سے ہی ہوتی ہے۔ بولی سے زبان اور زبان سے ادبی شکل اختیار کرنے میں بہت سے سماجی، سیاسی اور تہذیبی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ زبان ان اسباب سے متاثر ہو کر غیر شعوری طور پر نئی شکل اختیار کرتی ہے اور ایک ترقی یافتہ زبان بنتی ہے۔ سنسکرت سے پراکرت، پراکرت سے اپ بھرنش اس کے بعد ریختہ اور اردو تک پہنچنے میں بہت سی بولیوں، زبانوں، خطوں اور تہذیبوں کے اثرات رہے ہیں۔ اردو کے اس ارتقائی سفر میں بہت سے الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال الگ الگ خطوں اور علاقوں کے داخل ہوئے ہیں اس طرح اردو کا ہیولی ثروت مند ہو کر باضابطہ زبان اور پھر ادبی زبان بنا۔

کسی بھی زبان اور ادب کی تاریخ اسی وقت مکمل مانی جائے گی جب اس کے ہر پہلو اور جز کا احاطہ کیا جائے۔ اس زبان و ادب کے فروغ میں جتنے بھی خطوں اور علاقوں کی شمولیت رہی ہو سبھی کو اس کا حصہ بنایا جائے۔

اردو زبان خالص ہندوستانی زبان ہے جس کے فروغ و ترقی میں اس ملک کے مختلف خطوں اور علاقوں کے ادبا، شعرا اور دانشوروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہر خطے کے شعرا اور ادبا کا زبان و ادب میں کچھ نہ کچھ اثر پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے میں شعری اور نثری اصناف کے موضوعات، اسالیب، ہیئت اور تکنیک میں بھی نئے نئے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جب ہم کسی علاقے کی ادبی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو صرف زبان اور ادب تک ہی اس کا دائرہ نہیں رہتا بلکہ وہاں کے ادبا اور شعرا کے ساتھ اس علاقے کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں اور صورت حال کا بھی ذکر ہوتا ہے۔

جس زمانے میں اردو کی تاریخ مرتب کی جاری تھی اس زمانے میں وسائل اور رابطے کی کمی تھی پھر تاریخ لکھنے والوں کا تعلق عموماً مرکزی خطے سے تھا اس وجہ سے اردو زبان و ادب کے ارتقا اور فروغ کی تاریخ مرتب ہوئی تو بہت سے ایسے خطے اور علاقے نظر انداز کر دیے گئے جو مرکزی خطے سے دور تھے۔ بہت سے علاقے کسی زمانے میں زبان و ادب کے حوالے سے انفرادی شناخت رکھتے تھے مگر اب ان میں سے بیشتر کا ذکر بھی نہیں ہوتا۔

اسی طرح تاریخ نگاری میں معاصر شعرا اور ادبا کو بھی زبان و ادب کی تاریخ کا حصہ بنایا جانا چاہیے اگر صرف سابقہ روایت کے مطابق مرکزی لوگوں پر ہی توجہ مرکوز رہے گی تو بہت سے نئے قلمکار، شعرا اور ادبا تاریخ کے صفحات میں جگہ پانے سے محروم رہیں گے۔

یہ دور سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کا ہے، برقی نیٹ ورک ہمارے پاس بہت مضبوط ہے، ان وسائل کا استعمال کرکے ہم الگ الگ علاقوں کے تذکرے اور تاریخ میں توسیع کر سکتے ہیں۔ قریات و قصبات پر توجہ دینے سے اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا میں جن چھوٹے چھوٹے قریات و قصبات کی خدمات رہی ہیں ان کی شناخت بھی مستحکم ہوگی اور ادب کی افادیت و مقبولیت کو بھی مزید وسعت ملے گی۔

اس پہلو پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے توجہ بھی دی ہے، مگر اس پر اردو کے سبھی اداروں اور محققین کو توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر ہم علاقائی سطح پر اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کریں گے تو بہت سے علاقوں کے حوالے سے نئی تصویر ہمارے سامنے آئے گی اور اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا میں جن علاقوں کا حصہ رہا ہے ان کی خدمات بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جائیں گی۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

'اردو دنیا' ستمبر 2023 وصول ہوا۔ اس کے سرورق پر تمام تر اردو چھائی ہوئی ہے مع ایک مصرعۂ ستائش کے۔ اس کی ترتیب کوئی تیرہ اصناف ادب سے مزین ہے۔ 'ہماری بات' کے تحت ادبی گتھیوں کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ اولاً تخلیق کار کے مطالعے و مشاہدے میں گہرائی و گیرائی کا ہونا از حد ضروری ہے۔ ناقد کے لیے بھی یہ صفت اول درجہ رکھتی ہے۔ تنقید نگار کا معیار مطالعہ و مشاہدہ تخلیق کار سے بلند و بالا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ دوران تنقید تخلیق کار کے محاسن و معائب کا بخوبی درست اندازہ کر سکے۔ ہمارے یہاں ادبی جمود و تعطل کی بنا پر بیشتر مغربی نظریات و رجحانات کو اختیار کرنا پڑتا ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ہمارا بھی قابل قدر حصہ ہوتا تو کچھ اور ہی منظر ہوتا۔

ربط والتفات میں ڈاکٹر رؤف خیر کا فکر انگیز مراسلہ نظر سے گزرا۔ لیکن اسے کلی طور پر باور کر لینا گراں گزرتا ہے۔ کیونکہ اس میں کچھ کوتاہیاں بہرحال راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بارے میں بار بار یہ کہنا کہ "انھوں نے اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی"، گراں گزرتا ہے۔ خواجہ کے ادبی مرتبے کے مطابق اسی بیان کو مزید نرم لہجے میں بھی لکھا جا سکتا تھا۔ موصوف کے اس مراسلے کی تفہیم درج ذیل تحقیقی کتب کے چند اوراق و پیراگراف کی مدد سے بدرجہا بہتر ہو سکتی ہے۔

(i) 'دکن میں اردو' نصیر الدین ہاشمی ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1985 (ص 50، 51)

(ii) جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، ادبیات (1) قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2013 (ص 116)

(iii) اردو ادب کی مختصر تاریخ: ڈاکٹر انور سدید، ایم آر پبلی کیشن، نئی دہلی 2015 (ص 123)

اب کیا بتائیں ایسی ناقابل یقین آوازیں مرزا ہادی رسوا کی مشہور کتاب امراؤ جان کے بارے میں بھی اٹھی تھیں کہ یہ رسوا کی نہیں بلکہ کسی اور کی تحریر ہے لیکن ان بیانات کی تادم کوئی شنوائی نہ ہو سکی۔

یہ شمارہ اس لحاظ سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ تخلیق و تنقید سے جو بات چلی تھی وہ اخیر تک بلا کم و کاست جاری رہی۔ 'ادب: زاویے اور جہات' میں کوئی سات تحقیقی و تنقیدی مقالے شامل ہیں۔ اس میں پہلا مضمون ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا 'نحویات کیا ہے؟' ہے جو اس لحاظ سے کلاسیکی ہے کہ اس میں کئی اصناف ادب شامل ہوتے ہیں جن کے بغیر یہ عنوان مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اردو قواعد (صرف و نحو)، لسانیات، صوتیات، صرفیات وغیرہ۔ انھوں نے اس خوبی سے ان خشک مضامین کو مرتب کیا ہے کہ گویا اہل علم کے لیے دیدہ زیب جواہرات پرو دیے ہیں۔ اس مضمون کی ابتدا متعلقہ اصطلاحات کی وضاحت سے کی گئی ہے جو آئندہ سطور کو سمجھنے میں ناگزیر ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ علم صرفیات اجزائے کلام کی بحث سے متعلق ہوتا ہے۔ پھر نحوی ترکیب میں جملے کے اجزائے متصلہ کی تفہیم کی گئی ہے۔ اسی طرح علم نحو، الفاظ کے تسلسل و تشکیل پانے والے جملوں کے تجزیے پر منتج ہوتا ہے۔ اس کے بعد الفاظ/اجزائے کلام، جزئیاتی عناصر اور نمودار تبدیلیوں کے ایک ستون کی مدد سے وضاحت کی گئی ہے۔ رموز، اوقاف اور اعراب کی بھی وضاحت بخوبی کی گئی ہے۔ تفہیم کے دوران جن جن مثالوں سے مدد لی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ لسانیات کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ مضمون بعنوان 'ہندوستان میں نسائی نظم کے متنوع موضوعات' سفینہ بیگم کا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا اردو نظم میں خواتین کی تخلیقی استعداد سے ہوئی جن میں ہندو پاک کی کوئی ڈیڑھ درجن نظم نگار خواتین کی فہرست پیش کی گئی۔ ان شاعرات کے موضوعات بحث کی گئی ہے۔ مضمون اپنے اندر انفرادیت رکھتا ہے لیکن کہیں کہیں یہ تانیثیت کی جانب راغب ہوتا ہے اور مرد اساس معاشرہ پر طنز کرتا ہے۔ حالانکہ مرد و زن ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان کے مسائل بھی شکلیں بدل بدل کر انھیں زچ کرتے رہتے ہیں۔

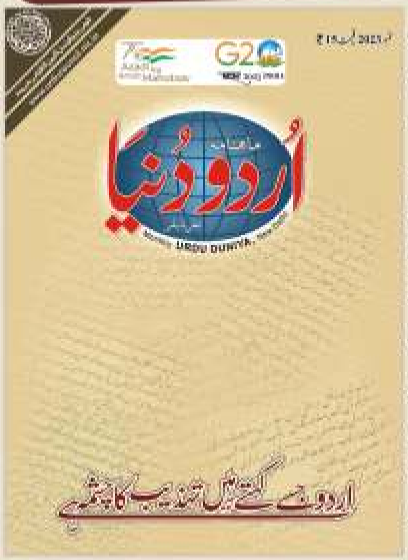

مضمون بعنوان 'خواب باقی ہیں ایک تجزیاتی مطالعہ' ڈاکٹر سید وجاہت مظہر ہے۔ اس میں آل احمد سرور کی کتاب 'خواب باقی ہیں' کا تجزیاتی مطالعہ چھ حوالہ جاتی کتب کی مدد سے کیا گیا ہے۔ اس کی شروعات انھوں نے سوانح نگاری کے معنی و مطلب سے کی ہے اور اس سلسلے میں ایک طویل تمہید باندھی ہے۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے

طوالت ضروری ہے۔ زبان اتنی صاف ستھری اور ادبی ہے کہ قاری اس میں کھو سا جاتا ہے۔ 'پت جھڑ کی آواز' از معراج احمد معراج نے تانیثیت اور لاتانیثیت کے فرق کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ بڑا انوکھا موضوع ہے۔ اب تک تو تانیثیت کا ہی غلغلہ تھا بہرحال مصنف نے قرۃ العین حیدر کی 'پت جھڑ کی آواز' کا اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس کے دوران ایک نکتہ یہ آتا ہے کہ "دراصل ہماری سوسائٹی اس قابل ہی نہیں ہوئی کہ وہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہضم کر سکے۔" بقیہ دو مضامین متن کی قرأت پر ہیں۔ 'زبان و تعلیم' کے تحت جناب فرحت علی کا مضمون بعنوان 'اختراعی تدریس و اکتساب'۔ اس میں تدریس کے کچھ اختراعی طریقوں پر بحث کی گئی ہے جو طلبا تک معلومات پہنچانے میں مؤثر رول ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ڈیجیٹل میڈیا کے اقسام جیسے متن، تصاویر، آڈیو اور ویڈیو، انٹرایکٹیو اپلیکیشن یا پریزنٹیشن شامل ہیں۔ اس میں تدریس کے اختراعی طریقوں پر نکات در نکات اور پھر اکتساب کے اختراعی طریقوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور آخر میں ان کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ کمپیوٹر سے وابستہ طلبہ کو اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔ 'لعل و گہر' میں کوئی پانچ ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں پہلا مضمون 'آسمان ادب کا روشن ستارہ گیان چند جین' جناب ایم-اے کنول جعفری کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی ابتدا زبان اُردو سے کی گئی اور پھر پروفیسر گیان چند جین کی ابتدائی زندگی، تعلیم، کارگزاریوں اور تخلیقات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اکمل شاداب نے مضمون 'مخطوطہ شناس محی الدین قادری زور' پر کوئی 16 مراجع و مصادر کی مدد سے محی الدین قادری زور کی علمی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ 'یادِ رفتگان' میں تین شخصیات کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ جبکہ 'عربی ادبیات' میں ڈاکٹر ثمامہ فیصل نے 'عربی ادب میں سفرنامہ نگاری کی روایت' کا جائزہ لیا ہے۔ 'کتاب دریچہ' میں کم از کم دو کتابوں 'سن لائٹ اون اے بروکن کالم' اور 'گل نغمہ' کے علاوہ مضمون کے عنوان پر دی گئی تین کتابوں نے محترمہ ہما کوثر کو کافی کچھ متاثر کیا ہے۔ 'زبان اور زمینی صورت حال' کے ذیل میں قابل قدر مضمون بعنوان 'زبانوں کے نصاب میں سائنسی علوم کی شمولیت ضروری ہے' دیا گیا ہے۔ اس مضمون کو ڈاکٹر افتخار احمد نے پیش کیا ہے۔ اسے 'اُردو دنیا' کے فراہم کردہ دروبست میں دیے گئے سوالنامہ کے بموجب تیار کیا گیا ہے لیکن عنوان اور اس کے موضوعات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ 'یادیں باتیں' میں جناب شعیب نظام نے عرفان صدیقی کی کچھ باتیں یاد کر کے مطالعے کے لیے پیش کیے ہیں۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' میں دو مضامین ہیں۔ 'مابعد جدیدیت اور اُردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا' جناب پیرزادہ محمد زاہد نے تحریر کیا ہے۔ نہایت سنجیدہ اور ادبی مضمون ہے۔ جس میں مابعد جدیدیت اُردو افسانہ اور افسانہ کے لیے کارگر تخلیقی فضا پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون جناب صدام حسین مضطر کا ہے۔ انھوں نے مشہور شاعر شجاع خاور کے کلام پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس مضمون کو جابہ جا اُن کے کلام سے سنوارا ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' کے تحت کوئی تیرہ کتابوں کا تعارف اور تبصرہ دیا گیا ہے جن کی مدد سے آپ اپنی پسند کی چند یا تمام کُتب حاصل کر سکتے ہیں۔

مصطفی ندیم خاں غوری: بی 11، گرین دیلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'جشن 75 سالہ آزادی کا امرت مہوتسو' اردو جسے کہتے ہیں تہذیب کا چشمہ ہند سے آراستہ اردو کی اہمیت و افادیت کو بتاتا مجلّہ 'اردو دنیا' بذریعہ ڈاک باصرہ نواز ہوا۔ اردو دنیا تمام تر جدید موضوعات پر مبنی، عمدہ مشمولات اور پرمغز تخلیقات کی بہار کھلاتا ہوا، اذہان کو دعوت غور و فکر دیتا ہوا، نہایت خوش خرامی سے تمام تر عالمی جریدوں میں NCPUL کی ادبی سرگرمیوں میں چار چاند لگا رہا ہے۔ دلی مبارکباد! اراکین 'اردو دنیا' کی نظر انتخاب کی داد نہ دینا ادبی حق تلفی ہوگی۔ اداریے میں تنقیدی نقطۂ نگاہ سے پیش کردہ افکار دور حاضر کے قلمکاروں، ریسرچ اسکالرز اور اساتذۂ کرام کے لیے لمحۂ فکریہ ہے اور ادب کو نئی جہت یا نیا نظریہ عطا کرنے کا اہم موقع بھی ہے۔ تنقید و تحقیق نیز تخلیق ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

بہرحال ادب زاویے اور جہاں زیب و تعلیم، لعل و گہر، یادِ رفتگاں، کتاب دریچہ، زبان اور زمینی صورت حال، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا اور خبرنامہ دریا کو کوزے میں سمونے کا فن کوئی آپ اراکین اردو دنیا اور محترم مدیران سے سیکھے کہ

سخت دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

یہ ایک زندہ حقیقت اور فطری امر ہے کہ ہر کس و ناکس کو اپنے گھر، اپنے کنبہ، اپنے گاؤں، اپنے شہر، اپنے ضلع، اپنی ریاست نیز اپنے ملک سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ میں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے عالمی شہرت یافتہ رسالے 'اردو دنیا' کے ص 9 سے 12 تک شہاب ظفر اعظمی کا ایک معیاری، معلوماتی اور دلچسپ مضمون دیکھا جس کا عنوان ہے 'اردو فکشن پر بہار کے علاقائی اور تہذیبی اثرات'۔ موصوف نے یقیناً عنوان کا حق ادا کر دیا ہے۔ ویسے تو اس میں بہت سارے فکشن نگاروں کا ذکر ہے جو قابل احترام ہیں اور بہت سارے چھوٹ بھی گئے ہیں جن میں ایک نام میرے پڑوسی 'شفق' کا نام بھی شامل ہے۔ مرحوم حسین الحق صاحب کا نام بھی پڑھ کر خوشی ہوئی۔ حسین الحق صاحب میرے والد ماجد ماہر عربی، فارسی، اردو، مولوی عبد الوحید خاں غازی شمسی کے ٹاؤن ہائی اسکول، سہسرام میں شاگرد رہ چکے ہیں۔ محترم شہاب ظفر اعظمی صاحب کا یہ مضمون دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

اگست 2023 کا اردو دنیا بھی دیگر شماروں کی طرح مشمولاتی نقطۂ نظر سے اپنے آپ میں مخزن مطالعہ ہے۔ وفیات کی فہرست میں ناشاد اورنگ آبادی صاحب کو دیکھ ان کے تعلق سے بہت ساری یادیں تازہ ہو گئیں۔

شکیل سہسرامی: ازدرحمان مسجد، بمن پورہ، راجہ بازار، پٹنہ 14 (بہار)

ماہ نامہ 'اردو دنیا' (اگست 2023) موصول ہوا۔ سابق کی طرح حسن ترتیب، موضوعات کا انتخاب خوب ہے۔ اداری میں قابل قدر باتیں کی گئی ہیں۔ ربط و التفات میں گذشتہ شمارے سے متعلق قارئین اپنی گراں قدر رائے پیش کرتے ہیں جس سے مشمولات پر نقد و نظر کے لحاظ سے نظر ڈالی جاتی ہے۔

اردو فکشن پر بہار کے علاقائی اور تہذیبی اثرات کا جائزہ اچھا مقالہ ہے۔ رضوان لطیف خاں کا تحریک آزادی میں رام پور کا حصہ، تحریک آزادی میں مسلم رہنماؤں کا کردار اور جناب اسلم جمشید پوری کا علامہ عشق سحر آبادی کا ادبی سحر، ایک مختصر مگر اچھا تحقیقی مقالہ ہے۔ اب علاقائی اور کم شہرت یافتہ ادبا و شعرا پر محققین کو مزید توجہ کرنے کی ضرورت ہے جسے اسلم صاحب نے بخوبی انجام دیا ہے۔ نیا دور ایک عہد ساز رسالہ بھی توجہ طلب مقالہ ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کی شخصیت اردو زبان و ادب کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ آج کوئی بھی محقق شبلی پر کام کرنے کے لیے الیاس صاحب کی کتابوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ معروف افسانہ نگار اشتیاق سعید کا ڈاکٹر الیاس اعظمی سے انٹرویو نہایت فکر انگیز ہے اس میں عہد حاضر میں زبان و ادب کی موجودہ صورت حال پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ دیگر مشمولات بھی خوب ہیں۔

محمد عرفان جونپوری: محلہ: میرمست، جونپور، یوپی، موبائل 9044424208

مجید بیدار

طباعت اور صحافت

عالمی سطح پر جب چھاپہ خانے کی ایجاد ہوئی تو اس کے ساتھ ہی مختلف قسم کے نئے امکانی وسائل کو فروغ کے مواقع فراہم ہوگئے۔ فرانس کی نشاۃ الثانیہ کے نتیجے میں انسانی ہاتھ کے بجائے مشینوں کی کارکردگی کی وجہ سے کام کی رفتار اور پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ ہر شعبہ حیات کی ترقی کے معاملے میں مشینوں کی ضرورت اور اہمیت کی وجہ سے انسانی زندگی پر مشینوں کی حکمرانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگر چھاپہ خانہ نہ ہوتا تو بلاشبہ عالمی سطح سے متعلق ہر ترقی کا مرحلہ خطرے کا شکار ہو جاتا۔ بہر حال کاغذ کی صنعت کو بھی مشینوں کی تیاری کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی اور مخصوص ہاتھ سے کاغذ بنانے کی صنعتوں کے بجائے مشینی صنعت کی رفتار سے کاغذ کی پیداوار میں اضافہ ہوگیا۔ اسی طرح قدیم دور میں مٹی کی تختیوں اور چمڑوں پر لکھنے کے علاوہ پتھر کی تختیوں اور کھجور کی شاخوں کے علاوہ چھالوں پر لکھنے کی تاریخی خصوصیات کے بجائے کاغذ پر لکھنے اور اسے پیش کرنے کی روایت شروع ہوئی، جس کے نتیجے میں صحافت کو فروغ حاصل ہوا۔ بیک وقت صحافت کی ترقی جہاں اخبار کی صنعت کی پروردہ ہے، وہیں کاغذ سازی اور سیاہی کی تیاری کے معاملے میں انسانی ہاتھ کے بجائے کارخانوں کی صنعتوں کی وجہ سے دیگر کاموں کے علاوہ صحافت کو فروغ حاصل ہوا۔ عالمی سطح پر اسپین، سسلی اور ترکی کے راستے سے یوروپ کے ملکوں میں دستی کاغذ سازی کا فن فروغ پانے لگا۔ اس دور تک دستی کاغذ ہی عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔

سب سے پہلے انگلستان میں 1492 میں کاغذ سازی کا کارخانہ قائم ہوا، جس کے بعد چھالوں اور چمڑوں پر لکھنے کے بجائے انگلستان میں کاغذ پر لکھنے کی روایت شروع ہوئی۔ بڑی بڑی مشینوں سے کاغذ تیار کیا جانے لگا اور مشینوں سے کاغذ کی تیاری کی وجہ سے طباعت کو فروغ حاصل ہوا۔ پرنٹنگ کی کہانی بھی بڑی عجیب ہے، کیونکہ قدیم زمانے میں ایران، عراق، شام اور ترکی کے باشندے مٹی کی تختیوں پر لکھا کرتے تھے۔ گیلی مٹی کی تختیوں پر تصویریں اتارنے کا رواج قدیم مصر کے باشندوں میں موجود رہا۔ ان تمام پرانی چیزوں پر ترقی کا اثر اس وقت دکھائی دیتا ہے جبکہ کاغذ بنانے کے لیے مشینوں کا آغاز ہوا اور قدیم دور میں موجود طریقے جیسے گوند، کاجل اور پانی کو ملا کر روشنائی یا سیاہی بنائی جاتی تھی۔ اس کے بجائے کارخانوں میں سیاہی کی تیاری کا آغاز ہوگیا تو اس طریقے سے پرنٹنگ پریس یا پھر طباعت کے لیے پکی سیاہی کی تیاری آسان ہوگئی۔ ہر زبان کی تحریر کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ ایشیائی ممالک میں موجود بے شمار زبانوں میں تحریر لکھنے کی روایت بھی جداگانہ ہے۔ کچھ زبانیں سیدھی جانب سے لکھی جاتی ہیں، جن میں عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانیں شامل ہیں، جبکہ کچھ زبانیں بائیں جانب سے سیدھی جانب لکھی جاتی ہیں، جن میں سنسکرت، ہندی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری مقامی زبانیں شامل ہیں۔ کچھ زبانوں کو ریاضی کے ہندسوں کی طرح لکھا جاتا ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف تحریر کی جاتی ہیں۔ چینی، جاپانی اور دوسری زبانیں اسی انداز کی نمائندہ ہیں۔ قدیم تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کاغذ سازی کی صنعت کا آغاز 134ھ مطابق 751ء کے دوران عربوں کی جانب سے سمرقند کا علاقہ فتح ہونے کے بعد چند چینی کاغذ سازوں کو گرفتار کیا گیا، جن سے عربوں نے کاغذ سازی کی صنعت کا ہنر سیکھا۔ چنانچہ مسلمان دور حکومت میں کاغذ سازی کی صنعت کو دستی صنعت کا درجہ حاصل ہوگیا۔ مشرق کے مشہور شہروں سمرقند، بخارا، بغداد، دمشق، قاہرہ اور قرطبہ میں کاغذ کے دستی کارخانے قائم ہونے لگے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں جیسے کشمیر، دولت آباد اور احمد آباد میں بھی کاغذ سازی کے دستی کارخانوں کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا مشہور کاغذ سمرقندی کاغذ کہلاتا تھا۔ غرض صحافت کی سب سے بڑی ضرورت کاغذ اور سیاہی اور اشاعت کے مرحلے میں طباعت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح طباعت کی تکمیل یا پرنٹنگ پریس کی موجودگی کی وجہ سے ہی صحافت کی ترقی کے راستے ہموار ہوئے۔ صحافت چاہے کسی بھی زبان کے اخبار سے تعلق کیوں نہ رکھتی ہو، یا ادبی رسائل سے متعلق کیوں قائم نہ ہو، علم و فن اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی نمائندگی کے جدید طریقوں میں چھاپہ خانے کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

دنیا میں سب سے پہلے جرمنی کے شہر مینز جیسے مقام پر گوٹنبرگ نامی جوہری نے مہر بنانے اور آئینہ سازی میں مہارت حاصل کی۔ اس کا مشغلہ ہی یہی تھا کہ وہ ہیرے جواہرات کو تراشنے اور آئینوں کو کاٹنے کا کام کیا کرتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے حروف کاٹنے اور حروف بنانے کی بنیاد رکھی۔ جرمنی کے مقام پر 1471 میں سب سے پہلے ولیم کیکسٹن نامی انگریز نے فن طباعت کے طریقے پر توجہ دی، پھر جرمنی کے توسط سے یہ فن انگلستان منتقل ہوا جہاں ویسٹ منسٹر نے اپنا ذاتی خانگی پریس قائم کیا۔ جس کے ذریعے ہاتھ سے لکھی جانے والی کتابوں کو مشین کے ذریعے اشاعت یا چھاپنے پر توجہ دی گئی۔ فن طباعت کی ترقی میں پرنٹنگ پریس یا مطبع کی اہمیت سے انکار نہیں

کیا جاسکتا۔ آج بھی ساری دنیا میں اخبارات اور رسائل کی اشاعت اس لیے ممکن ہوگئی ہے کہ اس کے توسط سے کاغذ پر سیاہی کے ساتھ بہ یک وقت کئی ہزار صفحات کی اشاعت کے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ پرنٹنگ پریس کے ذریعے ایسی سہولت فراہم ہونے کی وجہ سے صحافت کے پیشے اور اخبارات کی اشاعت کے لیے ماحول تیار ہوگیا۔ اس پس منظر میں صحافت کی تمام تر ترقی کو پرنٹنگ پریس کی مرہون منت قرار دینا مناسب قرار دیا جائے گا، جہاں کاغذ پر کبھی نہ مٹنے والی تحریر کی اشاعت ممکن ہو جاتی ہے، اسی لیے صحافت کی تمام تر ترقی کو پرنٹنگ پریس یا طباعتی مرکز یا چھاپہ خانے کی ضرورت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اخبار ہو یا رسالہ و جریدہ، ہر ایک کی اشاعت کے لیے نہ صرف پرنٹنگ پریس کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اخبار کے مختلف شعبہ جات سے وابستہ افراد کی عمدہ کارکردگی کی وجہ سے ہی اشاعت کے مرحلے تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ اس لیے ادبی صحافت ہو یا اخباری صحافت، ان دونوں معاملات کی تکمیل کے لیے جہاں کاغذ کی موجودگی ضروری ہے، وہیں سیاہی یا روشنائی کے علاوہ اس کی چھپائی کی تکمیل کے بغیر صحافت کی ذمہ داریوں کو مکمل نہیں قرار دیا جاسکتا، اس طرح ساری دنیا کی زبانوں میں شائع ہونے والے مواد کا تعلق مختلف چھاپہ خانوں کی بروقت کارکردگی کا مرہون منت ہے۔ جن کے ذریعے معلومات کی فراہمی ہی نہیں، بلکہ عام انسان تک اہم معلومات کی دسترس کے لیے ان وسائل کے استعمال سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

صحافت درحقیقت عربی زبان کا ایسا لفظ ہے جو اردو میں فارسی کے توسط سے منتقل ہوا۔ تاریخی پس منظر میں صحافت کی معنوی حیثیت مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ لغوی اعتبار سے صحافت کی تعریف اور وضاحت اور اس کی صداقت کے ساتھ ساتھ قدامت کے بارے میں مختلف حقائق موجود ہیں۔ عام زبان میں صحافت کے ذریعے اخبار نویسی ہی نہیں، بلکہ اخبارات یا جرائد کی زندگی کے لیے نامہ نگاری یا پھر خبر رسانی کے طریقوں کی تکمیل کی جاتی ہے۔ لازمی طور پر صحافت کے حقیقی مفہوم میں وہ تمام علوم وفنون اور تفریح کے علاوہ کھیل کود، جرائم اور اطلاعات کے وسائل شامل ہو جاتے ہیں، جن کے ذریعے کوئی اخبار یا رسالہ شہریوں، عام انسانوں اور اہل زبان کو معلومات فراہم کرنے کے مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے صحافت ایک ایسا وسیلہ ہے، جس کے ذریعے کوئی بھی تحریر ایک سے زیادہ تعداد میں شائع ہو کر لوگوں تک پہنچائی جائے گی۔ صحافت کی بنیادی ضرورتوں اور اس کے آغاز اور ارتقا کے بارے میں بھرپور جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ صحافت کے مختلف رویوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ثابت کیا جائے کہ اخباری صحافت اور ادبی صحافت میں موجود اشتراک اور تفریق کے امکانات کیا ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ادبی صحافت کے پس منظر میں مختلف حقائق اور امکانات کو منظر عام پر لایا جائے گا۔

قدیم دور سے ہی عالمی ممالک کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں خبروں کی فراہمی کے مختلف ذرائع موجود تھے، بادشاہوں کے درباروں میں وقائع نویس اور خبر نویسوں کے علاوہ باضابطہ ڈاک وتار کے نظام کی وجہ سے اطلاعات اور معلومات کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کا طریقہ موجود تھا۔ جدید ترقیات کے نتیجے میں دنیا میں بہت بڑا انقلابی رجحان یہ پیدا ہوا کہ ایک وقت میں بے شمار نقول تیار کر کے انہیں دنیا کی کسی بھی زبان میں پیش کرنے کا طریقہ انسان کے قابو کا حصہ بن گیا، جس کے نتیجے میں اخباری صحافت اور ادبی صحافت کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، سماجی اور ترقیاتی ہی نہیں، بلکہ ملک وقوم کے عروج وزوال اور مختلف تنظیمی، فلاحی اور خیراتی کاموں اور ان سے متعلق اطلاعات کو پیش کرنے کی ضرورت بلاشبہ کسی بھی اخباری صحافت کی دلیل ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ اشاعت کے وہ مرحلے جو روزنامہ، دوپہرنامہ، شامنامہ، دو روزہ، سہ روزہ، ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اساس کی نمائندگی کے علمبردار ہوں، انہیں اخبارات کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں News اور Views کی نمائندگی، جن کے ذریعے اطلاعات اور نظریات کی پیشکش کو اخباری صحافت Newspaper Journalism کی وجہ قرار پاتی ہے، اس کے بجائے شاعری، نثر نگاری اور اس کی مختلف اصناف کے علاوہ تحقیق وتنقید کی نمائندگی کرنے والی صحافت کو اخباری صحافت سے بالکل مختلف اور ادبی صحافت Literary Journalism کی حیثیت سے شناخت دی جائے گی۔ اردو ادب کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اس زبان کے املا، انشا اور طرز تحریر کے علاوہ پیشکش کی مختلف خصوصیات کو نمائندگی دینے کے سلسلے میں نہ صرف اخباری صحافت کو عروج حاصل ہوا، بلکہ ادبی صحافت بھی فروغ پانے لگی۔ جیسا کہ ابتدا میں بتایا جاچکا ہے کہ اخباری صحافت ہو یا ادبی صحافت، ہر دونوں کی ترقی کے لیے نہ صرف کاغذ اور چھاپہ خانے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسی کے ساتھ اشاعت کے مرحلوں کو بھی اہمیت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ادبی صحافت ہو یا اخباری صحافت ہر دونوں کی تکمیل کئی افراد اور لکھنے والوں کی وجہ سے ممکن ہے۔ خبر رساں ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کی کوششوں کی وجہ سے اخباری صحافت کو فروغ حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ ابتدا میں بتایا جاچکا ہے کہ پرنٹنگ ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخباری صحافت ہی نہیں، بلکہ ادبی صحافت کو بھی فروغ حاصل ہونے لگا۔ ایک دور تھا جبکہ اخبارات اور رسائل اگرچہ مشین پر شائع ہوتے تھے، لیکن لیتھو پریس کی موجودگی سے ہمہ رنگی طباعت ممکن نہیں تھی، مشین کی طباعت کے باوجود لینوٹائپ مشین اسی وقت کارگر ہوتی تھی، جبکہ مشین آپریٹر موجود ہو، جو انگلیوں سے بٹن کو دبا کر اشاعت کا کام انجام دیتا تھا۔ کیلا ٹائپ مشین بھی اردو میں اشاعت اور چھپائی کی ضرورت بنی، لیکن موجودہ دور میں رنگین طباعت اور آفسیٹ پریس کی وجہ سے پرنٹنگ ٹکنالوجی نے کافی ترقی کرلی ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف اخبارات اور کتابیں اور اس کے ساتھ ہی رسائل وجرائد کی تیز رفتار اشاعت میں اضافہ ہوگیا ہے بلکہ مختلف سائز کے علاوہ مختلف رنگوں کے ساتھ نہ صرف نقاشی کے نمونے چھاپہ خانے کے ذریعے پیش ہو رہے ہیں بلکہ اب تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ پرنٹنگ ٹکنالوجی کی ترقی اور آفسیٹ مشین کی ترقی یافتہ رنگین طباعت کی وجہ سے اخبارات ورسائل کے علاوہ کتابوں کی خوشنما اشاعت کو فروغ حاصل ہو چکا ہے۔

اخباری صحافت کے توسط سے بلاشبہ اطلاعات اور نظریات پیش کرنے اور ان سے اختلاف کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے۔ ادبی صحافت میں تحقیق وتنقید کے ذریعے اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہوتی ہے تاہم ادبی صحافت کے تمام نکات شعری اور نثری اصناف کے علاوہ ہر دور میں ان کی ترقی یا تنزل اور ان کے تاریخی پس منظر سے آگاہی سے وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخباری صحافت کے ساتھ ساتھ اردو کی ادبی صحافت کی سرگرمیوں کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحافت کی تفہیم ہی مخصوص انداز کی نمائندگی ہے۔ اس سلسلے میں صحافت کی تاریخ نہ صرف ادبی پس منظر میں ترقی کرنے لگی بلکہ علمی اور عملی سطح پر بھی ان کی ترقیات کا دائرہ حد درجہ وسیع ہے۔ لازمی ہے کہ اخباری صحافت کا موضوع اپنی مخصوص شناخت رکھتا ہے لیکن ادبی صحافت کے پس منظر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا جانا ضروری ہے کہ طباعت کی ترقی کی وجہ سے جہاں عالمی سطح پر اخباری صحافت کو فروغ حاصل ہوا وہیں ادبی صحافت بھی ادبیات کے نثر ونظم کے پس منظر میں اہمیت کی حامل ہوگئی

ہے۔ دنیا کے بے شمار ممالک اور لاتعداد زبانوں میں اخباری صحافت اور ادبی صحافت کے بے شمار نمونے منظر عام پر آگئے۔ ہندوستان جیسے کئی زبانوں کے ملک میں صحافت کی نمائندگی کے دوران ادبی اور اخباری صحافت کے نمایاں نقوش واضح ہو چکے ہیں۔ اس لیے اخباری صحافت کے علاوہ ادبی صحافت کی ترقی کے پس منظر کو پیش کرنا ضروری ہے۔ اس موضوع کے ذریعے اخباری صحافت کے بجائے ان رسائل وجرائد پر گفتگو کی جائے گی ،جن کا تعلق علم وفن اور ادبیات سے گہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو رسائل و جرائد کی تاریخ کے محاکمے پر توجہ دی جائے۔ ایسے جرائد ورسائل نہ صرف علمی اور تعلیمی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اردو دنیا میں رسائل کا مرحلہ کافی وسیع ہے۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقیات اور تنزل کو اخبارات اور صحافت کے ذریعے اور اطلاعات کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا، جبکہ رسائل کے توسط سے قانونی رسائل، زرعی رسائل، تعلیمی رسائل، اقتصادی رسائل، تدریسی اور خواتین کے رسائل، بچوں کے رسائل کے علاوہ گلدستے اور ایسی ہی موضوعاتی درجہ بندی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو دنیا میں جہاں اخباروں کی صحافت نمایاں ہے، وہیں علمی اور ادبی رسائل کی بے شمار اشاعتوں سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مطبع یا چھاپہ خانے کی شروعات کے بعد ہی عالمی سطح پر اخبارات ورسائل کا سلسلہ دنیا کی بے شمار زبانوں میں عام ہوا۔ ادبی رسائل وجرائد میں بھی مختلف قسموں کی نمائندگی ہوتی ہے ،جن کے ذریعے شعری اور نثری اصناف کے علاوہ تنقید وتبصرہ کی گنجائش برقرار رہتی ہے۔ ان ادبی خصوصیات کے علاوہ واقعات اور ادبی خبروں کی اشاعت بھی ادبی صحافت کا حصہ قرار پاتی ہے۔ کسی بھی زبان میں شائع ہونے والے رسائل کا طریقہ اخبار کے انداز سے جداگانہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسائل اور جرائد کی شناخت اور اس کی ساخت اخبار سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ماہنامے، دوماہی ،سہ ماہی ، ششماہی اور سالنامے کی اشاعت کو رسائل میں شامل کیا جاتا ہے۔ رسائل کے لیے انگریزی میں استعمال ہونے والی اصطلاح Journal کی حیثیت سے شناخت کی جاتی ہے۔ کسی خاص انجمن یا ادارے کی نمائندگی کرنے والے رسالے کو جریدہ ،مجلّہ یا Magazine کہا جاتا ہے۔ جبکہ کسی خاص فکر کی وضاحت سے وابستہ رسالے کو ترجمان یا Spokesman کہا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور اصطلاح انگریزی میں مروج ہے جسے Periodical قرار دیا جاتا ہے۔ جرنل کے لیے رسالہ یا جریدہ اور پیریاڈیکل کے لیے اردو میں یہی انگریزی اصطلاح مروج ہے، جو وقفے وقفے سے یا طویل وقفے سے شائع ہونے والے رسالوں کے لیے مختص ہے۔ اس قسم کے رسائل وجرائد کو انگریزی میں پیریاڈیکل قرار دیا جاتا ہے۔ 2 سال یا 5 سال کے علاوہ دہ سالہ یا پھر پندرہ سالہ یا 20 سال کے بعد کوئی رسالہ شائع کیا جائے تو اسے رسالہ یا جریدہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ سلور جوبلی (جشن سیمیں) گولڈن جوبلی (جشن زریں) ڈائمنڈ جوبلی (جشن الماس) کے علاوہ پلاٹینم جوبلی کے علاوہ صد سالہ تقاریب پر شائع ہونے والے رسالے انگریزی زبان میں پیریاڈیکل قرار دیے جاتے ہیں۔ اس طرح ادبی صحافت کے لیے جہاں ماہنامے، دوماہی، سہ ماہی، ششماہی اور سالنامے شہرت رکھتے ہیں، وہیں دو سال، پانچ سال، دس سال، پندرہ سال، بیس سال یا 25 سال کے علاوہ 50 سال اور 60 سال گزارنے اور 75 سال کے وقفے میں شائع ہونے والے رسائل کی حیثیت ادبی صحافت کی دین ہے، لیکن ایسے رسائل کو انگریزی میں پیریاڈیکلس کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں جنتری کے انداز سے شائع ہونے والے سالانہ رسالوں میں ہر مہینے کے اعتبار سے اہم واقعات کی تفصیلی صراحت ہوتی تھی، اس قسم کے رسالوں کو" تقویم "،کہا جاتا تھا۔ تقویم کے متبادل کے طور پر انگریزی زبان میں مستعمل اصطلاح 'Almanac' کو بھی پیریاڈیکل میں شمار کیا جاتا ہے۔

ادبی صحافت کے توسط سے ایسے تمام نقوش واضح ہوتے ہیں، جن کے ذریعے ادبی صحافت کی سرگرمیوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ کسی تنظیم ، ادارے یا پھر انجمن کے علاوہ سوسائٹی کی جانب سے اس کے 25 یا 50 سال گزارنے اور 75 سال اور سو سال پر شائع ہونے والے ادبی رسالے کو پیریاڈیکلس کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اردو کی ادبی صحافت میں ان تمام امکانات کی گنجائش موجود ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں اس قسم کی روایت کے موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اخباری صحافت پر بھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ادبی صحافت کی بھی نمائندگی ہوتی رہی ہے، غرض جہاں اخباری صحافت کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے وہیں ادبی صحافت کے ذریعے بھی بے شمار کارناموں کا احاطہ ممکن ہے۔ جس طرح اردو زبان کی صحافتی تاریخ میں اخبار کی حیثیت سے " جامِ جہاں نما،، کو اہمیت حاصل ہے جو 1822 میں منظر عام پر آیا جو 27 مارچ 1828 کو کولکتہ سے شائع ہونے والا ہفتہ وار اخبار تھا۔ اس کے ابتدائی شمارے اردو میں اور پھر فارسی میں شائع ہوتے رہے، جس کے ساتھ اس اخبار کا اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا۔ اخباری صحافت کے تمام دائرے وسیع تر ہیں، جن میں روزنامے، دو روزہ، سہ روزہ اور ہفت روزہ کے علاوہ پندرہ روزہ اخبارات بھی شامل ہیں، جبکہ ادبی صحافت میں ماہنامہ اور دوماہی رسالوں کی کوئی کمی نہیں۔ ان رسالوں کا آغاز 1837 سے ہوا، امریکہ کی مشنری سوسائٹی نے عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت کی غرض سے ایک اہم اردو ماہنامہ 'خیر خواہ ہند' مرزا پور بنارس سے 1837 میں جاری کیا، جس کے ایڈیٹر لندن مشنری سوسائٹی کے پادری آر سی ماتھر تھے۔ اس جریدے کو اردو کا پہلا ماہنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ جس میں شائع ہونے والے مضامین کا انداز فارسی اور رومن خط سے وابستہ تھا، لیکن اس کی زبان اردو تھی۔ چند سال بعد یہ رسالہ بند ہوگیا، لیکن 1861 میں دوبارہ شائع ہوا تو اس ماہنامے کی اشاعت میں فارسی مضامین کے علاوہ ناگری رسم الخط کو بھی شامل کیا گیا۔ اس رسالہ کی جانب سے 1860 میں دو معلوماتی مضامین پر مختص کتابیں شائع کی گئیں، جو 'منتخب العلم' اور 'مفرح القلوب' کے نام سے شہرت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے بارے میں امداد صابری نے یہ لکھا ہے کہ یہ کتابیں لیتھو طریقے پر شائع ہوئی تھیں، جن کے لیے بھاپ کی کلوں اور دخانی جہازوں کے علاوہ انگلستان کی آہنی سڑکوں کی تیاری کی طرح لیتھو طریقے پر طباعت ہوئی تھی۔ جس کے مشمولہ مضامین میں مختلف ممالک کے پرانے باشندوں کی معلومات شائع ہوتی رہیں، غرض اردو کا پہلا روزنامہ 'جام جہاں نما' 1822 میں شائع ہونے کے بعد اردو کا پہلا ماہوار رسالہ 1837 میں شائع کیا گیا۔ اس اعتبار سے اخباری صحافت کے 15 سال بعد ادبی صحافت کے ذریعے علمی اور تحقیقی وتنقیدی خدمات سے وابستہ رسالے کی اشاعت عمل میں آئی، اس طرح اردو صحافت میں پہلے اخباری صحافت کی کارکردگی کو اہمیت حاصل ہوئی، جبکہ ادبی صحافت کو فروغ پانے کے لیے 15 سال کا وقفہ گزر گیا۔ چنانچہ آج بھی اخباری صحافت کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت کی سرگرمیوں اور کارگزاریوں کے بارے میں مقالے ،مضامین اور تحقیق وتنقید کے ساتھ تجزیے کے طریقے رائج ہیں جو ادبی صحافت کے فروغ کی ضمانت قرار پاتے ہیں۔

■

Prof. Majeed Bedar
Ex. Dept of Urdu
Osmania University
Hyderabad-500007(Telangana)

صحتِ زبان و بیان اور اردو املا

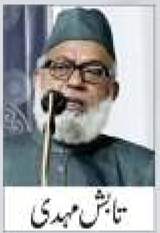

تابش مہدی

اردو کا دائرہ بہ تدریج پھیلتا اور وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اس کو بولنے، سمجھنے اور پسند کرنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ پوری دنیا میں اردو کی نئی نئی بستیاں آباد ہورہی ہیں۔ یورپ، امریکا، عرب ممالک، امارات اور دور و نزدیک کے دوسرے ممالک میں کسی نہ کسی سطح پر اس کے فروغ و ارتقا کے سلسلے میں کوششیں ہورہی ہیں۔ ہمہ وقتی یا شبینہ و صباحی مدارس و مکاتب قائم ہورہے ہیں۔ وہاں آئے دن اردو کی مجلسیں اور محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ چھوٹے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔

زبان ایک ایسا آلہ ہے یا آوازوں کا مجموعہ جس کے ذریعے ایک انسان اپنے خیالات وجذبات دوسرے انسان تک منتقل کرتا ہے، اسلوب زبان کو مزید موثر بناتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے، جو انسان اور غیر انسان کے درمیان دیوار کھڑی کرتی ہے۔ انسان وہی ہے، جس کے اندر نُطق و گویائی ہو اور وہ اپنی ضروریات کے اظہار کے لیے حرف وصوت کا سہارا لینے پر قادر ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم اُسے گونگا کہیں گے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جس شخص کا بولنے چالنے، ادائے روز مرہ اور مافی الضمیر کے اظہار کا انداز، جتنا معیاری اور اعلیٰ ہوگا، اتنا ہی اعلیٰ اور معیاری اس کا وہ پیام ہوگا، جسے وہ کسی ضرورت کے پیش نظر کسی فرد یا اجتماع تک پہنچانا چاہ رہا ہے۔

انسانی دنیا میں کتنی زبانیں بولی یا سمجھی جاتی ہیں، ان کا شمار دشوار ہے۔ خود ہمارے ملک ہندستان جنت نشان میں درجنوں زبانیں بولی، سمجھی اور لکھی، پڑھی جاتی ہیں۔ سب کے اپنے اپنے انداز اور ڈھب ہیں۔ یہ سب اپنے علاقوں کے باشندوں کے ذریعے سے ان کی ضروریات کے مطابق وجود میں آئی ہیں۔ اردو بھی ایک زبان ہے۔ اس کی بھی ایک تاریخ ہے۔ اس وقت یہ دنیا کی بڑی اور عظیم علمی وتہذیبی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا امتیاز یہ ہے کہ یہ کسی قوم، ملک یا خطۂ ارض تک محدود نہیں ہے اور نہ یہ کسی مذہب وملت کے زیرِ اثر وجود میں آئی ہے۔ ہر علاقے و دیار میں اور ہر قوم و مذہب کے لوگ اسے بولتے، سمجھتے اور لکھتے ہیں۔

اردو، دنیا کی متعدد چھوٹی، بڑی زبانوں کی آمیزش سے وجود میں آئی ہے۔ سب سے اس نے حسب ضرورت استفادہ کیا ہے، اپنے دامن کو موتیوں سے بھرا ہے اور اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی ہے۔ آپ اس میں بے شمار زبانوں کے اچھے، صاف ستھرے اور دلوں میں جگہ پیدا کرنے والے الفاظ پائیں گے۔ میں اکثر یہ کہتا ہوں اور علمی دنیا کے متعدد علما اور دانش وروں کے اقوال سے اس کی تائید وتصویب ہوتی ہے کہ اردو زبان خالص تحقیقی، ترجیحی اور تہذیبی زبان ہے۔ اس کی شیرینی، مٹھاس، نزاکت، تاثیر اور خوشبو کو وہی لوگ محسوس کرسکیں گے، جنھوں نے ایسی مجلسیں، محفلیں اور صحبتیں پائی ہیں، جہاں اس کی آرائش و زیبائش کا التزام ملتا ہے اور مسلسل اس کا انداز و اسلوب، محل استعمال، محاورات اور روز مرہ ان کا موضوع گفتگو رہتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور نزاکتوں تک محض لغات یا سندوں اور ڈگریوں کے ذریعے سے نہیں پہنچا جاسکتا۔

اردو کا دائرہ بہ تدریج پھیلتا اور وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اس کو بولنے، سمجھنے اور پسند کرنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ پوری دنیا میں اردو کی نئی نئی بستیاں آباد ہورہی ہیں۔ یورپ، امریکا، عرب ممالک، امارات اور دور ونزدیک کے دوسرے ممالک میں کسی نہ کسی سطح پر اس کے فروغ وارتقا کے سلسلے میں کوششیں ہورہی ہیں۔ ہمہ وقتی یا شبینہ وصباحی مدارس ومکاتب قائم ہورہے ہیں۔ وہاں آئے دن اردو کی مجلسیں اور محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ چھوٹے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔

اردو زبان اپنی مذکورہ بالا تمام خوبیوں اور انفرادیتوں کے باوجود بعض پریشان کن اور ترقی کی راہ میں موانع پیدا کرنے والے مسائل سے بھی دوچار ہوتی رہی ہے۔ اُن میں اس کا تلفظ اور املا دونوں سرِفہرست ہیں۔ ان دو چیزوں نے اردو کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان پہلوؤں سے بے پناہ بے احتیاطیاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی رہی ہیں۔ اب بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ مسائل صرف عوام یا کم خواندہ طبقے تک محدود نہیں ہیں، اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ افراد، مصنفین اور اربابِ درس وتدریس بھی ان کا شکار رہے ہیں۔

علم وادب، تحریر وتصنیف اور تقریر وخطابت کی دنیا میں الفاظ اور اُن کے تلفظ کی ہمیشہ اور ہر دور میں اہمیت رہی ہے۔ علما اور اربابِ نظر نے ہمیشہ ان کی معنویت، لغوی حیثیت، محلِ استعمال، تلفظ اور طرزِ ادا پر زور دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تحریر یا تقریر کی عمارت جملوں پر کھڑی ہوتی ہے اور جملے الفاظ سے بنتے ہیں۔ الفاظ کے بغیر ابتدائیہ، خبریہ یا انشائیہ جملوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صورت میں یہ بات صاف اور واضح ہوجاتی ہے کہ اصل حیثیت الفاظ کی ہے۔ تقریر یا تحریر کا اصل حسن اسی وقت سامنے آتا ہے، جب اس بات کا پورا پاس ولحاظ رکھا گیا ہو کہ اس میں زیرِ استعمال الفاظ کی لغوی حیثیت

کیا ہے، اس کا تلفظ کیا ہے، اس کی ادائی کس طرح ہوئی ہے اور جہاں اور جس سلسلے میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں وہی لفظ مناسب ہے یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جانا چاہیے تھا؟۔ اس احساس سے انحراف کر کے جو عبارت لکھی جائے گی یا بات کی جائے گی، وہ صاحب نظر قاری یا سامع کے لیے تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوگی۔ وہ تقریر یا تحریر اپنے موضوع کی اہمیت و ناگزیری کے باوجود بے اثر اور غیر مفید رہے گی۔ جو لوگ تقریر، تحریر یا اپنی عام زندگی میں موقع و محل کا خیال نہیں رکھتے، وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہتے۔

سچ کہا ہے وسیم بریلوی نے:

کون سی بات کہاں کیسے کہی جاتی ہے
یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے

املا

لفظ یا جملے میں املا ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اسی سے مصنف کی پہچان ہوتی ہے۔ ویسے املا تحریروں میں ہی دیکھا اور جانا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی یہ تقریر میں بھی اپنا رنگ دکھا دیتا ہے۔ جیسے: لفظ شخص میں شین پر زبر ہے، خا پر ساکن اور صاد پر بھی ساکن۔ اسے اگر کوئی شخص، شین اور خا دونوں کو زبر کے ساتھ بولتا یا لکھتا ہے تو وہ تحریر کی بجائے تقریر ہی میں پہچانا جائے گا۔

املے میں پہلی چیز تو یہ دیکھی جاتی ہے کہ لفظ میں کن کن حرفوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ دوسری چیز مستعمل حرفوں کی ترتیب دیکھنے کی ہوتی ہے۔ تیسری چیز یہ دیکھنے کی ہوتی ہے کہ جو حروف استعمال کیے گئے ہیں، ان میں صحیح حرکات کا استعمال کس حد تک ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال املا کی تعریف کے ذیل میں دے دی گئی ہے۔ علم کو عِلَم، قَلَم کو قَلْم، حُکْم کو حُکُم، شَکْل کو شَکَل، گُرْم کو گُرُم، سِحْر کو سِحَر یا سَحَر کو سِحْر یا سِحَر لکھنا یا بولنا بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایسی غلطیوں کا اندازہ تحریروں میں تو نہیں ہو پاتا لیکن تقریروں، گفتگوؤں اور اشعار میں ہوتا ہے۔ ایسی غلطیوں سے تقریر یا گفتگو میں بھی کرکرا پن آجاتا ہے اور اشعار بھی بے بحرے ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسی غلطیاں ہیں، جن میں اچھے خاصے لوگ غچا کھا جاتے ہیں۔

ان شاء اللہ/ انشاء اللہ یہ ایک پاکیزہ اور مقدس جملۂ ناقص ہے۔ یہ ادھورا جملہ عربی کا ہے لیکن عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں میں بھی بہ کثرت استعمال ہوتا ہے۔ اس کے املے کے سلسلے میں لوگ شدید غلطی کا شکار ہیں۔ سب انشاء اللہ الف، نون اور شین کو ملا کر لکھتے ہیں۔ جب کہ یہاں 'ان' کا استعمال حرف شرط کے طور پر ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے 'اگر اللہ نے چاہا'۔ ایسی صورت میں الف اور نون کو 'شا' سے الگ ہی لکھنا چاہیے۔ قرآن مجید میں بھی یہ الگ ہی استعمال ہوا ہے۔

نون غنہ (ں)

خطابیہ کے آخر میں نون غنہ (ں) لگانے کا بھی رواج عام ہے۔ اے جوانو! اے دوستو! اے مسلمانو! کو غنہ لگا کر اے جوانوں، اے دوستوں اور اے مسلمانوں لکھا اور بولا جاتا ہے۔ اس سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے۔ غنہ تو اس وقت لگے گا، جب انھیں ہم غائب کے صیغے میں استعمال کریں۔ مثلاً:

جوانوں نے کہا، دوستوں نے سنا، دشمنوں سے مت ڈرو، اور مسلمانوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

مصدر

فارسی میں مصدر کی پہچان دن یا تن ہے۔ لیکن اردو میں 'نا' (نون اور الف)۔ جیسے:

کھانا، پینا، لینا، دینا، جانا، پانا وغیرہ۔

مصدری لفظ کے سلسلے میں دبستان دہلی کا عمل یہ ہے کہ یہ اسم اور فعل کے تابع ہے۔ وہ مذکر ہے تو یہ بھی مذکر ہے، وہ مؤنث ہے تو یہ بھی مؤنث۔ مثلاً: روٹی کھانی ہے، دوا لینی ہے، کتاب پڑھنی ہے۔ شہر جانا ہے، کل اُسے کھانا کھلانا ہے اور درزی کے یہاں کرتا سلانا ہے۔ وغیرہ

ہا اور الف

اردو املا ہا اور الف کے سلسلے میں اکثر موضوع بحث بنا رہتا ہے۔ حالاں کہ ذرا سی توجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کہاں الف لکھا جائے گا اور کہاں ہا۔ یہاں 'ہا' سے ہماری مراد ہائے مختفی سے ہے۔ ہائے مختفی وہ 'ہا' ہے، جو ہم کسی لفظ کے آخر میں لکھتے ہیں اور ہمیشہ اُسے الف کی آواز میں بولا جاتا ہے۔ وزن شعری میں بھی وہ الف ہی کا قائم مقام رہتا ہے۔ ہائے مختفی سے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ یہ صرف عربی یا فارسی الفاظ کے آخر میں ہی آئے گی۔ جیسے:

طلبہ، صوفیہ، کعبہ، ادویہ، مدینہ، مرثیہ، صفحہ، آموختہ، شگفتہ، گزشتہ، رفتہ، دستہ، بستہ، کہنہ وغیرہ جو الفاظ عربی یا فارسی کے نہیں ہیں ان کے آخر میں ہم الف لکھیں گے۔ جیسے:

پتا، راستا، رستا، بھروسا، اکھاڑا، پسینا، پٹاخا، پیسا، روپیا، راجا، مہینا، ڈاکیا،

ڈھانچا، جھروکا، چبوترا، دھبا، ٹھپا، ڈونگا وغیرہ

بعض ماہرین لسانیات نے بعض شہروں کے ناموں کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔ مثلاً: امروہہ، کلکتہ، پٹنہ وغیرہ لیکن استثنا کی حیثیت بس استثنا کی ہے۔ اس سے قاعدہ نہیں بدلے گا۔

'ہا' کی قسمیں

'ہا' کی تین قسمیں ہیں: ہائے ملفوظ، ہائے مخلوط اور ہائے مختفی۔

ہائے مخلوط وہ 'ہا' ہے، جو کسی لفظ کے شروع میں آتی ہے یا درمیان میں۔ یہ اپنے پورے تلفظ کے ساتھ بولی یا لکھی جاتی ہے۔ جب یہ کسی لفظ کے شروع میں آتی ہے تو شوشے دار لکھی جاتی ہے۔ جیسے: ہم، ہو، ہجرت، ہر۔ اس کی پہچان کے لیے نیچے ایک علامت (ٖ) لگا دیتے ہیں۔ اس علامت کو بعض علاقوں میں لٹکن بھی کہتے ہیں۔

اگر 'ہا' کسی لفظ کے درمیان میں آئے گی تو اسے کہنی دار لکھیں گے۔ پہچان کے لیے اس کے نیچے بھی لٹکن لگائیں گے۔ جیسے: بہت، نہیں، کہیں، مہینا، کہنہ وغیرہ۔

جب ہا کسی لفظ کے آخر میں لکھیں گے تو اسے ہائے مختفی کی شکل میں لکھیں گے۔ البتہ اس کے نیچے پہچان کے لیے لٹکن لگائیں گے، جو کہ عام ہائے مختفی کے نیچے نہیں لگاتے۔ جیسے: وجہ، کنبہ، شُبہ فلک، گنہ (گناہ کا مخفف) اور کُہنہ وغیرہ۔ لیکن ہا کی اس شکل پر انکاری 'نہ' یا کاف بیانیہ 'کہ' کو قیاس نہ کریں۔ 'نہ' ہمیشہ نون پر زبر کے ساتھ ہی لکھا اور پڑھا جائے گا اور 'کہ' کاف کے زیر کے ساتھ۔ شعری وزن میں بھی یہ دونوں ن اور ک ہی رہیں گے۔

ہائے مختفی کے سلسلے میں مزید باتیں

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ہائے مختفی ہمیشہ عربی یا فارسی الفاظ کے آخر میں آتی ہے۔ ہائے مختفی میں 'ہا' سے پہلے والا حرف ہمیشہ زبر کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن جب ایسے کسی لفظ کو امالے کے ساتھ پڑھیں گے یا لکھیں گے تو ہا سے پہلے والا حرف زیر کے ساتھ ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ہا کو یائے مجہول (ے) سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے قصیدہ سے قصیدے، درجہ سے درجے، مرثیہ سے مرثیے، رتبہ سے رتبے اور جذبہ سے جذبے وغیرہ۔

امالہ ایک ضروری عمل ہے۔ اس کے بغیر تقریر، تحریر یا شعر میں بدنمائی اور مضحکہ خیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ داغ دہلوی کا بہت مشہور شعر ہے۔

کسی کا مجھ کو نہ محتاج رکھ زمانے میں
کمی ہے کون سی یارب! ترے خزانے میں

اس شعر کے پہلے مصرعے میں اگر زمانہ اور دوسرے مصرع میں خزانہ پڑھا یا لکھا جائے تو یہ بات اہل نظر کے درمیان دیر تک مذاق و تمسخر کا موضوع بنی رہے گی۔ یہی بات شہروں کے ناموں کے سلسلے میں بھی ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

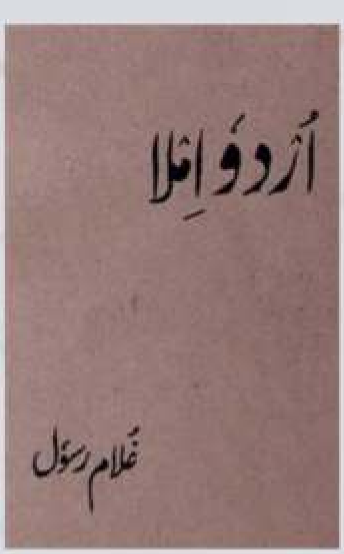

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

داغ دہلوی کا بڑا پیارا سا شعر ہے۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

مذکورہ بالا دونوں شعروں میں اگر کلکتے کو کلکتہ اور سینے کو سینہ پڑھیں گے یا لکھیں گے تو یہ ایک مقبوح و مکروہ بات ہوگی۔

ہمزہ

ہمزہ حرف بھی ہے اور علامت بھی۔ مثلاً: جلوۂ یار، کوچۂ جاناں اور حوصلۂ مرداں میں ہمزہ کا استعمال علامتِ اضافت کے لیے ہے اور جاؤ، کھاؤ، سائل، مسئلہ، علاء الدین، شاء اللہ، ماشاء اللہ اور ان شاء اللہ میں حرف کے طور پر۔

جن الفاظ کے آخر میں الف ہے، ان میں اضافت کے وقت ہمزہ کا استعمال نہیں ہوگا۔ یائے مجہول (ے) کافی ہے۔ جیسے: ابتدائے عشق، انتہائے شوق، صدائے دل، دانائے راز وغیرہ

جن الفاظ کے آخر میں یائے معروف (ی) ہے، وہاں بھی ہمزہ نہیں رہے گا۔ آسانی کے لیے یا کے نیچے بس زیر لگادیں گے۔ جیسے: روشنیِ دل، بندگیِ خدا، مرضیِ مولیٰ، سرخیِ حنا، تجلیِ کعبہ وغیرہ۔ البتہ اگر کسی لفظ کے آخر کی یا میں ہمزہ شامل ہے تو وہاں ہمزہ ضرور لکھیں گے اور سہولت کے لیے نیچے زیر بھی لگادیں گے۔ جیسے: تماشائیِ حیات، دانائیِ انسان اور بے وفائیِ دوست وغیرہ

چائے، رائے، ہائے اور جائے وغیرہ میں بھی عدم اشباع کی صورت میں ہمزہ نہیں ہے۔ ہم چائے پئیں گے، یہ ان کی رائے ہے۔ اقبال کی مناجات کا یہ شعر اکثر لوگ بے وجہ اشباع کر کے ساقط الوزن کر دیتے ہیں۔

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

اگر دونوں مصرعوں میں جائے کو جائے لکھیں گے یا پڑھیں گے تو دونوں مصرعے بحر سے خارج ہو جائیں گے۔

’گی‘ کا استعمال

بعض الفاظ کے آخر میں ’گی‘ کا استعمال کر دیا جاتا ہے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ جن الفاظ کا آخری حرف ہائے مختفی ہے، جو کہ صرف عربی یا فارسی الفاظ میں لکھا جاتا ہے، ان میں ’گی‘ کا استعمال کیا جائے گا۔ جیسے: آہستہ سے آہستگی، شگفتہ سے شگفتگی، شایستہ سے شایستگی، زندہ سے زندگی، پختہ سے پختگی، اور آزردہ سے آزردگی وغیرہ۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ’گی‘ کا استعمال درست نہیں۔ جیسے ناراض سے ناراضگی نہیں ناراضی لکھیں گے اور بولیں گے اور ادا سے ادائیگی نہیں بل کہ ادائی لکھیں گے اور بولیں گے۔

’ہ‘ اور ’ھ‘

’ہ‘ کا استعمال تو عام ہے۔ اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ملفوظی ہے۔ جیسے: یہاں، جہاں، کہاں، بہت اور مہینا وغیرہ لیکن ’ھ‘ جسے دو چشمی ہا بھی کہتے ہیں، اس کا استعمال ہمیشہ کسی حرف کو ہندیانے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ حروف جنھوں نے دو چشمی ہا کی مدد سے ہندی کا جامہ پہنا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ۔

دو چشمی ہا کا اصطلاحی نام ہائے مخلوط بھی ہے۔ اس کی آواز اپنے سے پہلے والے حرف میں شامل ہو کر نکلتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے بالا حروف سے اندازہ کیا ہوگا۔ ہائے مخلوط کے حرف کو دو چشمی ہا سے ہی لکھیں گے۔ اگر کسی نے مجھے، تھے، چولھے، ننھا، جھاڑو، انھیں، انھوں نے، تمھیں، تمھارے، جنھیں، سیدھا، پڑھنا وغیرہ کو ہائے ملفوظی سے مجہے، تہے، چولہے، جہاڑو، انہیں، جنہیں، تمہیں، انہوں نے، تمہارا، تمہاری وغیرہ لکھ دیا تو یہ غلط املا ہوگا۔ ان تمام الفاظ میں ہمیشہ ہائے مخلوط ہی استعمال کریں گے۔ میر کا مشہور شعر ہے۔

سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ ’سرھانے‘ کو اگر ہم ’سرہانے‘ لکھ دیں گے تو املا بھی غلط ہوگا اور ایک عظیم شاعر کے شعر کو ساقط الوزن کرنے کے بھی مرتکب ہوں گے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جس طرح سے ہائے مخلوط والے حروف کو ہائے ملفوظ سے لکھنا املے کا عیب ہے، اسی طرح سے ہائے ملفوظ والے حروف کو ہائے مخلوط (ھ) سے لکھنا بھی ایک بڑا عیب ہے۔ جیسے:

ہے کو ھے، ہو کو ھو، ہمیں کو ھمیں، ہونا کو ھونا، ہند کو ھند، ہم کو ھم، لاہور کو لاھور اور ہوا کو ھوا وغیرہ لکھنا۔

الفاظ کو الگ الگ لکھنا

اردو کو آسان، زیادہ قابلِ فہم اور حسین بنانے کے لیے علمائے زبان و بیان نے بعض لفظوں کو الگ الگ کر کے لکھنے کی سفارش کی ہے۔ ایسی صورت میں درج ذیل الفاظ کو الگ الگ لکھنا زیادہ مناسب ہوگا:

لے کر، دے کر، کے لیے، اس کا، ان کا، جن کا، اس میں، دل میں، اَن پڑھ، اَن جان،

بے اثر، بے خوف، بے قرار، بے حیا، بے عزت، فن کار، شاہ کار،

دولت خانہ، دانش مند، دانش ور، طاقت ور، عقل مند، پان دان وغیرہ

بہ

بہ کو ہم چاہے جس معنی میں استعمال کریں، اسے الگ ہی لکھا جائے گا۔ جیسے:

بہ نظرِ اصلاح، بہ وقت، بہ رنگِ میر، بہ عافیت، بہ خیریت، بہ صد ادب و احترام،

بہ ذاتِ خود، بہ ہر صورت، بہ ہر حال، بہ قدرِ ضرورت، بہ مشکل، بہ غور وغیرہ

دو لفظوں کے درمیان بھی ’بہ‘ کا استعمال الگ ہی رہے گا۔ جیسے:

ماہ بہ ماہ، دم بہ خود، دم بہ دم، جاں بہ لب، سر بہ سجدہ، صحرا بہ صحرا، صدا بہ صدا،

کو بہ کو، شہر بہ شہر وغیرہ

واو

اردو میں بعض الفاظ ایسے ہیں، جن میں اصول اور قاعدے کے بغیر درمیان میں کبھی کبھی واو کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ وہاں ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ الفاظ یہ ہیں:

اُس، اُن، دکان، مٹاپا، لُہار، اُدھار، دہرایا، دہرانا، پہنچا، پہنچ، خرد (چھوٹا) اور ہندستان وغیرہ۔

البتہ خورد (کھانے کے معنی میں) واو سے لکھا جائے گا، جس کا مصدر خوردن ہے۔

مذکورہ بالا تمام الفاظ میں واو کی نہیں صرف پیش کی آواز آئے گی۔ رُومال فارسی کے دو لفظوں سے بنا ہے۔ ’رُو‘ کے معنی چہرے کے ہیں اور ’مال‘ فارسی کے مصدر

مالیدن سے ہے، جس کے معنی ملنے کے ہیں، اس لیے اسے ہمیشہ واو کے ساتھ لکھیں گے۔ لیکن واو کبھی حسب ضرورت ملفوظی رہے گا اور کبھی محض مکتوبی۔

واضح رہے کہ درج ذیل الفاظ میں واو کا استعمال ہوگا۔ مگر ملفوظی نہیں مکتوبی:

دو آتشہ، دوبارہ، دوپلی، دوپٹا، دو پٹا، دو چار، دو چند، دو دھاری

دوسالہ، دوشالہ، دوزانو، خوشامدی، دوشنبہ، دوگانہ، دولتی، دومحلا،

دوبالا، دومنزلہ، دو ورقہ وغیرہ

واو معدولہ

درج ذیل الفاظ میں واو صرف مکتوبی رہے گا۔ ان میں صرف الف کو پڑھیں گے:

خواب، خواجہ، خواجہ تاش، خوار، درخواست، خواہ مخواہ، دسترخوان وغیرہ۔

خورشید اور کم خواب کو بعض لوگوں نے واو کے بغیر لکھا ہے۔ لیکن ماہرین لسانیات نے واو کے ساتھ لکھنے پر ہی اصرار کیا ہے۔

جز اور جزو

اس سلسلے میں علما نے اس بات کی سفارش کی ہے کہ مفرد لکھنے کی صورت میں 'جُز' لکھیں گے اور جب فارسی ترکیب کے ساتھ لکھیں گے تو جیم اور زا کے بعد واو بھی لگائیں گے۔ جیسے: جزو بدن، جزولاینفک اور جزولازم۔

علاقائیت زدہ الفاظ

کچھ الفاظ ایسے ہیں، جو بُری طرح سے علاقائی عیب کا شکار ہیں۔ جیسے: میں پڑھا ہوں، میں سنا ہوں، لوٹا دھل دو اور کپڑا سل دو وغیرہ۔ حالاں کہ میں نے پڑھا ہے، میں پڑھ چکا ہوں، میں نے سنا ہے، میں پہلے بھی سن چکا ہوں، برتن دھو دو، کرتا سی دو، لکھنا درست ہے۔ دھل اور سل میں مفعولیت ہے۔ جیسے: برتن دھل گیا ہے، کرتا سل گیا ہے۔

عدم یک سوئی کے الفاظ

اردو میں ایسے الفاظ بڑی تعداد میں ہیں، جن کی لکھاوٹ کے معاملے میں لوگ یک سو نہیں ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

لیے، دیے، کیے، جیے، پیے، لیجیے، دیجیے، کیجیے، آیئے، کھایئے، گایئے،

چاہیے، سوچیے، دیکھیے۔

انھیں کوئی ہمزہ سے لکھ دیتا ہے اور کوئی ہمزہ اور یا دونوں سے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر یائے مجہول سے پہلے والے حرف کے نیچے زیر ہے تو یائے مجہول کے نیچے یا کے دو نقطے لگائیں گے۔ جیسا کہ اوپر لکھا ہوا ہے۔ اگر یائے مجہول سے پہلے والے حرف پر زبر ہے تو یائے مجہول پر ہمزہ لگائیں گے۔ جیسے: آئے، کھائے اور گئے۔

تماشا، معما

غالب کا مشہور مصرع ہے۔

تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

ایک دوسرے شاعر کا مصرع ہے۔

حل ہو سکا نہ ہم سے معمائے زندگی

یہ دونوں مصرعے یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ان الفاظ کا درست املا تماشا اور معما ہے۔ تماشہ اور معمہ لکھنا درست نہیں ہوگا۔

اعراب

اردو میں اعراب کا التزام نہیں ہوتا۔ لیکن بعض موقعوں پر یہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مصنف یا محرر کو اس ناگزیریت اور ضرورت کا خود احساس ہونا چاہیے۔ اس کا کوئی قاعدہ نہیں وضع کیا جا سکتا۔ خدائے سخن حضرتِ میر کا شعر ہے۔

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ 'مصور' استعمال ہوا ہے، اسے واو کے زبر کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور واو کے زیر کے ساتھ بھی۔ دونوں کے الگ الگ معنی ہیں۔ اگر لکھنے والا اس لفظ پر اعراب لگا دیتا تو قاری کو شعر کے مفہوم تک پہنچنے میں دیر نہ لگتی۔ خصوصاً کسی حرف کے مشدّد ہونے کی صورت میں حرکت کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

عطف اور اضافت

دو لفظوں کے درمیان اور کے معنی میں استعمال ہونے والے 'واؤ' کو عطف کہتے ہیں۔ جیسے:

صبح و شام، مکّہ و مدینہ، نماز و روزہ، روز و شب، قیام و طعام وغیرہ

کسی لفظ کو کسی لفظ سے منسوب کرنے کے لیے اس کے آخری حرف کو زیر کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے یا بولنے کو اضافت کہتے ہیں۔ جیسے:

کتاب حیات، روشنیٔ حرا، نورچشم، شرح کتاب وغیرہ

اس سلسلے میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ یاد رکھنے کی ہے کہ عطف یا اضافت کا استعمال صرف عربی و فارسی الفاظ میں ہوگا۔ بہ صورت دیگر عطف کی بہ جائے اور، اور زیر کے ساتھ اضافت کی بہ جائے کا، کی اور کے کا استعمال ہوگا۔ جیسے:

دن اور رات، سونا اور جاگنا، چوری اور ڈکیتی، چوری اور سینہ زوری

رنگ اور روپ وغیرہ

یہاں دن و رات، سونا و جاگنا، چوری و ڈکیتی، چوری و سینہ زوری یا رنگ و روپ لکھنا اور بولنا غلط ہوگا۔

اسی طرح دل کی دھڑکن، اسکول کا وقت، دل کی بات لکھیں گے۔ یہاں دھڑکن دل، وقت اسکول اور بات دل لکھنا غلط ہوگا۔

رُموز اوقاف

اوقاف، وقف کی جمع ہے۔ وقف کے معنی ٹھہرنے اور رُکنے کے ہیں۔ جن علامتوں سے جملوں کی صحیح و مناسب تقسیم ہوتی ہے اور ان کے مختلف ٹکڑوں کو صحیح طور پڑھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اُن کو اوقاف کہتے ہیں۔ یہ اوقاف ہر زبان کی کتابوں اور عبارتوں میں اپنے اپنے انداز سے ہوتے ہیں۔ اہل علم و دانش اُن کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اُن کے بغیر جملے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ انھیں پڑھنے، سمجھنے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے میں دقت پیش آتی ہے۔ ایک اچھے اور باسلیقہ مصنف یا محرر کی ایک ذمّے داری یہ بھی ہے کہ وہ اُن اوقاف کا پورا پاس و لحاظ رکھے اور اُن کے ذریعے سے اپنی تصنیف و تحریر کو آسان، لائق مطالعہ اور قابل فہم بنائے۔

اردو میں درج ذیل آٹھ علامات ہیں، جن کی مدد سے جملوں کو آراستہ اور آسان کیا جاتا ہے:

1	سکتہ	،	2	وقفہ	؛
3	رابطہ	:	4	ختمہ	۔
5	سوالیہ	؟	6	ندائیہ، فجائیہ	!
7	قوسین	( )	8	واوین	" "

1. سکتہ (،)

سکتہ کی علامت یہ ہے: ،۔ یہ اپنے انگریزی نام کاما (Comma) سے زیادہ مشہور ہے۔ عبارتوں کو حسین، دل کش اور سہل الفہم بنانے میں سکتہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سکتہ، خصوصاً ایسے موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے، جب دو یا دو سے زیادہ کلمے ایک ہی ساتھ آئیں۔ ایسی صورت میں پہلے ایک، دو یا اس سے زائد کلموں کے آگے سکتے کی علامت (،) لگا دی جاتی ہے اور آخری کلمے سے پہلے 'اور' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے:

رشید ایک ذہین، محنتی اور سنجیدہ نوجوان ہے

میر کی شاعری آسان، عام فہم اور معنی خیز ہے

تم بازار سے آتے وقت کچھ آم، خربوزے اور

کیلے لیتے آنا

ندائیہ جملوں میں اس طرح استعمال کریں گے:

جنابِ صدر، معزز سامعین، ماؤ، بہنو اور بیٹیو!

اے مری قوم کے نام ور شاعرو!

اے عالمو، حافظو اور قاریو!

دو جملوں کے درمیان اس طرح استعمال کریں گے:

* صبح ہو کہ شام، رات ہو کہ دن ہمیں اللہ کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔
* انسان کو ہمیشہ، ہر لمحہ اور ہر حال میں اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔

ایک ہی ڈھنگ کے جملوں کے درمیان، اس طرح استعمال کریں گے:

* میں یہاں آیا، وہاں گیا اور دن بھر یوں پھرتا رہا

دو ناموں کے درمیان اس طرح استعمال کریں گے:

* سہیل، دہلی سے واپس آگیا
* الفاروق، شبلی کی شاہ کار تصنیف ہے

2. وقفہ (؛)

سکتہ چھوٹے ٹھہراؤ کے لیے آتا ہے، جس کی علامت '، ' ہے۔ وقفہ، سکتہ سے کچھ زیادہ ٹھہراؤ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی علامت (؛) ہے۔

جب کئی جملوں یا ٹکڑوں کے درمیان سکتہ ہو تو اس صورت میں آخری ٹکڑے کے بعد نسبتاً لمبا توقف کرنا پڑتا ہے۔ اس مقام پر وقفہ کا استعمال کریں گے۔ جیسے:

محنت، مستعدی، احساسِ ذمے داری؛ یہ سب آج کی نسل میں مفقود ہیں۔

3. رابطہ (:)

کسی کا قول نقل کرنے کے لیے، کوئی حوالہ دینے کے لیے یا کسی بات کی تشریح و توضیح سے پہلے رابطہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی علامت (:) ہے۔ مثلاً:

فارسی کے تین معروف شاعر یہ ہیں:

سعدی، جامی اور حافظ

یہ اقبال کا شعر ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے، ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

علامت رابطہ کو تفصیلیہ بھی کہتے ہیں۔

4. ختمہ (۔)

ختمہ اپنے انگریزی نام ڈیش سے زیادہ جانا جاتا ہے۔ اس کی علامت (۔) ہے۔ جب کوئی جملہ مکمل ہو جائے تو ختمہ (۔) لگاتے ہیں۔ جیسے:

میں لکھنؤ میں رہتا ہوں۔

مجھے کل بمبئی جانا ہے۔

5. واوین (" ")

واوین کا استعمال اس وقت ہوتا ہے، جب کسی کی کوئی بات یا کسی کا کوئی خاص جملہ نقل کریں۔ اس بات یا جملے کے شروع اور آخر میں واوین (" ") کی علامت لگائیں گے۔ تاکہ یہ بات واضح رہے کہ متذکرہ بات یا جملہ کہاں سے کہاں تک ہے۔

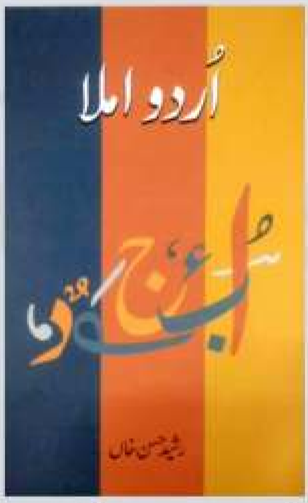

چونکہ کمپیوٹر میں واوین کا استعمال کسی قدر بدنمائی پیدا کر دیتا ہے، اس لیے بعض اہلِ علم دونوں طرف صرف ایک ایک علامت لگاتے ہیں۔ جیسے:

نظیر اکبر آبادی کی نظم 'آدمی نامہ' ہے۔

نام ور عالم و محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر نثار احمد فاروقیؒ نے آخر میں یہی رویہ اختیار کر لیا تھا اور ہمارے ممدوح اور مشہور عالم و مصنف مولانا سیّد جلال الدین عمریؒ بھی اسی پر عمل کرنے لگے تھے۔

6. ندائیہ، فجائیہ (!)

ندائیہ کو فجائیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ علامت کسی کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے:

صدرِ محترم!، پیارے بھائی! ساقیا! خدایا!

اکمل! کل تم کہاں تھے؟

غالب کا مشہور مصرع ہے ؎

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب!

جب تخاطب میں کسی قسم کا غصہ، افسوس، تعجب یا تکلیف کی کیفیت ہو تو یہ علامت فجائیہ کہلاتی ہے۔ جیسے:

اُفوہ! بھیا بس کرو!، وہ اور شرافت! افسوس صد افسوس!

7. سوالیہ (؟)

اگر کسی جملے میں سوال یا دریافت طلب بات ہو تو اسے سوالیہ کہتے ہیں۔ اس کی علامت (؟) ہے۔ جیسے:

کیا اذان ہو گئی؟، حامد کہاں گیا؟

سوالیہ کو استفہامیہ بھی کہتے ہیں۔

8. قوسین ( )

قوسین کا استعمال عموماً جملۂ معترضہ میں کیا جاتا ہے۔ جیسے: سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (جو جماعت اسلامی کے بانی امیر بھی تھے) انھوں نے تفہیم القرآن کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔

کبھی کبھی کسی بات کی وضاحت کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے: مولانا عامر عثمانی اپنے عہد کے نام ور سخن ور (شاعر) تھے۔

قوسین کی علامت ( ) بھی ہے اور [ ] بھی۔

میں نے اس مختصر سے وقت میں تصنیف و تحریر کی اہم ضروریات کے پیشِ نظر زبان و بیان اور تلفظ و املا کے سلسلے کی چند باتوں کی نشاں دہی کی ہے اور اُن اصولوں اور قاعدوں کی بھی کسی قدر صراحت کر دی ہے، جو میں نے لسانیات کے علما کی صحبتوں اور اُن کی کتابوں سے سیکھے ہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ میدان بہت وسیع ہے۔ کسی چھوٹے سے مضمون یا مختصر سی صحبت میں اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے صرف قاری یا سامع کو زبان و بیان اور تلفظ و املا کے سلسلے میں احساس دلایا ہے اور زبان و بیان اور املا کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

زبان و بیان اور تلفظ و املا کے سلسلے میں ہند و پاک میں بہت کام ہوا ہے۔ کتاب خانوں اور لائبریریوں میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں ملتی ہیں۔ اس موضوع پر کام کرنے والوں میں صفِ اوّل کے علما و دانش ور شامل ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق، نثار احمد فاروقی، عبدالستار صدیقی، شان الحق حقی، شوکت سبزواری، رشید حسن خاں، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، اطہر ہاشمی، رفیع الدین ہاشمی اور ابونثر احمد حاطب صدیقی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے استفادہ کیا ہے اور اپنی تحریروں، تقریروں اور تصانیف میں ان کی تجویزوں، سفارشوں اور وضع کردہ قاعدوں کو برتا بھی ہے۔ آپ حسبِ سہولت ان کتابوں، رسائل اور مضامین کو دیکھیں گے تو ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔ آپ کی تحریر و تقریر میں دل کشی پیدا ہوگی۔

■

Dr. Tabish Mehdi
G5/A - Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025 (INDIA)
Ph:26970736 Cell: 9818327947
E-mail: drtabishmehdi@gmail.com

صابر علی سیوانی

وضعِ اصطلاحات

مسائل و امکانات

ہر زندہ زبان میں علوم وفنون کی سطح پر اصطلاحات بنیادی اہمیت رکھتی ہیں جو زبان کو نئے الفاظ کا خون اور تازہ خیالات کی توانائی عطا کرتی ہیں اور جو ہماری سماجی وراثت کو ثروت مند بناتی ہیں۔ اگر مروج معنی کے علاوہ کسی لفظ کے کوئی معنی صلاح ومشورے سے مقرر کرلیے جائیں تو معنی کی اس صورت کو اصطلاحات کہتے ہیں۔ اسی طرح کئی تصورات یا خیالات اس لفظ سے ادا ہوجاتے ہیں۔ مولوی وحیدالدین سلیم اپنی کتاب 'وضع اصطلاحات' میں اصطلاح کی صراحت یوں کرتے ہیں:

''ہر اصطلاح سے اختصار مقصود ہوتا ہے تاکہ ایک چھوٹے سے لفظ سے وسیع معنی مراد لیے جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کی جاتی کہ عبارت خواہ کسی قدر طولانی ہوجائے تاہم پورا اور صحیح مفہوم ظاہر ہوتو پھر اصطلاح وضع کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہتی۔ غرضیکہ ''ہر اصطلاح ایک چھوٹی سی علامت ہوتی ہے، جو بہت بڑے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بولنے والوں اور لکھنے والوں کو وقت ضائع کرنے سے بچاتی ہے۔''

(وضع اصطلاحات انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد 1921، ص 187)

فیروز اللغات میں اس لفظ کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ''کسی علمی یا فنی گروہ کا کسی لفظ کے عام معنوں کے علاوہ کوئی خاص مفہوم مقرر کرلینا۔'' اصطلاح کے لیے انگریزی میں Terminology لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اردو زبان میں اصطلاحات کا سرمایہ تو اسی وقت سے پیدا ہونے لگا تھا، جب یہ زبان متعدد علوم وفنون کا ذریعہ بنی تھی۔ اسی دور میں عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت سے اصطلاحات ماخوذ کی جانے لگی تھیں یا وضع ہونے لگی تھیں لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب برصغیر میں مسلم سلطنت کا زوال ہونے لگا اور انگریزی اقتدار رفتہ رفتہ وجود میں آکر انیسویں صدی میں مکمل طور پر مستحکم ہوگیا تو ایک نیا مسئلہ اس وقت پیش آیا جب جدید مغربی علوم کو اردو زبان کے ذریعے حاصل کرنے کا عمل شروع ہوا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اصطلاحات اور وضع اصطلاحات کے مسئلے نے ایک خاص اہمیت حاصل کرلی۔ 1825 میں دہلی کالج قائم ہوا، اسی کے ساتھ ساتھ وہاں 'دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی' قائم ہوئی اور درسی کتابوں کی ضرورت کے لیے کیمیا، نباتات، معدنیات، ریاضی، طب، علم ہندسہ اور دوسرے علوم کی اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ حیدرآباد میں شمس الامرا نے انگریزی اور فرانسیسی سے اہم کتابوں کے اردو تراجم میں گہری دلچسپی ظاہر کی۔ یہاں 1834 سے 1850 کے درمیان 20 سے زائد سائنسی کتابوں کے اردو تراجم منظر عام پر آئے۔ سرسید احمد خان نے 1863 میں 'سائنٹفک سوسائٹی' قائم کی۔ اس سوسائٹی کا مقصد جدید بنیادی سائنسی کتابوں اور امہات الکتب کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔ وضع اصطلاحات کی کمیٹی بھی اسی زمانے میں سرسید احمد خان نے قائم کی۔ رڑکی انجینئرنگ کالج میں 1856 سے 1888 تک ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی۔ درسی ضروریات کے پیش نظر وہاں بھی متعدد کتابیں اردو میں لکھی گئیں اور اصطلاحات وضع کی گئیں۔ اسی طرح آگرہ میڈیکل کالج میں بھی ذریعہ تعلیم اردو تھی، وہاں بھی طلبہ کی درسی ضرورت کے پیش نظر کتابیں لکھی گئیں اور جدید طبی اصطلاحات اردو میں وضع کی گئیں۔ یہ ذخیرہ آج بھی ہندو پاک کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی مظفرپور نے 1868 کے آس پاس فلکیات، معدنیات، طبعیات، جغرافیہ اور فن تعمیر وغیرہ پر متعدد کتابیں ترجمہ کرائیں، لکھوائیں بلکہ وضع اصطلاحات کے کام کو بھی اس سوسائٹی نے آگے بڑھایا۔ شاہان اودھ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور حکومت میں بہت سی علمی و سائنسی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں اور بہت سی نئی اصطلاحیں وجود میں آئیں۔ 1865 میں انجمن پنجاب کا لاہور میں قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کے تحت بھی ترجمہ واصطلاحات کا بڑا کام منظر عام پر آیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریزی سے اردو تراجم اور علمی اصطلاحات کی روایت کی تاریخ کم وبیش 200 سال قدیم ہے، جس کا سلسلہ آج بھی جاری تو ضرور ہے لیکن اصطلاحات سازی کا عمل کم وبیش رک سا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی سے اردو تراجم اور اصطلاحات سازی کا عمل اس وقت زیادہ اہمیت حاصل کرگیا جب 26 اپریل 1917 کو نظام دکن میر عثمان علی خان نے یہ فرمان جاری کیا کہ ''اپنی تخت نشینی کی یادگار میں سلطنت آصفیہ میں ایک جامعہ کے قیام کا حکم دیتا ہوں جس کا نام 'جامعہ عثمانیہ' ہوگا۔'' اس فرمان کے چار ماہ کے اندر اندر 14 اگست 1917 کو شعبہ تالیف وترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس شعبے کے سربراہ مولوی عبدالحق مقرر کیے گئے۔ اس کا مقصد جامعہ عثمانیہ کے لیے ضروری کتب لکھوانا اور ترجمہ کرانا تھا تاکہ یہ کتابیں جامعہ عثمانیہ میں درسی کتب کے طور پر استعمال کی جاسکیں۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام 1918 میں عمل میں آیا۔ جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم چونکہ اردو زبان تھی۔ اس لیے یہاں اصطلاحات سازی کے کام میں بھی غیر معمولی پیش رفت ہوئی۔ اس حوالے سے مولوی وحیدالدین سلیم نے اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں لکھا ہے کہ:

''خدا کا شکر ہے کہ جامعہ عثمانیہ دکن کی اس جنرل کمیٹی میں جس زبان اور علم کا صحیح مذاق رکھنے والے بزرگ شامل تھے، یہ اہم مسئلہ کثرت رائے سے طے کردیا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر یا تبدل

کے ساتھ اردو زبان میں نہ لی جائیں بلکہ انگریزی علمی اصطلاحات کے مقابلہ میں اردو علمی اصطلاحات وضع کی جائیں۔ اس بنا پر ان حضرات کے خیالات جو اصطلاح سازی کے مخالف ہیں، اب زیادہ قابل توجہ اور لائق بحث نہیں رہے''۔
(وضع اصطلاحات، مولوی سید وحیدالدین سلیم، اورنگ آباد 1921، ص 7)

اس مرحلے پر پہنچ کر اصطلاحات سازی کے دو گروہ پیدا ہوگئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ تمام اصطلاحی الفاظ عربی زبان سے بنائے جائیں۔ دوسرے گروہ کا خیال یہ تھا کہ اصطلاحات وضع کرنے میں ان تمام زبانوں کے لفظوں سے کام لینا چاہیے جو اردو زبان میں بطور عنصر شامل ہیں اور ان لفظوں کی ترکیب میں اردو گرامر سے مدد لینی چاہیے۔ اس گروہ نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان آریائی خاندان سے اور عربی زبان سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ دونوں خاندانوں میں الفاظ بنانے کے جدا جدا قاعدے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی ضرورت علمی اصطلاحات میں پیش آتی ہے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی وضع اصطلاحات کمیٹی نے دونوں گروہ کے نقطۂ نظر پر غور کرنے کے بعد یہ منظور کردیا کہ اردو زبان میں جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں ان کے الفاظ عربی فارسی اور ہندی سے بے تکلف لیے جائیں مگر الفاظ کی ترکیب وضع کرتے وقت اردو زبان کی گرامر کا لحاظ رکھا جائے۔

مجلس وضع اصطلاحات کا طریق کار یہ تھا کہ الفاظ کی فہرست پہلے تیار کرکے ہر رکن کے پاس بھیجی جاتی تھی لہٰذا جب وہ لفظ پیش کیا جاتا تو اس کا ترجمہ بھی پیش کیا جاتا۔ اس سلسلے میں اگر کسی کو اعتراض نہ ہوتا تو وہ لفظ مع ترجمہ صدرنشین مجلس ایک رجسٹر میں درج کرلیتے اور دوسرے لفظ کو لیتے۔ پھر کوئی لفظ ایسا آتا کہ مختلف ترجمے پیش ہوتے۔ ان پر بحث ہوتی اور جو طے پاتا اسے درج کرلیا جاتا۔ کبھی کبھی ایک ہی لفظ پر اتفاق رائے بننے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ لیکن اس کے بعد کوئی نہ کوئی لفظ طے کرلیا جاتا تھا۔

مجلس وضع اصطلاحات میں مختلف علوم وفنون اور ماہرین زبان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، جن کا تعلق ملک کی مختلف ریاستوں سے تھا۔ پورے ملک سے ماہرین کو جمع کرکے وضع اصطلاحات جیسے مشکل کام کو انجام دیا گیا۔ ان تمام میں سرفہرست مولوی سید وحیدالدین سلیم تھے، جنھیں ترکیبیں بنانے اور وضع اصطلاحات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ جس کا ثبوت ان کی کتاب 'وضع اصطلاحات' ہے، جس میں اصطلاحات بنانے کے متعدد طریقے بتائے گئے ہیں۔ سابقوں، لاحقوں، انگریزی زبان کے لاحقوں، اردو مصادر، مفرد اصطلاحیں، فعلی اصطلاحات، اردو کے جدید مصادر، ترکیب الفاظ، نیم سابقے، نیم لاحقے، مرکب اصطلاحات جیسے اصطلاحات بنانے کے لیے متعدد اصول وضوابط اور طریقے مع مثال پیش کیے گئے ہیں۔ چوں کہ وحیدالدین سلیم عربی فارسی اردو ہندی اور انگریزی زبان کے ماہر تھے اس لیے انھیں یہ کام زیادہ مشکل محسوس نہیں ہوا لیکن برسوں کی محنت کے بعد اس کتاب کی تکمیل ہوپائی۔ اس موضوع پر آج تک اس نوعیت کی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کتاب سے استفادہ کرنا محققین، ناقدین اور وضع اصطلاحات سے دلچسپی رکھنے والوں کی ضرورت تسلیم کی جاتی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحیدالدین سلیم کی کتاب 'وضع اصطلاحات' سے چند ایسے مرکب الفاظ اور اصطلاحیں پیش کی جائیں جو سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے وضع کی گئی ہیں۔ پہلے سابقوں پر مشتمل چند مثالیں دیکھیں جو لفظ 'خوش' سابقہ کے ذریعے وجود میں لائی جاتی ہیں۔

خوش اسلوب، خوش اسلوبی، خوش اقبال، خوش آواز، خوش الحان، خوش انتظام، خوش باش، خوش بیان، خوش پوشاک، خوش تقریر، خوش حال، خوش خبری، خوش خرام، خوش خط، خوش خلق، خوش اخلاق، خوش دامن، خوش دل، خوش ذائقہ، خوش رنگ، خوش زبان، خوش طبع، خوش تحریر، خوش گوار، خوش لباس، خوش نصیب، خوش نویس، خوش وضع، خوش کلام، خوش فکر، خوش قسمت، خوش مزاج، خوش اطوار وغیرہ۔ (وضع اصطلاحات صفحہ 34-33)

اسی طرح لاحقوں کے ذریعے بنائی گئیں چند اصطلاحیں دیکھیں جو 'خواں' کے لاحقے کے ساتھ وضع کی گئی ہیں جو خواندن مصدر پڑھنا سے امر کی شکل ہے۔

مولود خواں، ناظرہ خواں، قرآن خواں، قصہ خواں، فاتحہ خواں، کتاب خواں، ثنا خواں، مدح خواں، نعت خواں، روضہ خواں، مرثیہ خواں، نوحہ خواں، غزل خواں، خوش خواں، سوز خواں، درود خواں، پریخواں، ابجد خواں، انگریزی خواں وغیرہ۔ اسی طرح 'خانہ' لاحقہ سے وضع کی گئی چند اصلاحیں دیکھیے:

آبدار خانہ، آئینہ خانہ، بیمار خانہ، پاگل خانہ، قید خانہ، جیل خانہ، کارخانہ، چھاپہ خانہ، شراب خانہ، باورچی خانہ، مے خانہ، قمار خانہ، توپ خانہ، نعمت خانہ، عجائب خانہ، ٹپہ خانہ، شفا خانہ، ڈاک خانہ، دیوان خانہ، غریب خانہ، غسل خانہ، بت خانہ، کبوتر خانہ، کتب خانہ، نگار خانہ، نقار خانہ، بھٹیار خانہ، عاشور خانہ، مہمان خانہ وغیرہ۔

'مجلس وضع اصطلاحات' میں ملک کی نامور شخصیتوں کی شمولیت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ عہد عثمانی میں اہل علم وفضل کی قدردانی کا کیا عالم تھا۔ سائنسی علوم، فلسفہ، تاریخ، قانون، ریاضی، ارضیات، حیاتیات، انجینئرنگ، طب، تدریسیات، علم ہیئت، نباتیات، حیوانیات، منطق، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات کے شعبوں کے لیے علیحدہ علیحدہ 12 مجالس وضع اصطلاحات (ذیلی کمیٹیاں) قائم کی گئی تھیں۔ ان کمیٹیوں میں متعلقہ علوم وفنون کی وابستہ ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ڈاکٹر سید مصطفی کمال نے متعدد علوم وفنون پر مشتمل وضع کی گئیں اصطلاحات کی تعداد کے بارے میں لکھا ہے:

مجلس وضع اصطلاحات کا طریق کار یہ تھا کہ الفاظ کی فہرست پہلے تیار کرکے ہر رکن کے پاس بھیجی جاتی تھی لہٰذا جب وہ لفظ پیش کیا جاتا تو اس کا ترجمہ بھی پیش کیا جاتا۔ اس سلسلے میں اگر کسی کو اعتراض نہ ہوتا تو وہ لفظ مع ترجمہ صدرنشین مجلس ایک رجسٹر میں درج کرلیتے اور دوسرے لفظ کو لیتے۔ پھر کوئی لفظ ایسا آتا کہ مختلف ترجمے پیش ہوتے۔ ان پر بحث ہوتی اور جو طے پاتا اسے درج کرلیا جاتا۔ کبھی کبھی ایک ہی لفظ پر اتفاق رائے بننے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ لیکن اس کے بعد کوئی نہ کوئی لفظ طے کرلیا جاتا تھا۔

''1940 کے قریب دارالترجمہ میں اصطلاحات سازی کی گیارہ مختلف مضمون واری کمیٹیاں کام کررہی تھیں۔ سررشتۂ تالیف وترجمہ کی آخری مطبوعہ رپورٹ کے مطابق سررشتہ نے مارچ 1946 تک مختلف فنون کی جو اصطلاحیں وضع کی تھیں اس کی تفصیل یوں ہے: فلسفہ 837، تاریخ 618، عمرانیات 729، تدریسیات 5370، قانون 18,000، ریاضیات 1696، طبعیات 1213، کیمیا 1176، ارضیات 1200، حیاتیات 7000، طب 40,000، انجینئری 10,000۔ گویا مارچ 1946ء تک دارالترجمہ میں جملہ 88,839 (اٹھاسی ہزار آٹھ سو انتالیس) اصطلاحیں وضع ہوچکی تھیں۔ ستمبر 1948 تک ممکن ہے اس تعداد میں پانچ چھ ہزار کا اضافہ ہوا ہو لیکن اس کے

بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔''

(حیدرآباد میں اردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے، ڈاکٹر مصطفی کمال، شگوفہ پبلی کیشنز حیدرآباد 1990، ص 270)

ڈاکٹر مصطفی کمال نے وضع اصطلاحات کمیٹیوں میں تال میل نہ ہونے اور ثقیل اور نامانوس اصطلاحیں وضع کرنے کے حوالے سے لکھا ہے:

''جامعہ عثمانیہ میں اصطلاحات سازی کا کام خاص نہج پر بڑی احتیاط و دانش مندی کے ساتھ سرانجام دینے کی کوشش کی گئی اور ابتدا ہی سے اس تحریک کو انتہا پسند حضرات کی دست برد سے محفوظ رکھا گیا تاہم چوں کہ علمی اور وضع اصطلاحات کی کمیٹیوں میں ان کا غلبہ تھا اور ہر مرحلہ پر ان کی نگرانی ممکن نہ تھی اس لیے ایسی ثقیل اور نامانوس اصطلاحیں بھی مدون کرلی گئیں جن پر بجا طور پر اعتراض ہوتا رہا اور اسی وجہ سے ان اصطلاحات کو مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ اس کے علاوہ وضع اصطلاحات کے کام میں رابطہ کی کمی بھی تھی۔'' (ایضاً، ص 270)

دارالترجمہ عثمانیہ کے مترجمین اور مولفین اپنے اپنے فن میں ماہر تھے۔ ان میں وحیدالدین سلیم، الطاف حسین حالی، نظم طباطبائی، مرزا محمد ہادی رسوا، عبداللہ عمادی، منشی ذکاءاللہ کے فرزند محمد عنایت اللہ دہلوی، محمد الیاس برنی، عبدالماجد دریابادی، ظفر علی خان، رشید احمد صدیقی، عبدالباری ندوی، خلیفہ عبدالحکیم، نصیر احمد عثمانی، عبدالحلیم شرر شامل تھے۔ ان کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر مظفرالدین قریشی، ڈاکٹر سید حسین، محمد نصیر احمد عثمانی، محمود احمد خان، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور مولوی عبدالحق وغیرہ شامل تھے جنھوں نے ان اصطلاحوں کی ترتیب و طباعت اور نشر و اشاعت میں اعانت کی تھی۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں وضع اصطلاحات کے برسوں بعد تک اصطلاحات کی تدوینی رفتار کافی سست رہی ہے۔ سرکاری سطح پر چلائے جانے والے فروغ اردو سے وابستہ اداروں نے اپنی سطح پر وضع اصطلاحات پر متعدد کام کیے لیکن وہ تشفی بخش نہیں رہے۔ کچھ ماہرین زبان نے بھی اصطلاحات سازی کے عمل میں اپنی دلچسپی ظاہر کی اور کتابیں شائع کرائیں لیکن موجودہ ضرورت کی تکمیل نہ ہوسکی۔ لغات کی تدوین میں بھی ہندوستان اور پاکستان میں بڑا کام ہوا ہے لیکن اصطلاحات سازی کے عمل میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی ہے۔

ہندوستان میں لغات و فرہنگ اصطلاحات کے حوالے سے بھی قابل قدر کام نہیں ہوئے ہیں تاہم کچھ اداروں اور ماہرین زبان نے اس موضوع پر وقیع کام کیے ہیں۔

مولوی ظفرالرحمن کی 'فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں' آٹھ جلدوں پر محیط ہے۔ یہ لغت کرخنداری اور پیشہ ورانہ الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ اس لغت کو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا تھا۔ مولوی عبدالحق کا ہی ایک اہم ترین کارنامہ انگریزی اردو ڈکشنری ہے جو اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اب تک اردو انگریزی ڈکشنری کی کمی محسوس کی جاتی تھی، اس کمی کو مولوی عبدالحق نے پورا کردیا۔ جمیل جالبی نے بھی اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو انگریزی ڈکشنری مرتب کرکے شائع کی۔ یہ لغت بھی اپنی نوعیت کی منفرد لغت ہے۔ ہندوستان کے کئی اداروں نے اس ڈکشنری کو شائع کیا ہے۔ قومی کونسل نئی دہلی کی جانب سے مشہور ناقد کلیم الدین احمد کی مرتبہ ڈکشنری 'جامع انگریزی اردو لغت' چھ جلدوں میں برسوں قبل شائع ہوچکی ہے۔ یہ لغت بھی کافی اہمیت کی حامل ہے۔

اردو کی مقبول و مبسوط اور ضخیم لغت مولوی فیروز الدین کی 'جامع فیروز اللغات' ہے۔ یہ لغت 1472 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ایک لاکھ پچیس ہزار قدیم و جدید الفاظ کے معنی، صحیح تلفظ، علمی، ادبی اور فنی اصطلاحات، مرکبات، محاورات اور ضرب الامثال شامل ہیں۔ فیروز اللغات کی اشاعت 1950 کے آس پاس عمل میں آئی تھی۔ 1967 میں اس لغت پر نظرثانی کی گئی اور ہندی حروف کو علیحدہ کرکے اس کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ میرے زیرنظر 1988 کا ایڈیشن ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کا ہے جس میں تقریباً پچیس ہزار جدید الفاظ اور اصطلاحات کے اضافے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ طلبا کی ضرورت کے پیش نظر 'فیروز اللغات' عام کتابی سائز پر بھی اہم ترین الفاظ و اصطلاحات و محاورات کو شامل کرتے ہوئے ضخامت کم کرکے شائع کی گئی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے متعدد اداروں نے اس لغت کو اپنے اپنے انداز سے شائع کیا ہے۔ لیکن آج جب کہ نئے نئے الفاظ، اصطلاحات اور تکنیکی و سائنسی لفظیات اردو میں رائج ہوچکے ہیں، ان کے اندراج کی ضرورت ہے۔ کم و بیش پچاس برسوں سے اس لغت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے جس کی شدید ضرورت ہے۔ اس لغت میں بعض غلطیاں بھی موجود ہیں جس کی تصحیح ضروری ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ اردو میں ایک ایسی لغت کی ابھی بھی ضرورت ہے جو ضخامت میں بھلے ہی فیروز اللغات سے کم ہو مگر جدید دور کے تقاضوں کی تکمیل کرسکے اور جس میں قدیم و جدید علوم و فنون سائنس، ٹیکنالوجی، اصطلاحات اور محاورات کے حوالے سے نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ یہ کام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے بہتر کوئی دوسرا ادارہ نہیں کرسکتا ہے۔ قومی کونسل کو وضع اصطلاحات کے حوالے سے ابھی کام کرنے کی شدید ضرورت ہے، وحیدالدین سلیم کی وضع اصطلاحات کے بعد مولوی عبدالحق، برج موہن دتاتریہ کیفی، سید سلیمان ندوی، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اصحاب قلم نے قلم اٹھایا، لیکن اس کے باوجود فی الوقت جو نئی نئی اصطلاحات اور انگریزی کے نئے نئے الفاظ اردو میں من و عن داخل ہوکر رواج پاچکے ہیں، ایسے اصطلاحات والفاظ کی اردو میں ترجمے کی شدید ضرورت ہے۔ کشاف قانونی اصطلاحات کے عنوان سے رشید احمد صدیقی کی کتاب 1987-1988 میں منظر عام پر آئی۔ یہ فرہنگ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ وضع اصطلاحات کے موضوع پر پاکستان سے عطش درانی کی کتاب 'اردو اصطلاحات سازی' کم و بیش بیس سال قبل منظر عام پر آئی، اس کے بعد ہند و پاک میں اس طرح کا کوئی دوسرا کام اب تک نہیں ہوسکا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے لغات کی اشاعت و ترتیب کے سلسلے میں اہم کام انجام دیے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ کی اشاعت کے علاوہ مختلف فنون و موضوعات پر مشتمل متعدد فرہنگیں شائع کی ہیں۔ ان میں 'دکنی لغت' شامل ہے جسے پروفیسر سیدہ جعفر نے ترتیب دیا۔ بڑی محنت سے اس فرہنگ کی ترتیب عمل میں آئی۔ 'دکنی لغت' قومی کونسل کی سلسلہ وار نصابی غیر نصابی اشاعت کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس لغت میں ساڑھے پانچ سو سال قدیم الفاظ تک کو جگہ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں تاکہ قاری کو دکنی الفاظ کے صحیح تلفظ کی ادائیگی میں کوئی دقت نہ ہو۔ الفاظ کے معنی کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال کی چار چار مثالیں بھی دی گئی ہیں اور ماخذ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ مثالیں زیادہ تر نظموں سے پیش کی گئی ہیں اور شاعر کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔ دکنی زبان و ادب کے حوالے سے سیدہ جعفر کی 'دکنی لغت' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں ہندی زبان بولی جاتی ہے اور کہیں کہیں اردو بولنے والے افراد موجود ہیں تو ان کی بولیوں پر بھی مقامی ہندی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بہت سے مترجمین کو جنھیں ہندی سے اردو میں ترجمے کا کام کرنا پڑتا ہے، اردو لغت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر قومی

کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے دو جلدوں پر مشتمل ایک 'جدید ہندی اردو' لغت کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور اس ڈکشنری کی تالیف کی ذمے داری معروف ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں مرحوم (سابق استاد جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی) کو سونپی گئی۔ انھوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد جدید ہندی اردو لغت کی تدوین کا فریضہ انجام دیا۔ اس لغت میں قدیم وجدید ہندی کے الفاظ اور معانی ومفاہیم ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں دیے گئے ہیں۔ اس لغت کی تدوین میں جن چیزوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے ان میں یونیورسٹیوں کے نصاب، قدیم دستاویزات، صحافتی زبان اور عام بول چال کے الفاظ شامل ہیں۔ الفاظ کے ماخذ کے لیے عربی، فارسی اور سنسکرت لفظیات کی بنیاد تک رسائی کی کوشش کی گئی ہے۔ علاقائی بولیوں کے الفاظ، کبیر، سور داس اور تلسی داس وغیرہ کے کلام کے الفاظ، محاورے اور کہاوتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ ہندی اندراجات کے معانی اردو میں دے کر انھیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں علامات واعراب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تاکہ متن کی قرأت اور تلفظ کی ادائیگی میں کوئی دشواری نہ ہو۔ دو جلدوں پر مشتمل اس لغت میں تقریباً سوا لاکھ الفاظ جمع کیے گئے ہی۔ چار ہزار محاورے اور کہاوتیں بھی شامل ہیں۔

علاوہ ازیں کونسل نے مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی فرہنگیں شائع کی ہیں۔ جن میں اردو کی صوتی لغت (مرتب نصیر احمد خاں) فرہنگ اصطلاحات شماریات، فرہنگ اصطلاحات قانون وغیرہ شامل ہیں۔ توقع ہے کہ اردو لغات کی ضرورت کی تکمیل کی راہ آسان کرنے میں کونسل مدد کرے گی۔

'ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ' کے عنوان سے ایک کتاب پروفیسر عتیق اللہ نے اردو مجلس، دہلی سے 1993 میں شائع کی۔ جس میں ادبی اصطلاحات کے حوالے سے مفید معلومات ملتی ہیں۔

یہاں ایک اور اہم ڈکشنری کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اور وہ ہے حیدرآباد کے یعقوب میراں مجتہدی کی 'اردو انگریزی لغت مجتہدی'۔ یعقوب میراں مجتہدی 1931 میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے گریجویشن کیا۔ ڈپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشن حکومت آندھراپردیش میں ملازم ہوئے۔

> **دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ میں وضع اصطلاحات کے برسوں بعد تک اصطلاحات کی تدوینی رفتار کافی سست رہی ہے۔ سرکاری سطح پر چلانے جانے والے فروغ اردو سے وابستہ اداروں نے اپنی سطح پر وضع اصطلاحات پر متعدد کام کیے لیکن وہ تشفی بخش نہیں رہے۔ کچھ ماہرین زبان نے بھی اصطلاحات سازی کے عمل میں اپنی دلچسپی ظاہر کی اور کتابیں شائع کرائیں لیکن موجودہ ضرورت کی تکمیل نہ ہوسکی۔ لغات کی تدوین میں بھی ہندوستان اور پاکستان میں بڑا کام ہوا ہے لیکن اصطلاحات سازی کے عمل میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی ہے۔**

ڈپٹی ڈائرکٹر آف ٹرانسلیشن کے عہدے سے 1989 میں سبکدوش ہوئے۔ 21 جولائی 2010 کو ان کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ یعقوب میراں مجتہدی کو اردو اور انگریزی زبان پر عبور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تنہا یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ 'اردو انگریزی لغت مجتہدی' تین جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں ایک لاکھ پچیس ہزار الفاظ ہیں۔ یہ لغت چنچل گوڑہ حیدرآباد سے 2009 میں شائع ہوئی۔ برسوں کی محنت کے بعد مجتہدی صاحب نے بغیر کسی کی مدد کے یہ کام انجام دیا جو قابل ستائش ولائق تقلید کارنامہ ہے۔ لغت نویسی کا عمل موجودہ دور میں رک سا گیا ہے کیونکہ عہد حاضر کے نقاد، دانشور اور محققین اس دقت طلب کام کی ذمے داری اپنے سر نہیں لینا چاہتے ہیں اور نہ ہی کوئی ادارہ یہ جوکھم اٹھانا چاہتا ہے۔ ''فیروز اللغات'' کے بعد کم وبیش نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصے میں کوئی بھی مستند لغت منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔ حالانکہ اس طویل مدت میں کثیر تعداد میں ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ اردو میں داخل ہوچکے ہیں اور ان کا استعمال ہو بہو اردو میں ہوتا ہے۔ اس جانب توجہ کی ضرورت ہے اور ایک ایسی لغت کی تدوین وقت کا تقاضا ہے جس میں جدید الفاظ کے ساتھ ساتھ مروجہ اصطلاحات اور تراکیب وغیرہ کی اصول فرہنگ کے مطابق تدوین عمل میں لائی جائے۔

یہاں ایک نکتے کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اصطلاحات سازی کا عمل برسوں سے جمود کا شکار ہے۔ اردو میں گزشتہ پچاس برسوں میں بہت سے انگریزی اور ہندی کے الفاظ لکھنے، پڑھنے اور بول چال کی زبان میں شامل ہوچکے ہیں، جنھیں ہم من وعن اپنی زبان اردو میں استعمال کرتے ہیں، حالانکہ تھوڑی سی توجہ کے بعد ان الفاظ کے اردو متبادل تلاش کیے جاسکتے ہیں یا ان الفاظ کے نعم البدل وضع کیے جاسکتے ہیں۔ اصطلاحات سازی پر کوئی بھی ادارہ، کوئی بھی تنظیم یا کوئی بھی دانش گاہ توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ انگریزی زبان کی تکنیکی وپیشہ ورانہ اصطلاحات اردو زبان کا آئے دن حصہ بنتی رہتی ہیں، جس کے باعث اردو کا ذخیرہ ثروت مند ہونے کی بجائے کم مائیگی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ یہی صورت حال دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ ہونے والی کتابوں کا بھی ہے۔

اصطلاحات کے حوالے سے جو کام گزشتہ پچاس برسوں میں ہوئے ہیں، ان میں زیادہ معنویت نہیں پائی جاتی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس مدت میں اصطلاحات سازی پر کوئی کام ہی نہیں ہوا ہے۔ محمد نعمان وحید بخاری اصطلاحات سازی اور تراجم کی موجودہ صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصطلاحات کی بات کی جائے تو عرصہ دراز سے یا یوں کہیے کہ گزشتہ نصف صدی سے کوئی بھی نئی اصطلاح اردو زبان کا حصہ نہیں بنی، جبکہ انگریزی زبان کی تکنیکی اور پیشہ ورانہ اصطلاحات اردو زبان میں آئے دن حصہ بنتی رہتی ہیں، جس کے سبب اردو الفاظ کا ذخیرہ تقریباً معدوم ہوتا جارہا ہے۔ یہی حال دوسری زبانوں سے اردو زبان میں ترجمہ ہونے والی کتب کا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو مترجم کا مقصدِ ترجمہ پیغام رسانی کا ہوتا ہے یا خیال سے متاثر ہوکر وہ اس کام کو انجام دیتا ہے، جس کے باعث مقصد تو پورا ہوجاتا ہے لیکن کوئی زبان سے متاثر نہیں ہو پاتا، یا یوں کہیے کہ اردو زبان کی جانب نہیں آتا۔ تراجم کی فہرست میں بھی موجودہ صورت حال میں دیکھا جائے تو انگریزی زبان سبقت لے گئی ہے۔ دنیا بھر کے کلاسیکی ادب کا ترجمہ انگریزی میں ہوچکا ہے۔ اگر تخلیق کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو بھی جدید علم میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ انگریزی میں ہو رہا ہے۔ اگر کسی زبان میں ہوتا بھی ہے تو اسے فوری طور پر انگریزی میں ترجمہ کردیا جاتا ہے۔''

ہندی والے اصطلاحات سازی اور تراجم کے معاملے میں ہم سے آگے ہیں۔ آج جدید ٹیکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا سے متعلق سیکڑوں الفاظ جو انگریزی کے ہیں، اردو کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ الفاظ ہماری توجہ کے متقاضی ہیں۔ یہاں چند انگریزی الفاظ واصطلاحات لکھے جارہے ہیں جو عام طور پر بول چال اور لکھنے پڑھنے میں

استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کے اردو تراجم موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی سیکڑوں اصطلاحیں ہو بہو اردو میں مستعمل ہیں جو انگریزی زبان کی ہیں۔ مثال کے طور پر واشنگ مشین، ریفریجریٹر، چالان، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، کی بورڈ، ہارڈ کاپی، سافٹ کاپی، ہارڈ ڈسک، مانیٹر، پرنٹر، ماؤس، اسکرین، لیپ ٹاپ، گیجٹس، واٹس اپ، چیٹنگ، ای میل، سوشل میڈیا، فیس بک پوسٹ، لائک، شیئر، ٹوئٹر، انسٹا گرام، ویوز، کانفرنس، سمینار، سمپوزیم، آل انڈیا ریڈیو، پاس بک، نیفٹ، کرنٹ اکاؤنٹ، سیونگ اکاؤنٹ، سی سی ٹی وی کیمرہ، ایمبولنس، وائرس، آدھار کارڈ، لائسنس، پاسپورٹ، آن لائن میٹنگ، ورچول میٹنگ، ماسک، سینیٹائزر، فیس شیلڈ، پی پی ای کٹ، لاک ڈاؤن، کونسلنگ، کال سنٹر، ریزرویشن، ٹکٹ، اسٹیشن، اسٹیشن ماسٹر، ٹی ٹی ای۔ ٹی سی اسٹیشن وغیرہ۔

یہ وہ الفاظ و اصطلاحات ہیں جو برسوں سے ہماری زندگی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی کے ہزاروں الفاظ و اصطلاحیں ہماری زبان میں من وعن مستعمل ہیں جن کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا ہے جس کے باعث مجبوراً ہمیں انگریزی کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

تجسس، تفکر، تدبر اور تحقیق جیسی خصوصیات نئی نسل اور خصوصاً طلبہ میں تقریباً ناپید ہو چکی ہیں۔ تساہل، تجاہل، تغافل اور جمود فکر کی شکار یہ نسل محنت اور جدوجہد سے عاری نظر آتی ہے۔ سہل پسندی ان کا وطیرہ بن چکا ہے جس کی وجہ سے زبان کا غلط استعمال، ان کی بول چال اور تحریروں میں پایا جاتا ہے۔

مصدر، مخرج، مشتق، مفرد، مرکب، اضافت لفظی، مضاف، مضاف الیہ اور واؤ عطف سے لاعلمی بھی غلط زبان بولنے اور لکھنے کی جانب طلبہ اور اساتذہ کو مائل کرتی ہے۔ انگریزی اصطلاحات پر قناعت کرنے کی عادت بن چکی ہے۔ یونیورسٹیوں میں ادب کے ساتھ ساتھ زبان پر خصوصی توجہ نہ دینے کی وجہ سے بھی یہ مشکلات طلبہ کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ بہت سے حرکت والے الفاظ کو ساکن پڑھنے کی روایت عام ہوگئی ہے مثلاً: علما، فضلا، شعرا، فقرا، جہلا، شرکا، ادبا، رؤسا، ورثا، امرا، طلبہ، سفرا وغیرہ کو حرف دوّم پر جذم کے ساتھ پڑھنے کی غلط روایت بن چکی ہے۔

شعرا کو شعرا، علما کو علا، فضلا کو فضلا، شرکا کو شرکا، فقرا کو فقرا، جہلا کو جہلا، ادبا کو ادبا، طلبہ کو طلباء، امرا کو امرا، سفرا کو سفرا، اساتذہ، اساتذہ، جدّ وجہد کو جدّ وجہد، جہالت کو جہالت، خودکشی کو خودکشی، زعم کو زعم، شمولیت کو شمولیت، معتوں کو معتوں، ناراضی کو ناراضگی، پڑھنے کی ایک عام روش پڑھے لکھے افراد میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح سے جمع الجمع استعمال کرنے کی روایت عام روش کا حصہ بن چکی ہے۔ جیسے: وجوہ کی جگہ وجوہات، رسوم کی جگہ رسومات، اکابر کے لیے اکابرین، عمائد کے لیے عمائدین، لوازم کے لیے لوازمات، ارکان کے لیے اراکین، مشائخ کے لیے مشائخین وغیرہ الفاظ کو غلط اعراب کے ساتھ پڑھنا عام ہوگیا ہے۔

> ”اردو روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ اخبارات و رسائل اور ٹیلی ویژن نشریات کے علاوہ ٹی وی چینلس پر اردو کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔“

بول چال کی زبان میں بھی انگریزی کا تسلط اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہر پڑھا لکھا شخص اپنی گفتگو میں انگریزی الفاظ کا بے محابہ استعمال کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال کے لیے ایک اقتباس پیش ہے۔ ایک صاحب اپنے ساتھیوں کو کسی جلسہ کی روئیداد سنا رہے تھے۔ ان کی باتیں کچھ اس طرح تھیں:

”جب ہم ہال میں انٹر (Enter) ہوئے تو اندر گیدرنگ (Gathering) (مجمع) کچھ خاص نہیں تھی، بہت سی کرسیاں ایمٹی (Empty) پڑی تھیں، اسپیکر بہت لاؤڈلی (Loudly) بول رہا تھا، میں واپس آ گیا، اس لیے کہ وہاں خواہ مخواہ ٹائم ویسٹ ہونا تھا۔“

(زبان خامہ کی خامیاں، علیم ناصری، پاکستان، صفحہ 66)

امکانات

✪ اردو میں مغربی علوم وفنون کے تراجم اور اصطلاحات سازی کے عمل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اردو روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ اخبارات و رسائل اور ٹیلی ویژن نشریات کے علاوہ ٹی وی چینلس پر اردو کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔ ان خبروں کے پڑھنے والوں کے زبان و بیان اور لفظوں کی ادائیگی پر توجہ دلائی گئی تو وہ اردو زبان کو بہتر طور پر پیش کر سکیں گے۔

✪ آج کل ٹی وی چینلوں کے ذریعے جو خبریں ٹیلی کاسٹ کی جاتی ہیں ان میں بہت سے ایسے انگریزی الفاظ استعمال میں لائے جاتے ہیں جن کے متبادل لفظ اردو میں موجود ہیں، صرف تھوڑی سی توجہ دینے کے بعد یہ کام بہتر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

✪ اردو کے اساتذہ اور زبان کے ماہرین کی کوششوں سے اردو میں دخیل نئے انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے تراجم وضع کیے جا سکتے ہیں شرط یہ ہے کہ انھیں سرکاری سرپرستی حاصل ہو یا کوئی سرکاری ادارہ اس طرف توجہ دے اور ان کی خدمات حاصل کر سکے۔

✪ ریاستی سطح پر اردو سے وابستہ افراد بھی اس جانب توجہ دیں تو یہ کام ناممکن نہیں کیوں کہ اردو سے تعلق رکھنے والے افراد کی ملک میں کمی نہیں اور نئی نسل کو اردو میں نئی اصطلاحات سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ طلبہ کو صحیح زبان سکھانا وقت کا تقاضا ہے۔ ممکن ہے اس جانب حکومت بھی توجہ دے مگر شخصی دلچسپی سے بھی اردو کے اساتذہ یہ کام بہ آسانی انجام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ

نہیں ہے امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حوالے

1. وضع اصطلاحات: مولوی سید وحیدالدین سلیم، انجمن ترقی ہند، اورنگ آباد 1921
2. فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ: مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1991
3. کشاف قانونی اصطلاحات، ترتیب: رشید احمد صدیقی مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1982
4. فرہنگ اصطلاحات اور محاورات قانون، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی 1982
5. حیدرآباد میں اردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد 1990
6. مملکت آصفیہ میں اردو زبان کی ترویج و ترقی، مرتب نظامس اردو ٹرسٹ، ملک پیٹ، حیدرآباد 2022
7. جامعہ عثمانیہ: ڈاکٹر حسن الدین احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 1988
8. ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ (جلد اول): عتیق اللہ اردو مجلس، دہلی 1995
9. زبان خامہ کی خامیاں: علیم ناصری، پاکستان..........
10. حیدرآباد کے علمی اور ادبی ادارے، شفیعہ قادری، حسامی بک ڈپو، حیدرآباد 1983
11. نقوش (مکاتیب نمبر)، ادارہ فروغ اردو لاہور، پاکستان 1968
12. ماہنامہ معارف: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی مارچ 2022
13. سہ ماہی عالمی فلک: مدیر احمد نثار، دھنباد، جھارکھنڈ اکتوبر تا دسمبر 2021
14. اخبار اردو: مقتدرہ قومی زبان، کراچی، پاکستان، مئی 1982

■

Dr. Sabir Ali Siwani
H. No.: 9-4-87/C/12, Ist Floor
Behind Moghal Residency, Tollchowki
Hyderabad- 500008 (Telangana)
Cell.: 9989796088

عشرت صبوحی

اردو کے تانیثی افسانوں میں احتجاجی عناصر

جدید افسانہ آج بھی ترقی پسند افسانے کی طرح اپنے دور کا ترجمان اور عکاس ہے اور اس میں بھی سیاسی جبر، ناانصافیوں، پامال عقائد، شکستہ اقدار اور فرسودہ نظام حیات کے خلاف شدید احتجاج پایا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ علامت نگاروں کا طرز اظہار حقیقت پسند افسانے سے مختلف ہے اور اس میں تمام باتیں واضح اور دوٹوک انداز میں نہیں بلکہ بالواسطہ اور علامتی پیرائے میں کہی جاتی ہیں اس کی وجہ اگر نئے دور کے افسانہ نگاروں کا قدیم پیرایۂ اظہار سے اجتناب اور نئے اسلوب کو بروئے کار لانے کی خواہش ہے تو دوسری وجہ عصر کا تقاضا بھی ہے۔

جدید افسانے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جدید افسانہ روایتی افسانے کی طرح صرف کہانی بیان نہیں کرتا بلکہ زندگی کے تلخ حقائق اور اقدار کی شکست کے ساتھ ساتھ زندگی کی بے معنویت اور بے سمتی کا نوحہ بھی پیش کرتا ہے اور جبر واستحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتا ہے۔ جدید افسانہ نگار عصری مسائل کو جس طرح محسوس کر رہے ہیں اس سے قبل کے افسانہ نگاروں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جدید عہد کے معروضی حالات ماضی قریب کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔

جدید افسانہ نگاروں نے عصری زندگی اور خاص طور پر حالیہ تاریخ کے تمام اہم واقعات پر افسانے لکھے ہیں۔ لیکن ان افسانوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے خاص نظر کی ضرورت ہے قاری چونکہ روایتی افسانہ پڑھنے اور زندگی کو مخصوص نقطہ نظر سے دیکھنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ جب ہمارے سامنے کوئی نیا انداز بیان اور زندگی اور فن کو پرکھنے کے لیے نیا معیار آتا ہے تو ذہن اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، اور قاری اپنے مخصوص اور طے شدہ راہوں پر چلنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے جدید اردو افسانوں میں واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ اردو کا جدید افسانہ نئے تجربات سے گزرا ہے اردو میں ہیئت، اسلوب اور تکنیک میں کافی تبدیلی کے بعد نئی شکل سامنے آئی ہے بہ الفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ زبان موضوع کی تابع ہے لہٰذا نئے طرز اظہار کے لیے ہیئت کی تبدیلی ناگزیر تھی۔

جدید افسانہ نگاروں میں انور سجاد، بلراج مین را، احمد یوسف، شفیع جاوید، شفیع مشہدی، غیاث احمد گدی، زکی انور، الیاس احمد گدی، جیلانی بانو، حسین الحق، شفق، شوکت حیات، عبدالصمد، شمیم افزا قمر، قمر جہاں، سلام بن رزاق، ذکیہ مشہدی، وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں درج بالا جدید افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جدیدیت کے زیراثر استعاراتی اور مبہم انداز پایا جاتا ہے۔ جس سے تانیثیت کا بھرپور موضوع سامنے نہیں آتا لیکن ان میں بعض افسانہ نگاروں مثلاً آمنہ ابوالحسن، قمر جہاں، ذکیہ مشہدی وغیرہ کے افسانوں میں عورت پر ہونے والے جبر واستحصال کا اظہار موجود ہے۔

واجدہ تبسم: واجدہ تبسم کے افسانے بھی ایک خاص تہذیبی ومعاشرتی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں، خواتین اردو ادب میں ان کے افسانے منفرد اور بے باک رجحان کے حامل ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں سماجی اور معاشی دباؤ میں کچلی، دبی اور پسی عورتوں کی نفسیات، ذہنی رجحانات اور ذاتی رد عمل کی مکمل تصویر کشی نظر آتی ہے۔

واجدہ تبسم کا ایک مشہور افسانہ اترن ہے۔ یہ افسانہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں انھوں نے تانیثی فکر واحتجاج کی موثر ترجمانی کی ہے۔ تاریخی، سماجی اور معاشی جبر کی شکار ایک الہڑ لڑکی 'چمکی' کی نفسیات اور ظلم وزیادتی کے خلاف اس کا احتجاجی رویہ پوری طرح سامنے آتا ہے۔ مذکورہ افسانہ تاریخی، سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

افسانہ اترن میں ایک نسوانی کردار 'چمکی' کی کہانی بیان کی گئی ہے جو شہزادی پاشا کے گھر میں بیگمات کے اترن پہنا کرتی ہے جو اس کے لیے انتہائی کرب انگیز بات ہوتی ہے اس کا ضمیر اسے اترن پہننے سے باز رہنے پر ابھارتا ہے مگر چمکی نام کی یہ کنیز مجبوراً اترن پہنتی ہے۔ دھیرے دھیرے اس کے دل میں انتقامی جذبہ سر اٹھانے لگتا ہے۔ بالآخر ایک دن وہ وقت آگیا کہ اس نے بھی نواب صاحب کی بیگم کو اپنا اترن پہنا دیا۔

یہاں 'اترن' سے ہماری مراد استعمال کی ہوئی کوئی بھی چیز ہوتی ہے۔ شہزادی پاشا کی شادی ہونے والی تھی اور تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، اسی رات چمکی کو بھی ایک خوبصورت اور قیمتی جوڑا پہننے کو ملا۔ اس کے دل میں برسوں کا انتقام لینے کا جذبہ ابھرا اور رات کو وہ اپنے خوبصورت اور جوان جسم کو خوبصورت کپڑوں سے مزین کرکے دولہا راجہ کو ملیدہ کھلانے پہنچ گئی۔ وہ ملیدے کے ساتھ خود بھی دولہا راجہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور انھیں اکسانے لگی۔ دولہا میاں کو بھی اختلاط کا نشہ سا چڑھنے لگا اور ملیدے کے بجائے وہ چمکی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہم ملیدے ولیدے سے منھ میٹھا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تو۔ ہاں۔'' انھوں نے ہونٹوں کے شہد سے اپنا منھ میٹھا کرنے کو اپنے ہونٹ بڑھا دیے اور چمکی ان کی بانھوں میں ڈھیر ہو گئی۔ ان کی پاکیزگی لوٹنے۔ خود لٹنے اور انھیں لوٹنے کے لیے۔''

(اترن، مشمولہ، بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، ص 300)

> واجدہ تبسم کا ایک مشہور افسانہ اترن ہے۔ یہ افسانہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں انھوں نے تانیثی فکر واحتجاج کی موثر ترجمانی کی ہے۔ تاریخی، سماجی اور معاشی جبر کی شکار ایک الھڑ لڑکی 'چمکی' کی نفسیات اور ظلم وزیادتی کے خلاف اس کا احتجاجی رویہ پوری طرح سامنے آتا ہے۔ مذکورہ افسانہ تاریخی، سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

واجدہ تبسم نے بڑے جرأت مندانہ انداز میں مسلم معاشرے کے اس نوابی اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے کے نظام کو بے نقاب کیا ہے۔'اترن' جیسی کہانی نے جہاں انھیں شہرت اور مقبولیت بخشی لیکن وہیں سماج کے قدامت پرست طبقے نے انھیں فحش افسانہ نگار قرار دیا۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوئیں۔ بلکہ مسلسل سماجی ناسوروں کے خلاف احتجاج بلند کرتی رہیں۔ ان کے بہت سے افسانے جنسی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں جس کے حوالے سے وہ عورت کی مجبوریوں کو اس کی لاچاریوں اور فطری محرومیوں کو بیان کرتی ہیں لہذا اس اعتبار سے انھیں تانیثیت کا گہرا شعور رکھنے والی افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

آمنہ ابوالحسن: آمنہ ابوالحسن کی تخلیقی نگارشات لگ بھگ نصف صدی سے منظرِ عام پر آرہی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کہانی' 1965 میں شائع ہوا۔ آمنہ ابوالحسن نے عورتوں کی نفسیات کو بہتر طور پر واضح کیا ہے۔ ان کی کہانیاں اس لیے جاندار اور متحرک ہوتی ہیں کہ انھوں نے کائنات میں رونما ہونے والے حالات وواقعات پر محض سرسری نظر نہیں ڈالی ہے بلکہ ان حالات وواقعات کی معنویت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہوئے فرقہ واریت کی شدید مذمت کی ہے۔

آمنہ ابوالحسن کا ایک نمائندہ تانیثی افسانہ 'لحاف' ہے یہ افسانہ عصمت چغتائی کے 'لحاف' سے بالکل مختلف ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے علامتی واستعاراتی انداز میں مردانہ سماج میں عورت ذات کی حیثیت کو بیان کیا ہے۔'لحاف' کی کہانی اصل میں عورت کی کہانی ہے جسے مرد نے جب چاہا استعمال کیا اور جب چاہا چھوڑ دیا۔ 'لحاف' علامت ہے عورت کے وجود کی کہ جس کے میلا ہوجانے پر مرد کو اس کے دھونے کی کوئی فکر نہیں ہوتی اور اگر پھٹنے لگے تو

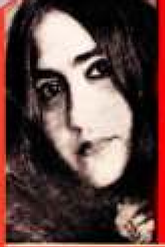

واجدہ تبسم

اُترن

اس کے سینے کا کوئی غم نہیں ہوتا۔ گویا عورت کی حیثیت مرد کے نزدیک ایک لحاف سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ آمنہ ابوالحسن کو کہانی بننے میں کمال حاصل ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بات کہنے کی ماہر ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں نہ تو سیاست بگھارتی ہیں اور نہ ہی فلسفہ طرازی سے مرعوب کرتی ہیں۔ ان کا یہ اختصاص ان کی ہر کہانی میں موجود رہتا ہے۔

افسانہ 'لحاف' میں مہر نسوانی کردار ہے اور شکیل مردانہ کردار ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک ہی لحاف میں سوتے ہیں جب ان دونوں کی شادی ہوئی تھی تب یہ لحاف انتہائی خوب صورت، ملائم اور آرام دہ تھا لیکن اب کافی عرصہ گزر جانے کے بعد اور کم سن بیٹے کے بار بار رات کو پیشاب کرنے کی وجہ سے اس میں بدبو اور میلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ شکیل اس پرانے اور بدبودار لحاف کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتا لیکن مہر کو یہ لحاف اس لیے پیارا تھا کیونکہ اسی لحاف میں وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ شب زفاف کو سوئی تھی، ان حسین لمحوں کی یاد مہر کے پورے وجود اور حواس خمسہ میں رچ بس گئی تھی، اسی لیے وہ افشاں کے بستر گیلا کرنے کے بعد اسے دھوپ دکھاتی ہے اور اس پر عطر چھڑکتی ہے تاکہ اس کی بدبو زائل ہوجائے۔ شکیل کے بار بار منع کرنے کے بعد بھی مہر اس لحاف سے کنارہ کش ہونا نہیں چاہتی ہے آخرکار شکیل ایک نیا خوبصورت لحاف خرید لاتا ہے اور جب دونوں میاں بیوی رات کو سوتے ہیں تو مہر کو اس میں بالکل نیند نہیں آتی وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہتی ہے دوسرے دن وہ پھر اسی پرانے لحاف میں سوتی ہے، یہ پورا افسانہ علامتی اور استعاراتی نوعیت کا ہے مرد جب ایک بیوی سے اکتا جاتا ہے تو وہ دوسری ڈھونڈنے لگتا ہے۔ لیکن عورت جس مرد کا دامن تھام لیتی ہے پھر اسے تادمِ حیات چھوڑنا نہیں چاہتی۔

آمنہ ابوالحسن عورت کے نفسیاتی پہلوؤں کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ انھیں زبان وبیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ وہ عورت ہوکر عورت کی شخصیت اس کی خواہشوں اور سماج میں اس کی حیثیت کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

قمر جہاں: اردو کے تانیثی افسانہ نگاروں میں قمر جہاں کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ قمر جہاں کا اصلی نام بھی قمر جہاں ہی ہے ان کے والد کا نام سید عطاالحق مرحوم تھا اور والدہ کا نام بی بی اختر جہاں تھا۔ ان کی پیدائش 1948 میں دربھنگہ (بہار) میں ہوئی۔

جہاں تک ان کی افسانہ نگاری میں تانیثی شعور کا تعلق ہے ان کے افسانے نہ صرف نسائی خیالات وجذبات پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ وہ سائنسی صنعتی اور تکنیکی دور کی اس تیز رفتار زندگی میں عورت کے ٹوٹتے بکھرتے وجود کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ آج جب کہ عورت زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذہانت اور لیاقت کے جوہر دکھا چکی ہے۔ لیکن اس سائنسی، صنعتی اور تکنیکی دور نے بہت حد تک اس کی خانگی زندگی کو درہم برہم کر دیا ہے قمر جہاں نے اپنے افسانوں میں عصر حاضر کی عورت کے گوناگوں مسائل اور مردوں کے ظلم وستم کو بیان کیا ہے۔

'آج کی عورت' قمر جہاں کا ایک شاہ کار افسانہ ہے جو موجودہ دور کی عورت کے مسائل اور اس کی الجھنوں پر محیط ہے۔ اس افسانے کا تانا بانا قمر جہاں نے بہت ہنر مندی اور ہوشیاری سے تیار کیا ہے۔ اس افسانے کی کہانی ایک ایسی عورت کے اردگرد گھومتی ہے جو سرکاری ملازمت کرتی ہے ایک کالج میں لائبریرین کے عہدے پر کام کرتی ہے گھر میں کھانا تیار کرنے بچوں کے کپڑے دھونے اور مختلف طرح کے گھریلو کام کاج میں اس قدر منہمک ہوجاتی ہے کہ اپنی ڈیوٹی پر اکثر تاخیر سے پہنچتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی باس اسے جھڑکتی اور لعن طعن کرتی ہے۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتی ہے، اور اپنی باس کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن باس بھی سخت مزاج ہے وہ اسے سب کے سامنے جھڑکتی ہے۔ یہ عورت دل مسوس کر رہ جاتی ہے اور اپنے آنسو پی لیتی ہے۔ ایک دن اس لائبریرین کا بچہ سخت بیمار پڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے بچے کو پیار بھرے بول سناتی ہوئی بچے کو اپنی ساس کے حوالے کر کے دفتر چلی جاتی ہے ذہنی بے چینی اور تناؤ کی

وجہ سے دفتری کام میں غلطی ہوجاتی ہے اوراس کی باس اس پر سخت ناراض ہوتی ہے۔تب یہ اپنے بچے کی بیماری کا ذکر کرتی ہے جسے اس کی باس نیا بہانہ سمجھتی ہے۔ بالآخر وہ آدھے دن کی Casual Leave ڈال کر جیسے ہی گھر پہنچتی ہے تو ساس اس پر برس پڑتی ہے۔

اس مجبور عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ نئی نئی شادی کے وہ دن بھی بہت یاد آنے لگتے ہیں کہ جب اس کا شوہر اس کا بہت خیال رکھتا تھا مگر اب وہ بھی گھر سے باہر اپنے کاروبار اور روپیہ کمانے کے چکر میں ہے اور اس کی طرف کم ہی توجہ دیتا ہے۔قمر جہاں کا افسانہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز ہے اس افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آج کے دور میں ملازمت پیشہ عورت گھریلو کاموں اور پھر دفتری کاموں میں کتنی ٹوٹتی بکھرتی اور ذہنی وجسمانی تھکان محسوس کرتی ہے۔لیکن اس کے باوجود کوئی بھی اس پر خوش نہیں ہوتا۔آج کی عورت دوہری ذمے داری نبھا رہی ہے اور اس صورت میں اس کی حالت قابل رحم ہے۔لیکن مرد بالادستی والے سماج کے پاس منصف آنکھیں نہیں ہیں۔

قمر جہاں نے آج کی ملازمت پیشہ خواتین کی الجھنیں اور اس کی دوہری ذمے داری کی جو تصویر مذکورہ افسانے میں پیش کی ہے وہ انتہائی موثر ہے۔انھوں نے مردوں کی سردمہری کی طرف بھی کچھ بلیغ اشارے کیے ہیں یہ مشاہدے کی بات ہے کہ جن گھروں کی عورتیں ملازمت کرتی ہیں انھیں کئی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ جب گھر سے اپنی ڈیوٹی پر نکلتی ہیں تو ان کے بچے ان کا دامن پکڑ لیتے ہیں راستہ روکنے لگتے ہیں چیختے چلاتے ہیں اور ماں کی ممتا ڈھونڈھتے ہیں، جو ان کا پیدائشی حق ہے۔ مگر عورت کو وقت پر ڈیوٹی پر حاضر ہونا پڑتا ہے۔اسی کشمکش میں بچوں کی صحیح پرورش اور نگہداشت نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارا فیملی سسٹم مفلوج ہوکر رہ گیا ہے۔ قمر جہاں نے اس افسانے میں عصر حاضر کی عورت کی جو بھاگ دوڑ دکھائی ہے۔وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ مردانہ سماج کے وضع کردہ اصولوں اور روایات کے خلاف عورت نے بغاوت کا اعلان تو کر دیا ہے لیکن اس کے بدلے میں اسے بہت سی الجھنوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ آئے دن ذمے داریوں کے بوجھ تلے دبتی چلی جارہی ہے۔

مابعد جدید افسانے کی ابتدا 1980 کے آس پاس ہوتی ہے۔مابعد جدید افسانہ نگاروں کی تعداد کافی زیادہ ہے کیونکہ اس سفر میں جدیدیوں کی بھی شمولیت رہی اور وہ خالص بیانیہ کی طرف لوٹ آئے اور اسی ڈگر کو اپنانے کی کوشش کی جو مابعد جدید فن کاروں کا موقف تھا۔

مابعد جدید افسانے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ سماجی عوامل سے آنکھیں نہیں چراتا، فرد کی تنہائی سے بھی اسے کوئی بیر نہیں ہے۔ موضوعات کے انتخاب میں بھی کوئی مسئلہ درپیش نہیں آتا کسی بھی تکنیک کے استعمال سے اسے گریز نہیں اور نہ ہی کسی تعصب کا شکار ہوتا ہے۔گویا مابعد جدید افسانے کا پورا رویہ انحراف سے زیادہ انجذاب کا عکاس معلوم ہوتا ہے۔

جدید افسانے کی طرح مابعد جدید افسانے میں نہ سمجھ میں آنے والی علامت نگاری، فیشن زدگی، تجریدیت تھی اور نہ ہی مبہم موضوعات تھے۔ اس لیے قاری کی دلچسپی ان افسانوں میں بڑھی۔

مابعد جدید تانیثی افسانہ نگاروں میں قمر اعجاز، غزال ضیغم، ثروت خان، نگار عظیم، تبسم، فاطمہ، شائستہ فاخری، ہاجرہ مشکور، عنبری رحمٰن، رخسانہ صدیقی، کہکشاں پروین، افشاں زیدی اور فریدہ رحمٰن وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

نگار عظیم: نگار عظیم کے افسانوں میں مرکزی حیثیت عورت کو حاصل ہے۔نگار عظیم کا اصلی نام مہر نگار اور قلمی نام نگار عظیم ہے 23 ستمبر 1951 کو میرٹھ (یوپی) میں پیدا ہوئیں۔ وہ تقریباً پچیس سالوں سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'عکس' 1990 میں اور 'گہن' 1999 میں شائع ہوئے۔

نگار عظیم سماجی احوال وکوائف پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتی نظر آتی ہیں کہ عورت مردانہ ظلم وستم اور زیادتیوں کو برداشت نہ کرے چونکہ جب وہ مردوں کے ظلم وستم برداشت کرتی ہے یا نظر انداز کرتی ہے تو اس پر اور زیادہ ظلم، ناانصافی اور محکومیت کے تالے جڑ دیے جاتے ہیں۔اس لیے عورت کو چاہیے کہ وہ سراپا احتجاج بن جائے، اسی احتجاجی رویے کے تحت وہ بہت حد تک مردانہ بالادستی اور استحصال سے محفوظ رہ سکتی ہے اور سماج میں اپنا مقام حاصل کرسکتی ہے۔

نگار عظیم کا ایک شاہکار افسانہ 'ابورشن' ہے۔جس میں عورت کی بے بسی اور مرد کی خود غرضی کو بڑے فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس افسانے میں انھوں نے تانیثی فکر واحساس کو بڑے موثر انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار ایک عورت ہے جو ایک ریڈیو اسٹیشن میں کام کرتی ہے جہاں مختلف مردوں اور عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور ایک دن ریڈیو پر ہی عورت کی آزادی اور اس پر مردوں کے ظلم وبربریت پر ایک مباحثہ رکھا جاتا ہے اس میں کئی مرد اور عورتیں حصہ لیتی ہیں۔ افسانہ 'ابورشن' کا مرکزی کردار ایک سنجیدہ اور دوراندیش عورت ہے وہ رابعہ نام کی ایک عورت کو جو اپنے شرابی شوہر کی جنسی خواہش پوری نہ کرنے کی صورت میں زدوکوب ہوتی ہے اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے لیکن کچھ دن کے بعد وہ پھر اپنے شوہر کے پاس جانے کو آمادہ ہو جاتی ہے جس پر ریڈیو اسٹیشن پر ملازمت کرنے والی خاتون اس سے خفا ہوجاتی ہے کیونکہ وہ خواتین کے لیے باضابطہ طور پر ایک مشن کا کام کرتی ہے اس لیے وہ نہیں چاہتی کہ رابعہ اپنے شوہر کے پاس بغیر انتقام لیے چلی جائے۔

نگار عظیم کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر نئے موضوع کی تلاش میں رہتی ہیں۔ وہ سماج کی ان حقیقتوں تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں، جہاں تک دوسری خواتین افسانہ نگار کی نظر نہیں پہنچتی۔ نچلے اور متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی اور ان کی الجھنوں کو خصوصی اہمیت دیتی ہیں۔'ابورشن' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''طلاق اور عورت کو زندہ جلا دینے والے اذیت ناک واقعات، عورت کا مستقبل، تعلیم نسواں، شوہروں کی زیادتیاں، ان پڑھ عورت کے مسائل، اس مباحثے میں حصہ لے کر مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ کیونکہ مجھے لگا سب کے سب وہاں عورت کے مسائل پر کم اور مرد کے خلاف زیادہ محاذ آرائیاں کر رہے ہیں۔ جب کہ میرا نظریہ ذرا مختلف تھا، عورت ظلم سہے گی تو ظلم ہوتا رہے گا۔ ظلم سہنا بند کر دے گی تو ظلم کے راستے بھی بند ہو جائیں گے۔ سیکڑوں مثالیں ہیں عورت پر عورت کے ظلم کی۔

چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے رابعہ کو آواز دی رابعہ ایک کپ چائے...''

بی بی ہم تو جاتے ہیں... آپ کا رستہ دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہم تو'' کہاں جا رہی ہے؟''

گھر...''

یہ پاگل ہوئی ہو تم... ؟ اتنی جلدی بھول گئیں تم... اتنا مارا تھا تمھیں لیاقت نے شراب پی کر...

''آدھی رات کو ہمیں اس نے گھر سے نکال دیا تھا۔''

کیا کریں بی بی جی... غلطی تو میری تھی...''

کیا غلطی تھی تمہاری؟

وہ ذرا شرمائی... جھجکی... اور مسکراتے ہوئی بولی:

''نشے میں کچھ ادھک تنگ کرتا ہے نا؟ بس ہم نے اس کی بات نہ مانی، اسی لیے مارتا تھا۔اب کیا کریں بی بی؟ آدمی تو اپنا ہی ہے۔ دوسری عورت لینے چلا گیا تو ہمارا گھر برباد ہو جاوے گا۔ اپنے ہوا کا باپ بھی تو ہے وہ جاویں نائی تو کیا کریں؟ تنک بولی، آپ کو چاہ بنا دوں پھر چلی

جاؤں گی...''

''نہیں رہنے دو... تم جاؤ مجھے چائے نہیں پینا''

لڑو عورتوں کے حقوق کے لیے... میں بڑبڑائی...

فون کی گھنٹی بج اٹھی... ٹرن ٹرن ہلو... کیا...؟

مندرجہ بالا اقتباس میں نگار عظیم نے نہایت ہنرمندی سے ایک ناخواندہ عورت کا المیہ بیان کیا ہے عورت کو یہ احساس ہے کہ اگر وہ اپنے شرابی شوہر کے پاس فوراً نہیں جائے گی تو وہ کسی دوسری عورت کو گھر میں بٹھادے گا اور یہ احساس بھی اسے فکر میں مبتلا کرتا ہے وہ اس کے بیٹے کا باپ ہے۔ ہمارے سماج میں ہر روز کئی طرح کے بھیانک جرائم رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جس کا تعلق عورتوں کی بے بسی سے ہوتا ہے، عورت جب اپنے شوہر سے تنگ آجاتی ہے تو خودکشی کر لیتی ہے یا پھر راہ فرار اختیار کر لیتی ہے۔ غرض مرد کی کمزوریاں، زیادتیاں اور اس کی ناانصافیاں ازدواجی زندگی کو درہم برہم کرنے میں محرک ثابت ہوتی ہیں۔

کہکشاں پروین: کہکشاں پروین کی پیدائش مغربی بنگال میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید مسعود الدین تھا۔ ان کی شادی مشہور مضمون نگار اور کالم نویس اختر آفتاب کے بڑے صاحبزادے سید حسین فاطمی سے ہوئی۔ کہکشاں پروین اردو کے متعدد رسالوں میں افسانے اور مضامین لکھ رہی ہیں۔ ان کی تصنیفات میں 'ایک مٹھی دھوپ' (افسانوی مجموعہ) 'دوپہر کا سفر' (افسانوی مجموعہ) 'سرخ لکیریں' (افسانوی مجموعہ) 'صالحہ عابد حسین بحیثیت ناول نگار' (تحقیق وتنقید) اور، منٹو اور بیدی کا تقابلی مطالعہ (تنقید) شامل ہیں۔

کہکشاں پروین کے افسانوں میں تانیثیت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے ان کے افسانوں میں عورتیں مردوں کے استحصالی شکنجے میں جکڑی نظر آتی ہیں۔ کہکشاں کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد بھی عورتیں ابھی تک مردوں کے ظلم وستم کا شکار ہیں۔ مرد، عورت کی نزاکت اور معصومیت کی آڑ میں اس پر قہر برپا کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ عورت کی جو حالت ابتر قدیم سماج میں تھی آج کی عورت کی وہ مایوس کن حالت نہیں ہے آج کی عورت مکمل طور پر اپنی اہمیت اور صلاحیت کا اعتراف کروانے میں کامیاب ہوئی ہے وہ قدرت کی ان تمام عطا کردہ خوبیوں کا مظاہرہ کر رہی ہے جن پر کسی زمانے میں اس پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ کہکشاں پروین کے اکثر افسانے عورت کی اسی تلخ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ 'سراب' قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے عورت کی ازلی کمزوری اور اس کی مجبوری کو موضوع بنایا ہے زیر بحث افسانے کا پس منظر بہار کی یا پھر راجستھان کی وہ مزدور طبقہ خواتین سے تعلق رکھنے والی کنواری مانو ہے جو انتہائی حسین ہے اور کسی گاؤں میں اپنے غریب ماں باپ اور ایک چھوٹی بہن پارو کے ساتھ رہتی ہے۔ مانو بھیڑ بکریاں چراتی ہے اور گھر میں پیٹ بھر کھانا میسر نہیں ہے چنانچہ نئی ریاست کے قیام کے بعد حالات بدلتے ہیں۔ مانو کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں مزدوری زیادہ ملے گی اس لیے وہ اپنے بوڑھے والدین اور دادی اماں سے نمناک آنکھوں سے رخصت ہوتی ہے۔ شہر میں اپنے علاقے کی مزدور طبقے کی خواتین کے ساتھ رات دن مزدوری کر کے خوب روپے جمع کرتی ہے لیکن ہر روز جب شام کے وقت ٹھیکیدار یا اس کا کوئی کارندہ مزدوروں کو ان کی مزدوری بانٹتا ہے تو مانو کو یہ خدشہ رہتا ہے کہ اس کے روپے کوئی چرالے گا اس لیے وہ ہفتہ دس دن کے بعد اپنے بوڑھے بابا کو روپے لینے کو کہتی وہ آکر روپیہ لے جاتا۔ پھر والدین کسی مجبوری کے تحت مانو کے پاس نہیں پہنچ پاتے ہیں تو اس کی چھوٹی بہن پارو آتی ہے جس کی بھری جوانی کو دیکھ کر ٹھیکیدار اور اس کے کارندے اُسے اپنے دام فریب میں مقید کرنا چاہتے ہیں لیکن مانو کی غیرت اور پاک نسوانی جذبہ یہ گوارہ نہیں کرتا ہے کہ پارو اس کے پاس روپے لینے آئے۔ چونکہ اسے یہ معلوم ہے کہ یہاں ٹھیکیدار جسم وجان کا بھی ٹھیکہ کرتے ہیں۔ والدین کی زیادہ روپیہ بھیجنے کی فرمائش پر مانو مجبوراً ٹھیکیدار کے پاس جا کر اس سے روپے مانگتی ہے اور مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنا جسم بیچنے پر بھی آمادہ ہوجاتی ہے۔ اس مقام پر اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ گاؤں سے اٹھ کر شہر میں مزدوری کمانے آنا ایک سراب کے سوا اور کچھ نہیں تھا!

کہکشاں پروین افسانہ 'سراب' کے ذریعے اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتی ہیں کہ مردوں کی کمزوری عورت ہے اور عورت کی کمزوری اس کے خوبصورت جسمانی خد وخال ہیں۔ خوبصورت عورت سماج میں استحصال کا زیادہ شکار ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حسین عورت کو مرد غالب معاشرہ پاکدامن رہنے نہیں دیتا۔ ہندوستان کی کچھ ریاستوں میں شادی شدہ یا غیر شادی شدہ خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کڑکتی دھوپ اور کڑاکے کی ٹھنڈ میں بارہ مہینے کام کرتی ہیں۔ زیادہ تر بہار، راجستھان اور چھتیس گڑھ کی خواتین مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں اور اپنے شوہر اور بچوں کی کفالت کرتی ہیں۔ کہکشاں پروین کے افسانہ 'سراب' میں مانو کا کردار بھی ایک ایسی مظلوم لڑکی کا کردار ہے جو اپنے والدین اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے مردوں اور اپنی عمر وطبقے کی خواتین کے ساتھ مزدوری کرتی ہے یہاں تک کہ محض روپے کمانے کی خاطر وہ اپنے خوبصورت جسم کو ٹھیکیدار کے سپرد کرنے کو تیار ہے۔

کہکشاں پروین اپنے افسانے کو کامیاب بنانے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ وہ ایک نقاد ہی نہیں بلکہ ایک سلجھی ہوئی کہانی کار بھی ہیں۔ وہ عورتوں کے مسائل اور مصائب کو بخوبی جانتی ہیں۔ اور اُسے اپنے افسانوں میں بیان کرنے کا سلیقہ بھی رکھتی ہیں۔

غزال ضیغم: 'ایک ٹکڑا دھوپ کا' افسانوی مجموعے کی مصنفہ غزال ضیغم کے افسانوں کا حاوی رجحان تانیثی ڈسکورس ہے۔ یہ خواتین افسانہ نگاروں کی نئی نسل میں شمار کی جاسکتی ہیں۔

غزال ضیغم کے افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھیں اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش ہے اس سلسلے میں وہ اپنی پوری تہذیبی وثقافتی وراثت اور قدروں کا از سرِ نو تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرتی ہیں۔ اس

سلسلے میں ترنم ریاض ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:

''غزال ضیغم کا شمار ان نئی خواتین افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے جو اپنی تاریخ، تہذیب سماجی وثقافتی وراثت اور اقدار کا از سر نو جائزہ لے کر انھیں اپنے تجزیوں کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے افسانے ان کی سوچ اور فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان سادہ اور دلچسپ ہے۔

(ترنم ریاض: بیسویں صدی میں خواتین ادب، ص88)

غزال ضیغم کا ایک دلچسپ اور متاثر کن افسانہ 'مدھوبن میں رادھیکا' ہے، جو ان کے فن کی عظمت پر دال ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے اپنی تخلیقی بصیرت سے اپنی تہذیب اور سماجی اقدار کو معتبر قرار دیا ہے۔ اس افسانے میں نجمہ باجی نام کی ایک ایسی جدید تہذیب کی دلدادہ عورت کی سوچ اور طرز زندگی کو عیاں کیا گیا ہے، جو سگریٹ پیتی ہے اور مردوں کے ساتھ دوستی قائم کرنے میں بڑی ماہر ہے۔ افسانے بھی لکھتی ہے اور بہترین مقرر بھی ہے اور اپنی باغیانہ طبیعت کی وجہ سے مردوں کو گھاس نہیں ڈالتی۔ لپ اسٹک سے اپنے ہونٹوں کو لال رکھتی ہے۔ اپنی شوخ اداؤں میں اپنی کشش رکھتی ہے کہ مرد اس کی طرف خود بخود کھنچتے چلے آتے ہیں۔ غزال ضیغم ایک راوی کی حیثیت سے اس عورت کی زندگی اور اس کی سوچ کو بیان کرتی ہیں۔ یہ نجمہ بیورو آفس میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہے وہ عورتوں سے دوستی نہیں کرتی ہے کیونکہ اس کی نظروں میں ساری عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں۔ ساجد نام کا ایک ملازم نجمہ باجی کا ہمراز ہے۔ جس کے نزدیک نجمہ باجی ایک مکمل عورت ہے۔ ایک دن وہ نجمہ باجی کو اپنے گھر میں دعوت دیتا ہے اور خوب خاطر مدارات کرتا ہے۔ کہانی کی راوی خاتون بھی ساجد کے گھر پر نجمہ باجی سے ملنے آتی ہے۔ اور ساجد کی بیوی صائمہ کے دل میں شک کی سوئی گھومنا شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے دونوں بچے ساجد کے حوالے کر کے روتی پیٹتی اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ اختلاف کافی بڑھ جاتے ہیں ادھر نجمہ باجی اپنی خودداری اور بے باکی کے باعث شوہر کے ہوتے ہوئے الگ گھر میں رہتی ہیں۔ کہانی کی راوی خاتون کے شوہر کو ایک دن نجمہ باجی کا فون آتا ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی فوراً میرے گھر پر آؤ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ وہ دونوں نجمہ باجی کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور نجمہ باجی آہستہ سے کہتی ہے کہ اپنے طلاق نامے پر تم دونوں کے دستخط چاہئیں کچھ دن کے بعد یہ خبر آتی ہے کہ نجمہ باجی نے خودکشی کرنے کی کوشش کی اور اسپتال میں زیر علاج ہیں ان کے دفتر کے تمام ملازم اور ان کے چاہنے والے تحفے لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ آگے کیا دیکھتے ہیں کہ نجمہ باجی اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائے بیٹھی سگریٹ پی رہی ہیں اور سب کو دیکھ کر مسکرا رہی ہیں۔

غزال ضیغم نے پوری کہانی میں نجمہ باجی کے کردار کو بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ مذکورہ افسانے میں مصنفہ نے دراصل یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت پر نہ تو بہت زیادہ پابندیاں ہونی چاہئیں اور نہ وہ بالکل آزاد ہونی چاہیے۔ نجمہ باجی ایک آزاد خیال عورت ہے جسے سبھی ایک مکمل عورت سمجھتے ہیں لپ اسٹک اور سگریٹ پینا انھیں بہت پسند ہے۔ مردوں سے دوستی رکھنا اور شوہر کے ہوتے ہوئے بھی تنہائی کی زندگی گزارنا ان کی شخصیت کو مشکوک کرتا ہے۔ اس افسانے میں ہمیں ایک ایسی عورت کا کردار ملتا ہے جو فیشن پرست، عیاش اور باغیانہ ذہنیت کی مالک ہے۔ جو شوہر کے بدلے شوہروں کو پسند کرتی ہے۔ اس طرح جب ساجد کی دعوت پر نجمہ اس کے گھر پر جاتی ہے تو ساجد کی بیوی اپنے شوہر پر شک کرتی ہے۔ اور اس طرح دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلاف بڑھتے ہیں اور ایک مایوس کن صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

غزال ضیغم نے اپنے افسانے 'مدھوبن میں رادھیکا' میں نجمہ باجی کی ان تمام حرکات وسکنات اور طرز فکر کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ قاری کے سامنے ایک باغیانہ ذہنیت کی عورت کا کردار ابھرتا ہے۔ جو سماجی اصول وضابطوں کی پرواہ نہیں کرتی اور مردوں کو اپنی انگلی پر نچانا چاہتی ہے۔ اور اپنی انا پر قائم رہتی ہے اور اپنے شوہر سے محض اس لیے طلاق لیتی ہے کیونکہ شوہر اس کی نامناسب آزادی کو برداشت نہیں کر پاتا ہے۔ وہ آدھی آدھی رات کو مجلسوں اور پارٹیوں سے واپس گھر آتی ہے جس کی وجہ سے شوہر مایوس رہتا ہے۔ اور بالآخر طلاق ہو جاتی ہے۔ نجمہ باجی طلاق لینا گوارہ کرتی ہے لیکن شوہر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کو تیار نہیں۔ بری عادتوں نے اس میں غرور، انانیت اور باغیانہ ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ اس بیان کی تصدیق بقول راوی:

''کیا آگ ہے اس عورت میں... کیا لکھتی ہے... لگتا ہے آتش فشاں کا لاوا بہہ رہا ہے... پوری کائنات جل رہی ہے۔ جلتی سگریٹ اس عورت کے بیضاوی ہونٹوں پر اتنی خوبصورت اتنی دلکش لگتی ہے جیسے معصوم بچے کی شرارت۔''

غزال ضیغم نے نجمہ کے ذریعے عصری خواتین کے مسائل کا اظہار کیا ہے۔ ہر چند کہ نجمہ ایک ویلن نظر آتی ہے لیکن قاری کی ہمدردی اس کے ساتھ اس لیے ہو جاتی ہے کیونکہ بہر کیف وہ عورت ہے جو بنیادی طور پر اپنے شوہر سے وفا چاہتی ہے لیکن جب وہ اس سے محروم ہو جاتی ہے تو نجمہ دوسری زندگی جینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ غزال ضیغم ایک ذی شعور اور ذی علم خاتون ہیں ان کا کینوس کافی وسیع ہے، یہ ان کا تانیثی افسانہ ہے۔

جدید اردو افسانے کا مطالعہ کرتے ہوئے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو افسانے میں خواتین افسانہ نگاروں نے تانیثی افسانوں میں احتجاجی عناصر کو شروع ہی سے روا رکھا۔ احتجاج ہر زمانے میں بڑے ہی گھن گرج کے ساتھ داخل ہوا۔ ابتدا میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اردو ادب میں تانیثیت کی روایت کا باقاعدہ آغاز 1932 یعنی انگارے کی اشاعت کو ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے قبل نذر سجاد حیدر، ممتاز شیریں اور حجاب امتیاز علی جیسی اہم خواتین افسانہ نگاروں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے افسانوں میں بھی نسوانی آواز اور نسائی احتجاج ایک زیریں لہر کی صورت میں سہی لیکن موجود ہے۔

اردو افسانے میں تانیثی مسائل اور احتجاجی عناصر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ فی زمانہ اس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اللہ رب العزت نے اسے جس خصوصی سانچے میں ڈھالا ہے وہ نازک اور حسین ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ آج خاتون ہر شعبے میں مرد کے ہم قدم ہے لیکن کیا مردوں جیسے طور طریقے اپنانے سے عورت مرد بن سکتی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب تانیثی فکر رکھنے والوں کو ڈھونڈھنا چاہیے۔ میرے خیال میں موجودہ دور کی عورت مردوں سے ایک طرح کا انتقام لے رہی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ کسی بھی طور پر مردوں سے کم نہیں اور وہ واقعتاً کسی بھی شعبے میں مرد سے پیچھے نہیں ہے۔ موجودہ دور کی عورت کو تمام حقوق اور تمام سہولیات حاصل ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ مرد کی بالادستی والے سماج نے عورت کے استحصال کے کئی نئے در، دریچے کھول دیے ہیں۔

■

Dr. Ishrat Saboohi
Asst Prof. Dept of Urdu
Patna University
Patna- 800005 (Bihar)
Mob.: 7091175140

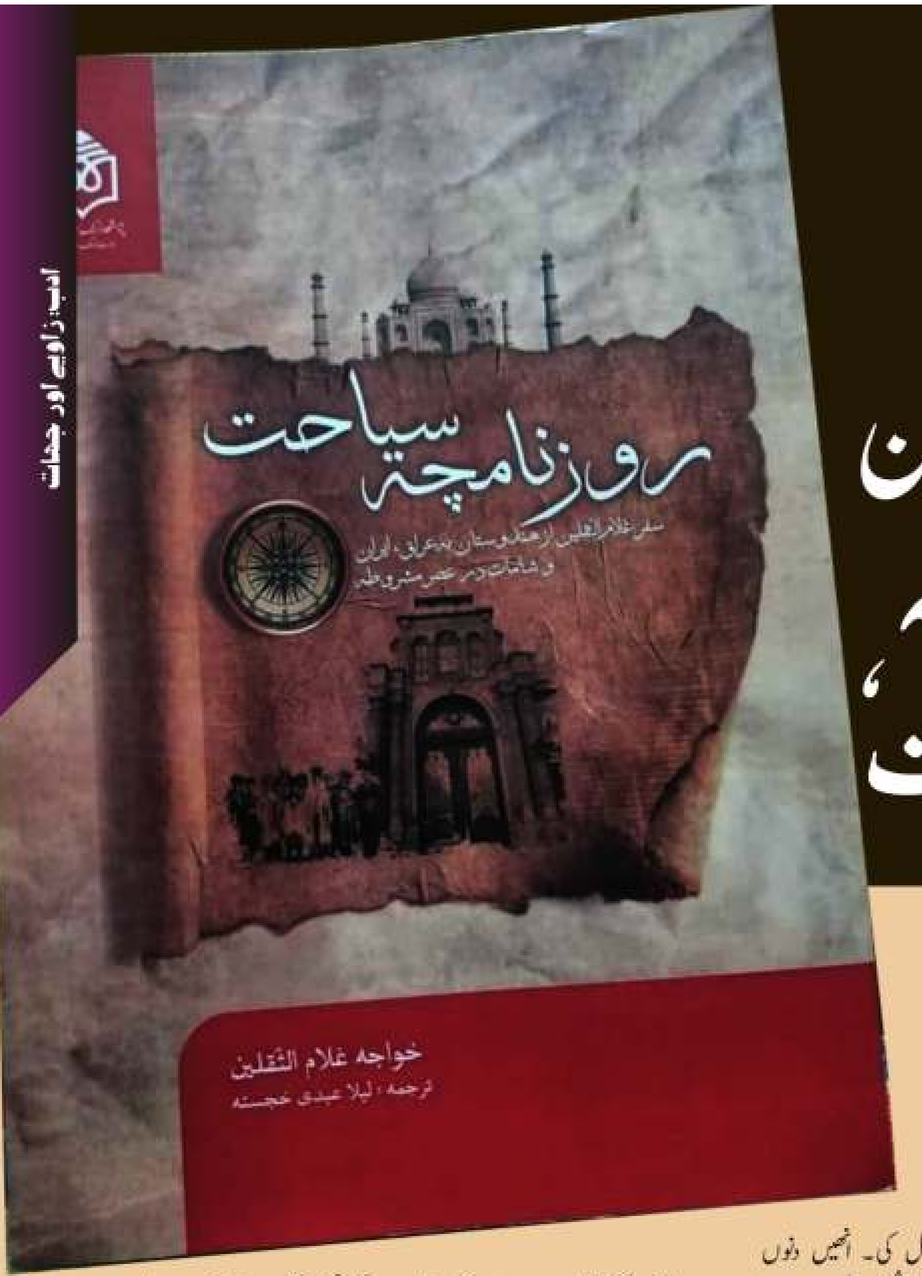

فیضان حیدر

خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ 'روزنامچہ سیاحت'

خواجہ غلام الثقلین ایک سچے، بے غرض اور انسانی قدروں کے پاسدار شخص تھے۔ انھوں نے پوری زندگی عوام اور سماج کی تعمیر وترقی کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ ایک شریف النفس انسان تھے۔ سماج اور معاشرے کی خدمت کے وقت ان کے ذہن میں کبھی نہ ستائش کی تمنا رہی اور نہ ہی صلے کی پروا۔ مخالفتوں، بدگمانیوں اور اعتراضوں کے جوابات بھی انھوں نے بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ دیے ہیں۔

انھوں نے علمی، ادبی اور صحافتی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کا رسالہ 'عصر جدید' آفاقی قدروں کا ترجمان تھا۔ اس نے اردو زبان وادب کی خدمت کے ساتھ قوم وملت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین کی پیدائش 1872 میں پانی پت میں ہوئی۔ والد کا نام خواجہ غلام عباس تھا۔ ان کے آباواجداد بادشاہ بلبن کے عہد حکومت میں ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے۔ بادشاہ نے پانی پت کے نواح کا علاقہ ان کو بطور جاگیر دیا تھا۔ ان کا سلسلہ نسب پیغمبر اکرمؐ کے مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے۔ ابتدائی نشوونما والد کے زیر سایہ ہوئی۔ پھر انھوں نے خواجہ غلام الثقلین کو ایک سرکاری مدرسے میں داخل کرادیا۔ اس کے بعد کی تعلیم انھوں نے مدرسہ شاخ انصار پانی پت میں حاصل کی۔ انھیں دنوں مولوی شیخ احمد علی مرحوم سے فارسی اور عربی قواعد کی کتابیں پڑھیں۔

ایک بار انھیں دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کی رونق دیکھی تو اپنے والد سے ضد کی کہ آگے کی تعلیم دہلی میں ہی حاصل کریں گے۔ چنانچہ تقریباً 12 سال کی عمر میں ان کو مولانا الطاف حسین حالی کے زیر نگرانی دہلی بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کا داخلہ اینگلو عربک اسکول میں کرادیا گیا۔ 1887 میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور انٹرنس کے لیے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ انٹرنس کی تعلیم تک وہ اپنا زیادہ تر وقت مطالعے میں صرف کرتے۔ نصابی کتابوں کے ساتھ ادبی کتابوں کے مطالعے بھی کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کا ذہن ادب کی طرف مائل ہوگیا۔

ایک روز مولوی ذکاء اللہ مولانا حالی سے ملنے گئے۔ خواجہ غلام الثقلین کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ یہ صرف پڑھا ہی کرتے ہیں یا کچھ لکھتے بھی ہیں؟ تو مولانا حالی نے جواب دیا کہ اب تک تو ان کی کوئی تحریر میں نے نہیں دیکھی۔ منشی ذکاء اللہ نے کہا کہ "برتن میں جب پانی بھرے گا تو وہ رسے گا بھی۔" غرض ان کے درمیان یہ بات آئی گئی اور ختم ہوگئی، لیکن اس وقت خواجہ غلام الثقلین کو بڑی غیرت محسوس ہوئی اور انھوں نے ٹھان لیا کہ اب صرف مطالعہ ہی نہیں کرنا ہے بلکہ حاصل مطالعہ کو بھی تحریری صورت میں قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔ چنانچہ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے ایک مضمون بہ عنوان 'النظر فی التاریخ' لکھا جو تقریباً بیس صفحات پر مشتمل تھا۔ اس مضمون کی اس زمانے میں بڑی دھوم رہی۔ اس کے بعد علمی و ادبی حلقے میں ان سے لوگ واقف ہوگئے۔ خصوصاً علی گڑھ کالج میں علامہ شبلی نعمانی سے نیاز حاصل رہا اور سرسید سے بھی تقرب حاصل ہوگیا۔

اکتوبر 1889 سے اپریل 1894 تک علی گڑھ کالج

سے وابستہ رہے۔ وہیں سے ایف اے، اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران انھوں نے علمی و ادبی معاملات میں بڑی دسترس حاصل کرلی تھی۔ کئی اہم موضوعات پر ان کی سرسید سے بھی بے تکلفانہ گفتگو ہوا کرتی تھی۔ مسٹر بیک کے مقابلے میں شرکت کیا کرتے تھے اور علمی و سیاسی معاملات پر ان سے مباحثے بھی ہوا کرتے تھے۔ 1890 میں انھوں نے مسٹر آرنلڈ کی سرپرستی میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام 'اخوان الصفا' تھا۔ اس انجمن کے تین بنیادی مقاصد تھے۔ 1۔ زندگی کی پاکیزگی؛ 2۔ علمی مذاق پیدا کرنا؛ 3۔ باہمی محبت اور آپسی بھائی چارہ قائم کرنا۔ اس انجمن کے تحت دو ڈھائی سال میں کئی اہم مضامین پڑھے گئے۔ لیکن ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد یہ انجمن قائم نہ رہ سکی۔ اس کے ٹوٹنے کی دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ دنوں بعد پروفیسر

خواجہ غلام الثقلین کا 'روزنامچہ سیاحت' اس اعتبار سے اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے کہ اس میں انھوں نے جن مقامات، شہروں ا ور ملکوں کا سفر کیا ہے وہاں کے سفری کوائف، جغرافیہ اور تاریخ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوگئی ہیں۔

آرنلڈ بھی علی گڑھ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر ایل ایل بی کے لیے دوبارہ علی گڑھ گئے اور نومبر 1895 میں ایل ایل بی پاس کیا۔

1896 میں مولوی سید علی حسن ناظم حیدرآباد کے اصرار پر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں چار ماہ تک 'فلک نما' کے بے نظیر محل میں رہے۔ پھر عدالت دیوانی بلدہ (حیدرآباد) میں بطور کارآموز آنریری جج مقرر ہوگئے جس میں پانچ سو روپے تک کے مقدمات ان کے سپرد رہے۔ پھر انسپکٹری مدارس ورنگل پر بھیجے گئے۔ اسی عہد میں سرسید کے حالات کے متعلق چند مضامین انگریزی میں 'آبزروز' کے لیے لکھے۔ ہندی ناگری مباحثے کے متعلق 1900 میں ایک کھلا خط لارڈ کرزن اور ایک سرانٹونی میکڈانل کے نام لکھا جو مسٹر حامد علی خاں (لکھنؤ) کی انگریزی کتاب میں شامل ہے۔ اسی دوران اردو میں بھی کئی اہم مضامین لکھے جن میں 'عمر خیام کا فلسفۂ حیات'، 'سوفسطائی حکما اور ان کا فلسفہ' اور 'مذہب و علم' وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ 1901 میں وزارت حیدرآباد سے دو سال کی رخصت لے کر شمالی ہند چلے آئے اور پھر واپس نہیں گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔

جنوری 1903 میں 'عصر جدید' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں انھوں نے زیادہ تر سوشل، اصلاحی اور تمدنی مضامین کو جگہ دی۔ کچھ دن مالیر کوٹلہ اور پھر لکھنؤ میں قیام رہا۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران شیعہ سنی اختلافات زوروں پر تھے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے دونوں کے درمیان اختلافات کو ختم کرانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی کوششیں بارآور نہ ہوئیں۔ چنانچہ دونوں مسلک کے افراد ان سے بدظن ہوگئے اور ان کی تحریر و تقریر خصوصاً 'عصر جدید' کے اصلاحی مضامین پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس سلسلے میں ان کا ہزاروں روپے کا نقصان بھی ہوا۔ اس کے بعد وہ بد دل ہوکر میرٹھ اور پھر پانی پت چلے گئے۔ زندگی کے آخری ایام میں سخت علیل رہے اور میرٹھ میں قیام رہا۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اگست 1915 کے اوائل میں موگھری چلے گئے۔ بیس بائیس روز وہاں قیام کیا لیکن طبیعت رو بہ صحت نہیں ہوئی۔ 22 اگست کو اسی علالت کی حالت میں پانی پت لوٹ گئے۔ آخر کار 3 ستمبر 1915 کو جمعہ کے روز حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال کیا۔ خواجہ غلام السیدین نے اپنے ایک کتابچے بہ عنوان 'ایک مرد درویش' میں ان کی شخصیت، مشاغل اور کارناموں کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سطحی نظر سے دیکھیے تو ان کی زندگی میں کوئی ایسے غیر معمولی، نظر کو خیرہ کرنے والے ہنگامے نہیں ملتے جو ان کے نام کو ان کی زندگی میں اخباروں کا سرعنوان بنائیں اور مرنے کے بعد اس کو تاریخ کے سینے پر ثبت کریں۔ وہ ایک شریف متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ لکھنے پڑھنے اور تقریر کرنے میں ایک خاص امتیاز حاصل کیا۔ چند سال ملازمت کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اصلاح تمدن کی تحریک جاری کی اور اس کی اشاعت کے لیے ایک رسالہ 'عصر جدید' نکالا۔ چند کتابیں اور بہت سے مضامین لکھے۔ یوپی کونسل کے ممبر چنے گئے۔ وہاں اصلاح قانون سود کا مسودہ پیش کیا۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کی اور وہاں کے سیاسی، تمدنی اور اخلاقی حالات کا گہرا مطالعہ کیا اور ایک مصروف اور پاکباز زندگی بسر کرکے بیالیس سال کی مختصر عمر میں خدا کو پیارے ہوئے۔''[1]

انھوں نے دوسرے ادبا، شعرا اور دانشوروں کے مقابلے میں بہت کم عمر پائی لیکن اس قلیل مدت میں بھی جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ قابل ستائش ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں ''طالب علم کی زندگی کا کیا مقصد ہونا چاہیے (1896)'' [یہ ان کے تین اہم لکچرز کا مجموعہ ہے جو انھوں نے 'انجمن اخوان الصفا' مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں دیے تھے]، ''ابوالفضل علامی کے سوانح عمری (1902 بار سوم)' اور 'روزنامچۂ سیاحت (1912)' کا نام لیا جاسکتا ہے۔

20 مئی 1911 کو انھوں نے ممالک اسلامیہ اور زیارت مقامات مقدسہ کی غرض سے سفر کیا تھا۔ اس دوران انھوں نے عراق، ایران، جنوبی روس، قسطنطنیہ، شام، حجاز اور مصر کی سیاحت کی۔ وہاں کے باسیوں سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ رہا۔ وہ اس سفر سے دسمبر 1911 میں واپس ہوئے۔ سفر کے دوران ہی انھوں نے اپنے سفر کی روداد اور تجربات و مشاہدات کو سفرنامے کی صورت میں قلم بند کرلیا تھا جسے مناسب حذف و اضافے کے بعد 1912 میں شائع کیا۔ اس سفرنامے میں انھوں نے متعلقہ مقامات کے کوائف، لوگوں کے رہن سہن، ان کے اخلاق و عادات، شہروں اور ملکوں کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات بخوبی بیان کیے ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین کا 'روزنامچۂ سیاحت' اس اعتبار سے اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے کہ اس میں انھوں نے جن مقامات، شہروں اور ملکوں کا سفر کیا ہے وہاں کے سفری کوائف، جغرافیہ اور تاریخ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوگئی ہیں۔ انھوں نے اپنے عینی مشاہدات اور آنکھوں دیکھے حالات و مناظر کا بیان اس عمدگی اور صفائی کے ساتھ کیا ہے کہ وہ حالات و مناظر قارئین کے ذہن و دماغ کو مسحور کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ خبر کو اپنے سفرنامے کا جزو نہیں بناتے بلکہ نظر سے جن چیزوں کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے سفرنامے کا حصہ بناتے ہیں۔

اس سفرنامہ کو انھوں نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان 'عراق [عرب]' ہے جس میں انھوں نے عراق کے اہم مقامات، وہاں کے مقامات مقدسہ کی زیارت، وہاں کے لوگوں کے اخلاق و عادات

اور دیگر اہم چیزوں کا تذکرہ جامعیت کے ساتھ کیا ہے۔

حصۂ دوم کا عنوان 'سلطنت ایران میں ستر دن' ہے۔ اس حصے میں انھوں نے ایران کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کا تذکرہ بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔ چوں کہ ان کا زیادہ تر وقت تہران میں ہی گزرا اس لیے انھوں نے تہران کے مختلف مقامات، اعیان شہر سے ملاقات اور لوگوں کے طرز بود و باش کا تذکرہ کیا ہے۔

سفرنامے کی تیسری سرخی 'باکو سے بیرون دمشق تک' ہے۔ اس کے تحت خواجہ غلام الثقلین نے جنوبی روس، قسطنطنیہ، بیروت اور دمشق وغیرہ کے سفری کوائف بیان کیے ہیں۔

سفرنامے کا چوتھا حصہ 'بیرون دمشق سے بمبئی تک' ہے۔ اس میں حجاز کے مختلف شہروں خصوصاً مدینۂ منورہ، شام کے ساحلی علاقوں اور بندرگاہوں کے ساتھ مصر کے حالات بیان کیے ہیں۔ پانچواں حصہ خاتمے پر مشتمل ہے جو موجودہ کتاب میں شائع نہیں کیا گیا ہے اور اس کو جداگانہ شائع کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ خاتمہ میں اسلامی ممالک کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال اور آئندہ ان سے وابستہ توقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس حصے میں ان کا وہ فارسی لکچر بھی شامل ہے جو انھوں نے ایران میں دیا تھا اور وہاں کے مجلّے 'اسباب رفاہ و ترقی ایران' میں شائع ہوا تھا۔ سفرنامے کے آخری حصے کے متعلق وہ 'عذر و خطاب بہ ناظرین' میں یوں رقم طراز ہیں:

یہ سفرنامہ جس کو راقم کا روزنامچۂ سیاحت کہنا بہتر ہے معمولی سفرناموں سے کسی قدر مختلف ہے۔اس میں مختصر طور پر عمارات، شہروں اور مناظر کے حالات بھی درج ہیں جو راقم نے خود دیکھے ہیں۔ دوسروں کے سفرناموں سے حالات نقل نہیں کیے گئے، لیکن زیادہ تر لوگوں کی تمدنی اور اخلاقی حالت کو دکھایا ہے اور روزانہ جو خیالات و کیفیات راقم پر گزریں ان کو بے کم و کاست درج کر دیا ہے۔ بعض اصحاب جو سیاست یا پالٹکس یا دین میں شہرۂ کامل رکھتے ہیں ان سے کچھ گفتگو ہوئی اس کو کسی قدر مفصل درج کیا ہے۔

''حصۂ پنجم جس میں عام ریویو اور اسلامی ممالک کی عام حالت اور آئندہ کے توقعات پر ریویو تھا وہ میں نے اب تک نہیں لکھا۔ اس وقت کہ حالت نازک ہو رہی ہے، اس کی اشاعت یا لکھنا خوش آئند نہ تھا۔ مگر ان شاء اللہ دو تین ماہ کے بعد میں اس کو جداگانہ رسالے کی شکل میں شائع کروں گا۔''[2]

اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس میں صرف عینی مشاہدات کا ہی تذکرہ کیا ہے، دوسری تاریخ اور جغرافیے کی کتابوں یا کسی سفرنامے سے مطالب اخذ و اقتباس نہیں کیے ہیں۔ وہ جن مقامات و مناظر سے گزرتے ہیں ان کو مس کرکے سرسری نہیں گزرتے بلکہ ان سے اپنے دیدہ و دل کو لطافت بار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اشیا کی تہ میں جھانکتے ہیں اور ان مناظر و اشیا کے مشاہدے کے وقت ان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہیں، اسے سفرنامے کے بیانیے میں شامل کرتے ہیں۔ شہری اور دیہاتی فضاؤں، سرسبز و شاداب علاقوں اور حسین و جمیل مناظر سے خود بھی لطف اندوز ہوتے اور قارئین کو بھی لطافت بخشتے ہیں۔ وہ اپنے سفرنامے کے تعلق سے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''یہ سفرنامہ جس کو راقم کا روزنامچۂ سیاحت کہنا بہتر ہے معمولی سفرناموں سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس میں مختصر طور پر عمارات، شہروں اور مناظر کے حالات بھی درج ہیں جو راقم نے خود دیکھے ہیں۔ دوسروں کے سفرناموں سے حالات نقل نہیں کیے گئے، لیکن زیادہ تر لوگوں کی تمدنی اور اخلاقی حالت کو دکھایا ہے اور روزانہ جو خیالات و کیفیات راقم پر گزریں ان کو بے کم و کاست درج کر دیا ہے۔ بعض اصحاب جو سیاست یا پالٹکس یا دین میں شہرۂ کامل رکھتے ہیں ان سے کچھ گفتگو ہوئی اس کو کسی قدر مفصل درج کیا ہے۔''[3]

وہ اس سفر کی تیاری میں ایک مہینے پہلے سے ہی مصروف تھے۔ معاملات کو نپٹانے میں منہمک تھے اور ایک مہینے سے مقدمات لینا چھوڑ دیا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ 19 مئی کی شام کو سفر کا آغاز کریں، لیکن ان کے برادر عزیز خواجہ غلام السبطین لکھنؤ سے یکایک ان سے ملنے آ گئے، اس لیے انھوں نے شام کی روانگی ملتوی کر دی اور 20 مئی کو سفر پر روانہ ہوئے۔ پانی پت سے دہلی گئے۔ دہاں ان کا قیام خواجہ تصدق حسین کے یہاں رہا جو خفیفہ میں جج تھے۔ دہلی سے براہ کوٹہ بمبئی پہنچے۔ وہاں ضروری کاغذات درست کرائے اور 25 مئی کو جہاز پر سوار ہوئے۔ سمندر میں تلاطم تھا، اس لیے طبیعت بگڑ گئی۔ دوسرے مسافروں کا بھی یہی حال تھا۔ جہاز میں کئی مسافروں سے ان کی دوستی ہوگئی جس سے جہاز کا تکلیف دہ سفر بڑی آسانی سے طے ہوگیا۔

اس زمانے کے اکثر مسافروں نے بمبئی کے لوگوں اور ان کے رہن سہن کی مذمت کی ہے۔ چنانچہ خواجہ غلام الثقلین کا تجربہ بھی بمبئی کا بہت تلخ رہا۔ چوں کہ وہاں کے لہجے میں اکھڑپن ہے اس لیے وہاں کے لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ دوسری چیز جس کی سفرنامہ نویس نے شکایت کی ہے وہ وہاں کے لوگوں میں تحمل اور برداشت کی قوت کا نہ ہونا ہے، جس کی وجہ سے وہ بات بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ جب ان کا جہاز مسقط میں رکا تو وہاں کئی مسافر اترے اور دوسرے کئی مسافر جہاز پر سوار ہوئے۔ ان میں مسیحی مشنری کے افراد بھی تھے جو بظاہر مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ وہاں ان کو مسقط کے فرقۂ اباضیہ کی اطلاع ملی جن کو انھوں نے خوارج کا نام دیا ہے۔ اس فرقے کے بارے میں وہ اس انداز میں اطلاع فراہم کرتے ہیں:

''مسیحی مشنری سے میں نے اباضیہ (خوارج مسقط) کا حال دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ وہ دیگر مذاہب سے تعصب نہیں رکھتے اور نجاست غیر مسلم کے قائل نہیں۔ خاص مسقط میں شیعہ اور سنی بہت ہیں، مگر باہر ملک عمان میں فرقۂ اباضیہ کی آبادی زیادہ ہے۔ یہ لوگ مونچھوں کو بہت ناپاک جانتے ہیں۔ اور حج کو ایسا ضروری نہیں جانتے جیسا شیعہ اور سنی جانتے ہیں۔ ان کے ملا صرف ایک علم پڑھتے ہیں یعنی علم نحو۔ جو شخص نحو زیادہ جانتا ہے وہی بڑا عالم دین ہے۔ سیدنا علی ابن ابی طالب کو نہیں مانتے۔''[4]

ان کا جہاز بندر بوشہر (ایران) کے راستے بصرہ پہنچا۔ بصرہ میں انھوں نے مچھروں کی زیادتی کی شکایت کی ہے کہ یہاں کے مچھر معمولی نہیں ہیں۔ وہ اس طرح کاٹتے ہیں جیسے قینچی جسم میں داخل ہو رہی ہو۔ وہاں تقریباً سات دن وہ قرنطینہ میں رہے اور 8 جون کو قرنطینہ سے باہر ہوئے۔ بصرہ شہر نے ان کے دل و دماغ کو کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ وہاں وہ بازاروں میں گئے۔ لوگوں کے عام رواج اور طرز بود و باش کا مشاہدہ کیا، لیکن وہاں کی کسی چیز میں ان کو کوئی دل کشی یا ندرت نظر نہیں آئی۔ دکانداروں کی صفائی ستھرائی کی تعریف کی جو ہندوستان میں کم ہی نظر آتی ہے۔ وہ بصرہ کے بازار کی چہل پہل کا منظر یوں پیش کرتے ہیں:

''دوکانیں کچھ شاندار نہیں ہیں، لیکن ہر چیز کا بازار جداگانہ ہے۔ مال بکثرت ہے اور نہایت سلیقے سے لگایا گیا ہے۔ دوکاندار عموماً خوش پوشاک ہیں۔ دوکاندار نجم بہت

زیادہ ہیں اور شاید یہودی ان سے بھی زیادہ ہیں۔ ولایتی چیزوں کی قیمت ہندوستان سے کسی قدر کم ہوتی ہے۔"[5]

عراق میں انھوں نے بصرہ، کاظمین، سامرا، بغداد، کربلائے معلی، نجف اشرف اور کوفہ وغیرہ کی سیاحت اور مقامات مقدسہ کی زیارت کی۔ وہاں کی تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی اور مذہبی زندگی کا بغور جائزہ لیا۔ اس جائزے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان صرف کشور کشائی میں مصروف ہیں اور دجلہ، فرات اور شط العرب جیسے علاقوں پر ان کی کوئی خاص نظر نہیں ہے جس کی وجہ سے وہاں یہودیوں اور عیسائیوں کا بول بالا ہے۔ عراق کے افراد جوشیلے اور جنگجو ہیں۔ اہل شہر خلیق، ملنسار اور خوش پوشاک ہیں۔ وہاں کی آبادی کا تناسب یہ ہے کہ وہاں کے دیہاتی علاقوں کی تین چوتھائی آبادی شیعہ ہے جب کہ شہری علاقوں میں نصف سے کچھ کم شیعہ ہیں اور بقیہ اہل سنت ہیں۔ لیکن ان کے درمیان آپسی بھائی چارہ پایا جاتا ہے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کو تعصب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہاں کے لوگوں کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں جب کہ ہندوستان میں حالات بالکل برعکس ہیں۔ ملک مفلسی اور غریبی سے پاک ہے۔ زمین زرخیز اور پانی کی افراط ہے لیکن وہاں کے لوگ زراعت پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔

وہاں کی تعلیمی حالت ہندوستان کے مقابلے میں بہت خراب ہے۔ شہر کے لوگ تو پڑھے لکھے ہیں لیکن گاؤں میں تعلیم نہیں ہے۔ انھیں ایرانیوں اور ترکوں سے کوئی خاص شغف نہیں ہے، البتہ ہندوستانیوں کی قدر کرتے ہیں۔ ان کے اخلاق کی تعریف کرتے ہیں۔

عراق سے ایران کا سفر کیا۔ وہاں ان کا قیام ستر دن رہا۔ ان ایام میں انھوں نے وہاں کے اہم مقامات، ان کے تاریخی پس منظر، شاہ ایران کے حالات، شاہ کے متعلق وہاں کی رعایا کے خیالات، وہاں کے تعلیمی اداروں خصوصاً دارالفنون کی تعلیمی پالیسی، مقامات مقدسہ کے روح پرور مناظر، وہاں کے لوگوں کی طرز بود و باش، رسم و رواج اور اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ان کا زیادہ تر وقت تہران میں گزرا، اس لیے تہران کے سلسلے میں انھوں نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان میں سطحیت نہیں ہے۔ وہ وہاں کے لوگوں کے اندر پائے جانے والے عیبوں اور نقائص کے باوجود انھیں دنیا کی مختلف اقوام وملل سے ممتاز اور برتر گردانتے ہیں۔ انھوں نے ان کی زبان، لب ولہجہ، بات چیت کے انداز اور بعض نیک عادتوں کی تعریف کی ہے۔

ان کو سب سے زیادہ ایران کی بے روزگاری اور بے کاری نے متاثر کیا۔ انھوں نے تہران کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں ایسے بہتیرے نوجوانوں اور بوڑھوں کو دیکھا جن کے لباس اور پوشاک بہت عمدہ تھے لیکن وہ بے روزگاری کی وجہ سے مفلسی کا کرب جھیل رہے تھے۔ روزی روٹی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کی رعایا اکثر و بیشتر پریشاں حال رہتی ہے۔ وہ استرا کے راستے روس میں داخل ہوئے۔ اس سفرنامے میں انھوں نے روس کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، صنعتی اور ثقافتی امور سے بحث کی ہے اور وہاں کے لوگوں کے طرز زندگی، سیرت وشخصیت اور فکری رویے کی بھی عکاسی کی ہے۔

چوتھے حصے میں انھوں نے دمشق اور وہاں سے بمبئی تک کے حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ دمشق کی انھوں نے تعریف کی ہے۔ یہ وہی شہر ہے جس کو اہل شام عروس البلاد اور جنت الارض یا جنت فی الارض کہتے ہیں۔ شام کے عروس البلاد دمشق کی رونق اور وہاں کی فرحت بخش فضا کا تذکرہ انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"دمشق بہت بڑا شہر ہے اور رونق میں دلی سے کم نہیں۔ آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے اور بازار مسقف ہے۔ اس قدر بلند اور چوڑی اور شاندار چھت نہ بغداد میں ہے نہ تہران میں۔ مغرب کے وقت جب میں داخل ہوا تھا تو چراغ دکانوں پر روشن تھے۔ تاہم بازاروں میں تاریکی نظر آتی تھی۔ ٹریم جاری تھی۔"[6]

شام کے دوران قیام انھوں نے نہ صرف دمشق کی موجودہ صورت حال کا مشاہدہ کیا بلکہ اس کو تاریخ کے آئینے میں بھی دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سفرنامے میں مختلف مقامات پر وقت کے ساتھ تیزی سے بدلتے ہوئے سماج اور معاشرے نیز تہذیب و ثقافت کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ قدیم اخلاقی روایات کی پامالی اور قوم وملت خصوصاً نوجوانوں کے اس طرف سے بے خبر ہونے کو باعث تشویش قرار دیا ہے۔ ان کا یہ سفر اگرچہ ایک خاص مقصد کے تحت تھا لیکن انھوں نے اپنے سفرنامے کو اس کا تابع نہیں ہونے دیا۔ سفرنامے کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن و دماغ کے دریچے کھلے رکھے ہیں۔ سیاسی، تاریخی، جغرافیائی اور نظریاتی امور میں الجھنے کے بجائے صرف انھیں واقعات ومناظر کو سفرنامے کا حصہ بنایا ہے جن سے ان ممالک اور وہاں کی روزمرہ کی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں انھوں نے ہر اس چیز کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس نے ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا یا جوان کی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوئی۔

دمشق بہت بڑا شہر ہے اور رونق میں دلی سے کم نہیں، آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے اور بازار مسقف ہے، اس قدر بلند اور چوڑی اور شاندار چھت نہ بغداد میں ہے نہ تہران میں، مغرب کے وقت جب میں داخل ہوا تھا تو چراغ دکانوں پر روشن تھے، تاہم بازاروں میں تاریکی نظر آتی تھی، ٹریم جاری تھی،

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اس سفرنامے میں کئی خوبیاں موجود ہیں۔ اس کا بیانیہ سادہ، سلیس اور دل کش ہے۔ وہ اشیا و مناظر کے مشاہدے کے وقت جن احساسات سے گزرتے ہیں ان کو ہوبہو پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کو دسترس حاصل ہے۔ چوں کہ یہ سفرنامہ بیسویں صدی کے اوائل میں لکھا گیا ہے اس لیے کہیں کہیں زبان اور لب و لہجے سے قدامت جھلکتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ سفرنامہ مواد ومحتوی کے ساتھ فنی نقطۂ نظر سے بھی کئی خصوصیات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جزئیات نگاری اس کا اہم وصف ہے۔ سفرنامہ نویس ہر شے اور ہر منظر کو بڑی باریکی سے دیکھتے ہیں اور جزئیات سمیت اس کی مکمل تصویر پیش کردیتے ہیں۔ کہیں کہیں عربی ترکیبات اور فارسی اشعار کا برمحل استعمال بھی ملتا ہے جس نے سفرنامے کے حسن کو دوبالا کردیا ہے۔

حواشی

1 ایک مرد درویش، خواجہ غلام الثقلین، مطبع و سنہ ندارد، ریختہ ڈاٹ او آر جی، ص1

2 روزنامچہ سیاحت، خواجہ غلام الثقلین، مطبع شمس الانوار، میرٹھ، 1912ء، ص ب

3 روزنامچہ سیاحت، دیباچہ، ص1

4 روزنامچہ سیاحت، ص15

5 روزنامچہ سیاحت، ص29

6 روزنامچہ سیاحت، ص 366-67

■

Dr. Faizan Haider
Assistant Professor Dept. of
Urdu & Persian, C.M. College,
Quila Ghat, Darbhanga - 846004
Mob.:7388886628,
E-mail: faizanhaider40@gmail.com

ثاقب عمران

ادب اطفال کا تخلیقی عمل اور بچوں کی نفسیاتی کشمکش

(پوسٹ ماسٹر اور عیدگاہ کے حوالے سے)

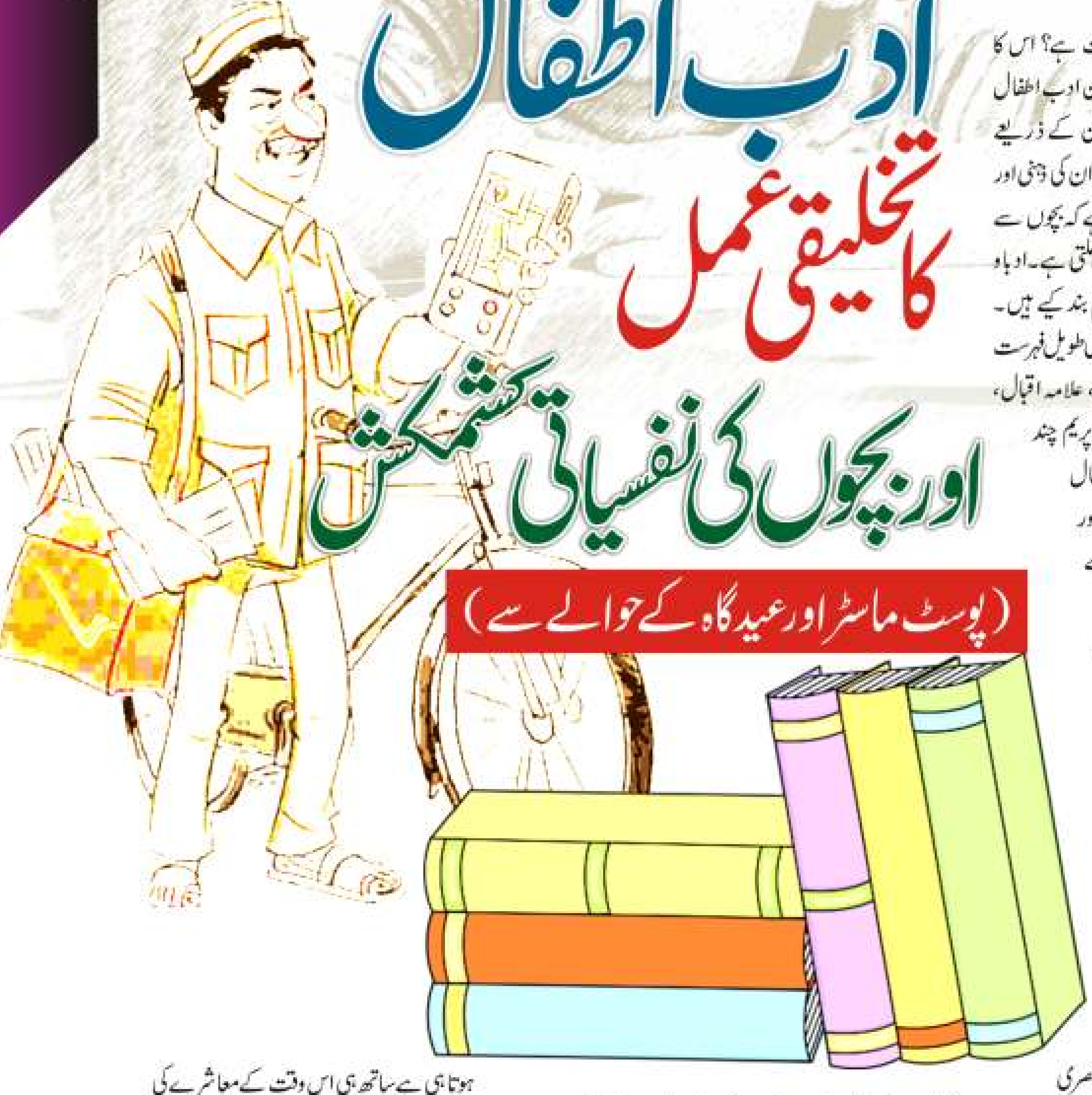

'بچوں کا ادب' لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ ماہرین ادب اطفال نصیحت آموز کہانیوں، شاعری اور مضامین کے ذریعے بچوں میں تعلیم کی طرف رغبت پیدا کرنا اور ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں سے متعلق رسائل و جرائد کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ ادبا و شعرا نے ان کے متعلق ہزاروں صفحات قلم بند کیے ہیں۔ اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور نظموں کی طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور، علامہ اقبال، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور منشی پریم چند وغیرہ جیسی اہم شخصیات نے بھی ادب اطفال پر نہ صرف قلم اٹھایا ہے بلکہ بچوں کی زندگی اور ان معصوموں کی نفسیات کو اتنی باریکی سے پیش کیا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے میں نے منشی پریم چند کا افسانہ 'عیدگاہ' اور رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانی 'پوسٹ ماسٹر' کا انتخاب کیا ہے۔ اس مقالے میں ان دونوں کہانیوں کا موازنہ کرنے کے ساتھ ساتھ، ان میں موجود بچوں کے کرداروں کا نفسیاتی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں لکھی جانے والی کہانیوں کی عصری معنویت کیا ہے؟ ہم اسے کیوں پڑھیں؟ کیا اس کی سماجی و تہذیبی صورت حال، عصری حسیت سے مطابقت رکھتی ہے؟ ان سوالوں کی روشنی میں ہم اس کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان دونوں کہانیوں کی پوری بُنت بچوں کی ذہنی کشمکش اور ان کے حرکات و سکنات کے اطراف ضرور گردش کرتی ہے لیکن ان کے مخاطب بڑی عمر کے لوگ ہیں جو ان کہانیوں کے مطالعے سے بچوں کے ذہن میں ہونے والی اتھل پتھل اور ان کی نفسیات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

درج بالا دونوں کہانیوں میں موجود بچوں کے کردار یتیم ہیں۔ ایک یتیم کی زندگی میں پیدا ہونے والے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو جس خوبصورتی کے ساتھ ان کہانیوں میں پیش کیا گیا ہے اس سے ہمیں ان بچوں کے جذبات اور خواہشات کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی اس وقت کے معاشرے کی صورت حال سے روبرو ہونے کا بھی موقع ملتا ہے۔ 'عید گاہ' میں حامد کا کردار اور 'پوسٹ ماسٹر' میں رتن کا کردار اپنی زندگی میں موجود خالی پن کو بھرنے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے 'دادی' اور 'پوسٹ ماسٹر' کا سہارا لیتے ہیں۔ حامد کی پوری دنیا اس کی دادی ہے اور رتن، گاؤں 'اولاپور' میں بحیثیت ڈاک بابو (پوسٹ ماسٹر) مقرر ہوئے کلکتہ سے آنے والے شخص میں اپنے کسی عزیز کو تلاش کرنے پر مجبور ہے

اور پوسٹ ماسٹر کو کبھی بابوجی اور کبھی 'دادا' یعنی بڑا بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ ان دونوں کہانیوں میں انسانی نفسیات کا وہ پہلو بھی شامل ہے، جس میں بیٹا اپنی ماں سے اور بیٹی اپنے باپ سے زیادہ قریب اور ہلی ملی ہوتی ہے۔ پریم چند نے دادی کی شکل میں ایک ماں کا پیار دینے والی شخصیت اور اس کی خوشی اور غم میں شریک ہونے والے ایک ساتھی کا کردار خلق کیا ہے، وہیں ٹیگور نے ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی کے لیے پوسٹ ماسٹر کے کردار کی رچنا کی ہے، جس کے سہارے رتن کی بے سہارا زندگی کو ایک عارضی سہارا تو مل ہی گیا لیکن رتن پوسٹ ماسٹر کی شخصیت میں اپنے باپ اور بڑے بھائی کو تلاش کرتی اور پوسٹ ماسٹر اور اس کے گھر کے دیگر افراد کے ساتھ اپنی باقی زندگی گزارنے کا خواب دیکھ کر اپنی ویران زندگی کو روشن کرنے کا کام کرتی ہے۔

حامد اور رتن کے کردار میں رتن عمر میں بڑی ہے۔ 'پوسٹ ماسٹر' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''پوسٹ ماسٹر کی تنخواہ بہت ہی تھوڑی تھی۔ انھیں اپنا کھانا آپ ہی پکانا پڑتا۔ اسی گاؤں کی ایک بارہ تیرہ سالہ مسکین یتیم لڑکی کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹا دیتی۔ اس کے بدلے اسے تھوڑا بہت کھانا مل جاتا۔ اس کا نام رتن تھا۔ اس کے شادی بیاہ کی کوئی امید نہ تھی۔''

یتیم ہونے کے سبب پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے رتن کا کہیں نہ کہیں کام کرنا فطری عمل ہے، جس کے عوض اسے تھوڑا بہت کھانا مل جاتا۔ اس چھوٹے سے اقتباس میں ٹیگور نے رتن کی شخصیت کو پوری طرح عیاں کر دیا ہے۔ اس عمل میں انھوں نے چپکے سے ایک جملے کا اضافہ اور کر دیا ہے کہ ''اس کے شادی بیاہ کی کوئی امید نہ تھی۔'' بارہ تیرہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے لیکن اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیگور نے جس معاشرے، عہد اور تہذیب کو پیش کیا ہے اس میں بارہ تیرہ برس میں لڑکیوں کی شادی ہو جاتی تھی۔ یہ عمل صحیح تھا یا غلط اس پر بحث کرنے کا موقع نہیں لیکن یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ عصر حاضر میں اسے 'بال ویواہ' سے منسوب کیا جاتا ہے اور ایسی شادی کرنا قانوناً جرم ہے۔ اگر غور کریں کہ جس معاشرے میں 'بال ویواہ' کا تصور عام تھا وہاں لڑکیاں ہوش سنبھالتے ہی ذہنی طور پر کہیں نہ کہیں اس کے لیے تیار ہونے لگتی تھیں کہ انھیں زندگی کے اس موڑ سے آگے بڑھنا ہے جس کے لیے نہ صرف ان کا جسم بلکہ ان کا ذہن بھی تیار نہیں ہوتا تھا۔ ویسے شادی کا ذکر اس جانب بھی ذہن کو متوجہ کرتا ہے کہ لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ سیانا پن سنجیدگی کی جانب اشارہ کرتا ہے اور سنجیدگی مشکلوں سے لڑنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ یہاں تو رتن کا کردار یتیم بھی ہے۔ یتیم ہونا ہی اپنے آپ میں ایک ایسا سانحہ ہے جو چھوٹے اور معصوم ذہن کو بھی بڑوں کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ زندگی کے ہر فیصلے میں غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو رتن کے کردار اور حامد کے کردار کو ایک ساتھ کھڑا کرنے کا کام کرتی ہے۔ دونوں اپنی اپنی زندگی میں ہونے والے تغیرات سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں اپنے سے متصل کرداروں کے متعلق نہ صرف سوچتے ہیں بلکہ ان کا خیال رکھنے کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں۔

افسانہ 'عیدگاہ' کی ابتدا، پریم چند نے صبح عید کی منظر نگاری سے کی ہے اور ساتھ ہی اس کی تیاری میں لوگوں کو مصروف بھی دکھایا ہے۔ بطور خاص بچوں کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں:

''لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا وہ بھی دوپہر تک، کسی نے وہ بھی نہیں لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آگئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔''

پریم چند نے درج بالا اقتباس میں عید کو لے کر بچوں کی خوشی کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ آخر اس خوشی کی وجہ کیا ہے؟ اور انھیں عیدگاہ جانے کی جلدی کیوں ہے؟ ''اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ آخر عیدگاہ کیوں نہیں چلتے'' اس جانب اشارہ کر رہا ہے کہ بچے اپنے گھر میں موجود بڑے لوگوں سے بار بار یہ سوال کر رہے ہیں۔ عید اپنے ساتھ خوشیاں لے کر آتی ہے اور اس کی برکتیں نازل ہوتی ہیں، ان باتوں سے بچوں کو کیا سروکار، دراصل بچوں کے ذہن میں کہیں نہ کہیں گذشتہ عید کا نقشہ موجود ہے جو انھیں بار بار یہ یاد دلاتا ہے کہ عیدگاہ کے باہر میلہ بھی لگتا ہے جس میں رنگ برنگی مٹھائیاں، جھولے اور بچوں کی تفریح کے لیے متعدد چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسی کشش ہے جو انھیں عیدگاہ کی جانب جلدی جانے پر اکساتی رہتی ہے۔ بطور خاص عید کے دن لگنے والے میلے کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ بچوں کو عید کے دن عیدی کی شکل میں کچھ روپے پیسے مل جاتے ہیں جن کو خرچ کرنے کے لیے وہ آزاد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیب میں موجود قارون کا خزانہ خرچ کرنے اور اپنی پسندیدہ مٹھائیاں کھانے وغیرہ کے لیے انھیں عیدگاہ کی طرف جانے کی جلدی رہتی ہے:

''انھیں [بچوں کو] گھر کی فکروں سے کیا واسطہ، سویوں کے لیے گھر میں دودھ، شکر یا میوے ہیں یا نہیں اس کی انھیں کیا فکر، ان کی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں، دوستوں کو دکھاتے ہیں اور رکھ لیتے ہیں۔ انھیں دو چار پیسوں میں دنیا کی نعمتیں لائیں گے۔ مٹھائیاں اور کھلونے اور بگل، خدا جانے کیا کیا۔''

انھیں بچوں میں ایک بچہ حامد بھی ہے جس کی دادی نے اسے تین پیسے دیے ہیں تا کہ وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح اپنی خواہشات پوری کر سکے۔ عید اور عیدی کا معاملہ آج بھی ویسے ہی قائم ہے جیسا کہ افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔ بچوں کو ملنے والی عیدی اور ان کی زیادہ سے

ان دونوں کہانیوں میں انسانی نفسیات کا وہ پہلو بھی شامل ہے، جس میں بیٹا اپنی ماں سے اور بیٹی اپنے باپ سے زیادہ قریب اور ہلی ملی ہوتی ہے۔ پریم چند نے دادی کی شکل میں ایک ماں کا پیار دینے والی شخصیت اور اس کی خوشی اور غم میں شریک ہونے والے ایک ساتھی کا کردار خلق کیا ہے، وہیں ٹیگور نے ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی کے لیے پوسٹ ماسٹر کے کردار کی رچنا کی ہے، جس کے سہارے رتن کی بے سہارا زندگی کو ایک عارضی سہارا تو مل ہی گیا۔

زیادہ عیدی پانے کی خواہش اور ان کے چہرے پر موجود خوشی کے تاثرات قابل دید ہوتے ہیں۔ ایک طرف عید کی خوشی اور اس کے متعلقات ہیں تو دوسری جانب رتن کی پوسٹ ماسٹر کے دل میں اپنی اہمیت بڑھانے کی کوشش تا کہ وہ اپنی گھر واپسی کے وقت رتن کو بھی اپنے ساتھ لے جاسکے۔ پوسٹ ماسٹر نے اسے ایک کام کرنے والی بے سہارا لڑکی سے زیادہ سمجھا نہیں، اس کے برعکس رتن پوسٹ ماسٹر کو اپنا بڑا بھائی تسلیم کر چکی ہے اور بحیثیت چھوٹی بہن اپنے ناز نخرے بھی اٹھوانا چاہتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''گھر کے اندر ٹمٹماتے ہوئے دیے کی مدھم روشنی میں بیٹھے ہوئے پوسٹ ماسٹر بابو پکارتے 'رتن'۔ رتن اسی پکار کے انتظار میں دروازے پر بیٹھی رہتی۔ مگر ایک ہی آواز میں گھر کے اندر داخل نہیں ہوتی۔''

"کبھی کبھی شام کو اسی پھوس کی بڑی کوٹھری کے ایک کونے میں آفس کی چوکی پر بیٹھے پوسٹ ماسٹر اپنے گھر کی باتیں اس سے کہا کرتے۔ چھوٹے بھائی، ماں اور بڑی بہن کی باتیں۔ گھر سے دور تنہائی میں جن کی یاد دل کو ستایا کرتی، ان کی باتیں۔ دل میں جو باتیں اکثر آیا کرتیں اور جنھیں نیل کوٹھی کے عملہ والوں کے سامنے کہنا کسی حالت میں بھی مناسب نہ تھا۔ وہ باتیں ایک اَن پڑھ چھوٹی لڑکی سے کہہ جانے میں انہیں کوئی جھجک محسوس نہ ہوتی۔ آخر ایسا ہوا کہ لڑکی بات چیت میں ان کے گھر والوں کا ذکر ماں، بہن اور بھائی کہہ کر پرانے جان پہچان والوں کی طرح کرتی۔ یہاں تک کہ لڑکی نے اپنے ننھے دل میں ان لوگوں کی خیالی تصویر بھی بنا لی۔"

رتن کا دروازے پر بیٹھ کر پوسٹ ماسٹر کی آواز کا انتظار کرنا اور ایک ہی آواز میں گھر میں داخل نہ ہونا، رتن کے ذہن میں پوسٹ ماسٹر کو اپنا عزیز تسلیم کر لینے کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ وہ پوسٹ ماسٹر کی نوکر نہیں ہے کہ پہلی پکار پر ہی گھر میں دوڑی آتی۔ لیکن رتن کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ پوسٹ ماسٹر کے دل میں اتنی جگہ بنانے کے لیے کہ وہ اسے اپنے گھر لے جائے، اسے بہت محنت کرنی پڑے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رتن پکار کے انتظار میں دروازے پر بیٹھی رہتی۔ رتن کی شخصیت کی تکمیل کسی گھر کی متقاضی ہے اور غالباً اس کی پوری زندگی میں پوسٹ ماسٹر پہلا شخص ہے جس کے وہ اتنے قریب ہوئی تاکہ اس کی ماں اور بہنوں کے ساتھ وہ بھی اپنی زندگی گزار سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی شخصیت کی تکمیل کی خاطر وہ پوسٹ ماسٹر کی خدمت میں دن رات لگی رہتی ہے۔ لیکن ایسا کیا ہوا کہ رتن کے دل میں اس طرح کے خیالات پیدا ہوئے؟ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ ٹیگور اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کبھی کبھی شام کو اسی پھوس کی بڑی کوٹھری کے ایک کونے میں آفس کی چوکی پر بیٹھے پوسٹ ماسٹر اپنے گھر کی باتیں اس سے کہا کرتے۔ چھوٹے بھائی، ماں اور بڑی بہن کی باتیں۔ گھر سے دور تنہائی میں جن کی یاد دل کو ستایا کرتی، ان کی باتیں۔ دل میں جو باتیں اکثر آیا کرتیں اور جنھیں نیل کوٹھی کے عملہ والوں کے سامنے کہنا کسی حالت میں بھی مناسب نہ تھا۔ وہ باتیں ایک اَن پڑھ چھوٹی لڑکی سے کہہ جانے میں انھیں کوئی جھجک محسوس نہ ہوتی۔ آخر ایسا ہوا کہ لڑکی بات چیت میں ان کے گھر والوں کا ذکر ماں، بہن اور بھائی کہہ کر پرانے جان پہچان والوں کی طرح کرتی۔ یہاں تک کہ لڑکی نے اپنے ننھے سے دل میں ان لوگوں کی خیالی تصویر بھی بنالی۔"

یتیم اور بے سہارا لڑکی سے ماں، بہن اور بھائی کے متعلق باتیں کرنا، یتیم کے دل میں کسی اپنے کے ہونے کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رتن کے دل میں وہ تمام خواہشات عود کر آتی ہیں جو اس کے ننھے دل میں کہیں نہ کہیں دفن ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک دن پوسٹ ماسٹر کے تبادلے کا وقت آ جاتا ہے اور وہ گھر جانے کی تیاری کرنے لگتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"آخر ایک ہفتہ بعد شام کو اس [رتن] کی پکار ہوئی۔ آرزو بھرے دل کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی۔ پوچھا "دادا پکار رہے تھے۔" پوسٹ ماسٹر نے کہا "رتن میں کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔" "کہاں جاؤ گے دادا؟" "گھر جا رہا ہوں" "کب لوٹو گے؟" پوسٹ ماسٹر: "اب کبھی یہاں نہ آؤں گا۔" رتن خاموش رہی۔...... کچھ دیر بعد رتن روٹی پکانے کے لیے دھیرے دھیرے چوکے میں گئی۔ ہر روز کی طرح جلدی جلدی نہ پکا سکی۔ شاید طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ پوسٹ ماسٹر کھا چکے تو لڑکی نے ان سے پوچھا "دادا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلوگے؟" پوسٹ ماسٹر ہنس کر بولے "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔"

پوسٹ ماسٹر کا رتن سے گھر جانے کے متعلق گفتگو کرنا اور اس کا گھر میں کھانا پکانے کے عمل کو دھیرے دھیرے کرنا رتن کے ذہن میں اٹھنے والے اس طوفان کی جانب اشارہ کر رہا ہے جس کے لیے وہ پوسٹ ماسٹر کے کھانا کھا لینے تک کا انتظار کرتی ہے۔ اس ذہنی اور نفسیاتی کشمکش میں کہ آیا اس کا 'دادا' اس کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائے گا یا وہ اسے اس کے حال پر ہی چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔ رتن کے لیے یہ اتنا اہم سوال تھا جس پر اس کی باقی زندگی کا انحصار تھا۔ رتن کو اس بات کی امید بھی تھی کہ ڈاک بابو اس کو اپنے ساتھ اپنے گھر ضرور لے جائے گا، لیکن کہیں نہ کہیں اس کے دل میں ساتھ نہ لے جانے کا ڈر بھی تھا۔ اس خوف اور امید کی کیفیت میں مبتلا رتن کسی طرح خود کو اس بات کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ پوسٹ ماسٹر سے سوال پوچھ سکے کہ کیا وہ اسے بھی اپنے ساتھ اپنی ماں، بہن اور بھائی کے پاس لے جائے گا۔ اس سوال کے جواب میں پوسٹ ماسٹر کا ہنس دینا، اُس کے جواب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ غور کیا جائے تو رتن پریشان حالی کا استعارہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کے برعکس حامد کا کردار خوشی کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے جو اپنی باتوں کے ذریعے اپنے اعمال کو صحیح ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جس کے سبب نہ صرف اسے ذہنی و قلبی اطمینان ملتا ہے بلکہ اس کی ذہانت کی دھاک بھی اس کے ہم عمروں پر بیٹھ جاتی ہے۔ عیدگاہ سے نکل کر تمام بچے جھولے اور مٹھائیوں کی دکانوں کی طرف تیزی سے بڑھ جاتے ہیں:

"محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں، نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنا خزانہ نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں کہ اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا ہے۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔"

حامد ذرا سی دیر کے مزے کے لیے اپنے خزانے کو خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل اسے بھی پیسوں کی اہمیت اور اپنی مجبوری کا احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دادی نے یہ تین پیسے گرچہ میلے میں خرچ کرنے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے دیے تھے لیکن حامد ان پیسوں کو کسی ایسے کام کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ حاصل ہو۔ محسن کے باپ کے بلانے پر نہ جانا عزت نفس کا معاملہ ہے جیسا کہ پریم چند نے ذکر بھی کر دیا ہے۔ حساس طبیعت کے لوگ آج بھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ حامد جھولے پر چکر کھانے سے اجتناب برتتا ہے۔ پریم چند

نے حامد کے کردار میں بیک وقت ایک بچے اور ایک ذی شعور شخص دونوں کرداروں کو جمع کر دیا ہے۔ کھلونے کی دکان پر بھی اسی طرح کا معاملہ پیش آتا ہے۔ دوسرے بچے کھلونوں کی خرید فروخت میں مصروف ہیں اور حامد دور کھڑا یہ سوچ رہا ہے کہ یہ کھلونے دو دو پیسے کے ہیں اور ابھی ذرا سی چوک ہوئی اور یہ گر کر ٹوٹ گئے۔ اس طرح کے بہلاوے وہ خود کو بھی دے رہا ہے تاکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھ سکے اور وہ خود کو کھلونا خریدنے سے باز رکھ سکے:

دونوں افسانوں میں موجود کردار آج کے دور میں بھی ہمیں ہر طرف چلتے پھرتے نظر آجائیں گے۔ ہندوستانی سماج میں لڑکیوں کو مجبور اور کسی کے اوپر منحصر سمجھا جاتا ہے جن کی خواہشیں تو ہوتی ہیں لیکن انھیں پورا کرنے کے لیے بھی وہ کسی نہ کسی کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک لڑکا اپنی مرضی کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ لڑکا ہی دوسروں کی زندگیوں میں خوشی بھرنے اور ذمے داریاں اٹھانے کا کام کرتا ہے۔

''[کھلونے] کہیں ہاتھ سے گر پڑیں تو چور چور ہو جائیں، ذرا سا پانی پڑے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔''

لیکن ایک بچے کی نفسیات اسے مجبور کرتی ہے:

''لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لیے لپکتا ہے۔''

کھلونوں کی خرید و فروخت کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آتا ہے۔ حامد اپنے نفس پر قابو کرتے ہوئے وہاں سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد لوہے کے سامانوں کی دکانیں تھیں ''لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔'' لیکن حامد کی نظر لوہے کی دکان میں رکھے دست پناہ پر پڑتی ہے جس کی وجہ سے وہ رک جاتا ہے۔ اسے اپنی دادی کی انگلیاں یاد آتی ہیں جو توے سے روٹیاں اتارتے وقت اکثر جل جایا کرتی تھیں۔ اس وقت حامد دادی کی خوشی میں اپنی خوشی تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

حامد کی دکان دار سے ہونے والی گفتگو کچھ اس طرح ہے:

''اس نے دکاندار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا: یہ دست پناہ بیچو گے؟ دوکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ میں کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا کہ وہ تمھارے کام کا نہیں ہے۔

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی، اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔''

''تو بتلاتے کیوں نہیں، کے پیسے کا دو گے؟''

''چھ پیسے لگیں گے۔''

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ ''تین پیسے لو گے؟'' اور آگے بڑھ گیا کہ دکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے۔''

دوکاندار سے ہونے والا مکالمہ اور حامد کا قیمت کم کرانے کی کوشش پورے ماحول کو فطری بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پورا منظر قاری کی نظروں کے سامنے پھر گیا ہو۔ حامد کا چھ پیسے کی قیمت والے دست پناہ کے لیے تین پیسے دینے کی پیشکش کرنا، دست پناہ پانے کی چاہ کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس سے پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ حامد کے پاس کل تین پیسے ہی تھے۔ دست پناہ کی قیمت سن کر اس کا دل اس لیے بیٹھ جاتا ہے کیوں کہ اس کو اپنی دادی کی انگلیاں پھر توے سے جلتی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دکاندار کو آدھی قیمت کی پیشکش کرنے کے لیے خود کو آمادہ کر پاتا ہے۔ خرید و فروخت کے اس عمل کے بعد ایک مرحلہ ابھی حامد کو اور طے کرنا ہے وہ ہے دوستوں کے سامنے خود کو شرمندہ ہونے سے بچانا اور کچھ ایسا کرنا تاکہ اس کے دوست اس کا مذاق اڑانے کے بجائے اسے عقل مند تسلیم کر لیں۔ حامد اور اس کے دوستوں کے درمیان ہونے والے مکالموں کو دیکھیے:

''محسن نے ہنستے ہوئے کہا'' یہ دست پناہ ساتھ لایا ہے۔ احمق اس سے کیا کرے گا؟ حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا'' ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بیچارے کی۔''

محمود: ''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے۔''

حامد: ''کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمھاری ناک پکڑوں۔ ایک چمٹا جما دوں تو تمھارے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمھارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ''

حامد کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس کے دوست اس کے دست پناہ خریدنے پر نہ صرف سوال جواب کریں گے بلکہ اس کا مذاق بھی اڑائیں گے۔ انسانی سرشت میں شامل ہے کہ وہ اپنی چیزوں کی تعریف اور دوسروں کی چیزوں میں عیب تلاش کرتا ہے۔ حامد اپنے دست پناہ کی اتنی تعریف صرف اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کے دوست اس کا مذاق نہ اڑائیں اور وہ اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس ایک دست پناہ میں مختلف کھلونوں کی خوبیاں گنوانے اور اسے مختلف دیگر کاموں میں استعمال کرنے کے متعلق نہ صرف بتاتا ہے بلکہ اسے کر کے بھی دکھاتا ہے تاکہ اس کے دست پناہ کے خریدنے کا جواز بھی پیدا ہو جائے اور اس کی دھاک بھی دوستوں پر جم جائے۔

دونوں افسانوں میں موجود کردار آج کے دور میں بھی ہمیں ہر طرف چلتے پھرتے نظر آجائیں گے۔ ہندوستانی سماج میں لڑکیوں کو مجبور اور کسی کے اوپر منحصر سمجھا جاتا ہے جن کی خواہشیں تو ہوتی ہیں لیکن انھیں پورا کرنے کے لیے بھی وہ کسی نہ کسی کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک لڑکا اپنی مرضی کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ لڑکا ہی دوسروں کی زندگیوں میں خوشی بھرنے اور ذمے داریاں اٹھانے کا کام کرتا ہے۔ رتن لڑکی ہونے کی وجہ سے مجبور ہے اور محتاج ہے کہ ڈاک بابو اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں یا نہ لے جائیں اور حامد لڑکا ہونے کی وجہ سے مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اپنی خوشیوں کا سودا کرتا ہے تاکہ وہ اپنی دادی کی تکلیفوں کو کم کر سکے۔

ان دونوں افسانوں میں ایک بات اور غور کرنے کی ہے کہ 'پوسٹ ماسٹر' میں کہیں نہ کہیں غم کی زیریں لہریں پورے افسانے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور رتن اس غم واندوہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش میں برسرِ پیکار نظر آتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی۔ اس کے برعکس 'عیدگاہ' میں حامد کا کردار خوشی و کامرانی کا پیکر نظر آتا ہے، جو اپنے دل میں اُٹھنے والی ننھی ننھی خواہشات کا گلا ضرور دباتا ہے لیکن اپنے فیصلے اور عمل کے ذریعے اپنی دادی کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

■

Dr. Saquib Imran
Guest Faculty, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9891423216

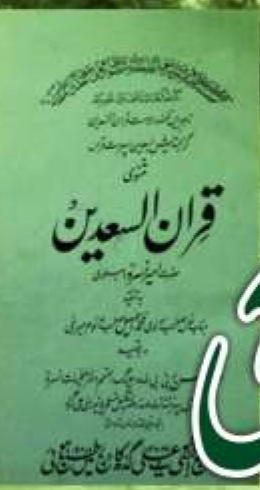

مشائخِ دہلی کی فارسی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

غلام اختر

تاریخ ہند میں دہلی کا مقام جہاں سیاسی نقطۂ نظر سے بلند ہے کہ اسے طویل مدت تک دارالسلطنت ہونے کا شرف ملا جو اسے اب تک حاصل ہے، وہیں اسے صنعت وحرفت، علم وحکمت اور زہد وتصوف کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے آماجگاہ خاص وعام ہونے کا بھی حق حاصل ہے۔ حضرت سید معین الدین چشتی اجمیری کا یہ احسان کہیے کہ انھوں نے ہندستان آمد کے بعد خود اجمیر شریف میں مقیم رہتے ہوئے دہلی میں اپنے تربیت یافتہ مرید وخلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی شکل میں علم وعرفان، زہد وورع اور خلق خدا کے ساتھ رواداری کا ایسا چشمہ جاری فرمایا، جس سے نہ صرف یہ کہ خلق خدا نے اپنی اخلاقی، روحانی اور علمی پیاس بجھائی بلکہ اس سے ایسی ایسی نہریں نکلیں جو پورے خطہ ہند میں گھوم گھوم کر لوگوں کو حسب مقتضی سیراب کیا۔ دہلی میں اگرچہ خواجہ قطب کے علاوہ اور بزرگوں کا بھی پتہ چلتا ہے تاہم خلق خدا کی بے لوث دستگیری کا جو سلسلہ ان کے اور ان کے خلفا نیز خلفا کے خلفا کے ہاتھوں جاری ہوا وہ صرف انھیں کا حصہ تھا، ان میں ایک سے ایک صاحب کشف وکرامت اور مختلف علوم وفنون کے ماہر افراد بھی پیدا ہوئے جن سے نہ صرف یہ کہ اہل تصوف کی بزمیں روشن ہوئیں بلکہ شعر وادب اور موسیقی کی محفلیں بھی آباد ہوئیں، یہاں تک کہ صنعت وحرفت میں بھی وہ اپنی مثال آپ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ فنون لطیفہ میں ستار اور طبلے کی ایجاد اسی سلسلے کے ایک درویش صفت شخص نے کیا جسے دنیا امیر خسرو کے نام سے جانتی ہے۔ دہلی میں شاعری کا آغاز، خواہ وہ فارسی ہو یا اردو انھیں خانقاہوں سے ہوا جہاں مذکورہ اوصاف والے قدآور سخنور صوفی کی حیثیت سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان سے چونکہ خلق خدا براہ راست منسلک تھی اس لیے بادشاہ وقت کو بھی ان بارگاہوں کی خاک چھاننی پڑتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کے بادشاہوں میں بھی کچھ اشخاص ایسے گزرے ہیں جو فی نفسہ متدین اور خداترس تھے اس لیے وہ اہل اللہ سے قریب رہتے تھے اور گاہے بہ گاہے ان کی خدمت میں نذریں بھی پیش کیا کرتے تھے۔ چونکہ اہل خانقاہ توکل علی اللہ اور قناعت کے خوگر ہوتے تھے اس لیے وہ جو بھی کرتے تھے بے لوث اور خدمت خلق کے جذبے کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنے افکار ونظریات کا اظہار نیز علم وحکمت کے اسرار ورموز کا افشا کسی دنیوی منفعت کے لیے نہیں کرتے تھے، اس لیے ہمیں خانقاہی شاعری میں زیادہ تر عشق حقیقی، خدمت خلق، اخلاق حسنہ واعمال خیر کی ترغیب اور خدا ورسول کے بعد مرشد کی تابعداری پر مشتمل مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہم یہاں پر ذیل میں دہلی کے ان مشائخ کی فارسی شاعری کا مطالعہ کریں گے جن کے دیوان تک اب تک ہماری رسائی ہو سکی ہے۔

خانوادۂ چشت کے مشہور بزرگ سیدنا خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ہیں۔ ان کی طرف ایک فارسی دیوان بنام 'دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ' منسوب ہے، جس کا سلیس اردو ترجمہ راقم نے کیا ہے۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد جب میں نے اس کتاب کا ذکر فارسی کے چند دانشوروں کے سامنے کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی شاعر ہی نہیں تھے، بہر حال میں نے تحقیق جاری رکھی ہے، اب تک اردو کے بڑے محقق حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر نذیر احمد (علی گڑھ) کی تحریروں سے اس بات کی قطعی وضاحت ہو چکی ہے کہ خواجہ قطب الدین شاعر نہیں تھے۔ اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کی سب سے بنیادی دلیل یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے ملفوظات میں فرمایا کہ سلسلۂ چشتیہ کے ہمارے مشائخ میں کوئی شاعر نہ تھا، حضرت کے اسی وضاحتی ارشاد نے محققین کو 'دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ' کی تحقیق پر مجبور کیا اور بالآخر یہ ثابت ہوا کہ وہ بھی ان کا نہیں ہے بلکہ معین مسکین فراہی کا ہے جو صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، انھوں نے تفسیر وسیر پر اچھا خاصا لکھا ہے ان کی معارج النبوۃ سیرت پر عمدہ اور معتبر کتاب ہے، وہ اپنی نثری تصنیفات میں جا بجا اپنے فارسی اشعار کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو گیا کہ 'دیوان معین' دراصل انھیں کا ہے۔ مذکورہ محققین کی تحقیقات سے 'دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ' کے بارے میں بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت کا نہیں ہے بلکہ حضرت کی طرف منسوب ہے، کیونکہ حضرت شاعر نہیں تھے یہ اور بات ہے کہ سماع کے دوران فارسی شعر سنا کرتے تھے یہاں تک کہ شیخ احمد جام کا ایک شعر سننے کے بعد حضرت کے دل میں پنہاں عشق حقیقی کی چنگاری بھڑک اٹھی جس کی تاب نہ لا کر ان پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ نماز کے اوقات کے علاوہ تین دن تک بیہوش رہے اور جب ہوش آتا تو مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے۔ شیخ احمد جام کا وہ شعر یہ ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

ترجمہ: تسلیم ورضا کی تلوار سے مارے گئے لوگ ہر لحہ غیب سے ایک نئی زندگی پاتے ہیں۔ یعنی مرتے ہیں،

جیتے ہیں۔ پھر مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد نے 'دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکی' سے درجنوں اشعار نقل کر کے ان میں استعمال شدہ الفاظ، تراکیب اور ہیئت سے یہ ثابت کیا کہ خواجہ قطب کے عہد کی فارسی شاعری دیوان میں مستعمل طرز و اسلوب کی نہیں ہوتی تھی ساتھ ہی اس کے بیشمار اشعار ایسے ہیں جن سے حافظ شیرازی کی اثر پذیری ظاہر ہوتی ہے جبکہ حافظ شیرازی کا عہد خواجہ قطب کے بعد کا ہے۔ پروفیسر مذکور نے تو یہاں تک ثابت کیا ہے کہ دیوان مذکور کی شاعری بارہویں صدی ہجری کی ہے، اسی زمانے میں کسی قطب الدین نامی شخص نے حافظ شیرازی کا دیوان سامنے رکھ کر شاعری کی ہے، دیوان قطب میں موجود اشعار کے معانی ومفاہیم نیز تراکیب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے حافظ سے کافی استفادہ کیا ہے لیکن وہ حافظ کے شاعرانہ درجۂ کمال تک نہیں پہنچ سکا ہے بلکہ وہ اپنے کمزور اسلوب سے اس سے بہت نیچے نظر آتا ہے، شاعری میں صوفیانہ مضامین ضرور ہیں لیکن جس درجے کی مضمون آفرینی اور معنی خیزی عرفان وتصوف کے راہرو شاعر کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے وہ دیوان قطب میں عنقا ہے، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ قطب جیسے بحرِ معرفت کے غواص اگر شاعری کرتے تو فارسی کی صوفیانہ شاعری میں بڑے بڑے قدآور شعرا سے بہت آگے نظر آتے۔

ہم نے یہاں پر دیوان خواجہ قطب کے حوالے سے اتنی وضاحت اس لیے کردی ہے کہ چونکہ مشائخ دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا رتبہ بہت ہی عالی ہے، دہلی میں سلسلہ چشتیہ کے تمام مشائخ کے شیخ ہیں اگر ہم ان کی شاعری کو اپنے مضمون کا حصہ نہ بنائیں تو یہ نہ صرف یہ کہ علمی خیانت ہوگی بلکہ اپنی حرماں نصیبی بھی ہوگی، چونکہ وہ شاعر نہیں تھے اس لیے ان کی طرف منسوب دیوان سے اشعار اخذ کر کے لکھنا تحقیقی دیانت کے خلاف ہوگا، البتہ جب اس دیوان کے اصل شاعر کا پتہ چل جائے گا تب یہ سوال ہوگا کہ وہ مشائخ دہلی سے تھے یا نہیں۔ یہاں پر ہم دہلی کے عظیم شاعر طوطی ہند حضرت امیر خسرو دہلوی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت خواجہ میر درد کی فارسی شاعری پر گفتگو کریں گے۔

امیر خسرو دہلوی

حضرت امیر خسرو (پیدائش 651ھ مطابق 1253 وفات 17 رشوال 725ھ مطابق 25دسمبر 1325) گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے، جن کا نام فارسی شاعری میں بڑے ادب سے لیا جاتا ہے، ساتھ ہی اردو ادب میں انھیں بانیان اردو کی پہلی صف میں شمار کیا جاتا ہے،

آپ حضرت نظام الدین اولیا کے تربیت یافتہ ہیں، آپ کی تحریروں میں عرفان وتصوف، سماجی رواداری، اخوت ومحبت، حب الوطنی اور ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی جھلک صاف طور سے دکھائی دیتی ہے۔ عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ اصحاب تصوف کو فقط خانقاہ اور پیری مریدی سے ہی مطلب ہوتا ہے، وہ دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہوتے ہیں، ان کو علم وادب اور سماج وسیاست سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن جب ہم خانقاہ نظامیہ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں عوام کی مذکورہ غلط فہمی کے پیچھے اہل علم کی وہ تساہلی کارفرما دکھائی دیتی ہے جس کے سبب انھوں نے ہمارے مشائخ کے علمی وادبی، سیاسی وسماجی اور رفاہی کاموں پر پڑے پردے کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی اور وہ جلسوں میں ان کی سنی سنائی کرامات بیان کر کے عوام سے داد وصول کر کے یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کا قرض چکا دیا، جبکہ خانقاہ نظامیہ کی علمی، ادبی، فنی اور سماجی خدمات کے اثرات ملک کے طول وعرض میں عیاں طور پہ دیکھے جا سکتے ہیں، حضرت امیر خسرو خانقاہ نظامیہ ہی کی روحانی خدمت کا نتیجہ ہیں، جن کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ خانقاہ وہ جگہ ہوا کرتی تھی جہاں نہ صرف یہ کہ مذہبی، سماجی اور اخلاقی تربیت ہوتی تھی بلکہ وہاں ایسے افراد پیدا کیے جاتے تھے جو زبان وادب، شعروسخن، تحقیق وتدوین، تنقید وتنقیح اور فنون لطیفہ کے ایسے ماہر ہوتے تھے جو خود راہ حق پہ ہوتے ہوئے سماج کو بھی حق کی راہ دکھاتے تھے۔

خسرو چونکہ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ سے وابستہ تھے اس لیے ان کی شاعری میں مذہبی رنگ واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے، ساتھ ہی ان کی رسائی شاہی درباروں تک بھی تھی جس کے نتیجے میں انھوں نے بادشاہوں اور شہزادوں کی مدح میں چند قصائد بھی کہے۔ ان کی شاہی دربار تک رسائی کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد بزرگوار امیر سیف الدین محمود شمسی بادشاہ شمس الدین التمش کے دربار میں بلند رتبے پر فائز تھے۔ امیر خسرو کی شاعری میں جس قدر عرفان وتصوف اور عشق مجازی کے ضمن میں عشق حقیقی کا بیان ہے اگر ان تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے تو ایک مستقل کتاب ہو جائے گی۔ ہم یہاں پر اس مختصر مقالے میں ان کی غزلوں سے چند اشعار پیش کر کے ان کی فارسی شاعری کی ہلکی جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں، چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں، ملاحظہ ہوں!

ابر می بارد من می شوم ازیار جدا
چون کنم دل به چنین روز زدلدار جدا
ابروباران ومن ویار ستاده بوداع
من جدا گریه کنان ابر جدا یار جدا
سبزه نوخیز وهوا خرم وبستان سرسبز
بلبل روی سیه مانده زگلزار جدا
ای مرا در تهه هر موی ززلفت بندی
چه کنی بند زبندم همه یك بار جدا

ترجمہ: جس دن میں اور میرا دل یار سے جدا ہوتا ہے بادل خوب برستا ہے۔ پھر تو بادل، بارش، میں اور یار الوداع کہتے ہوئے اٹھتے ہیں اور میں ایک طرف روتا ہوں، بادل دوسری طرف روتا ہے اور یار کسی اور طرف روتا ہے۔ گلشن سرسبز ہو، نئی نئی گھاس اُگی ہو اور ہوا خوش وخرم چلتی ہو پھر بھی گلزار سے جدا ہوتے وقت بلبل روسیاہ ہو جاتا ہے۔ میرے محبوب اتم نے مجھے اپنی زلف کے ایک ایک بال کی تہہ میں باندھ رکھا ہے، جب ایک بار مجھے جدا کر دو گے تو میری بند کے بجائے کیا باندھو گے؟

امیر خسرو کے درج بالا فارسی غزلیہ اشعار کے مضامین دیکھیے اور عش عش کیجیے۔ خسرو کی غزل میں عشق مجازی کی تہہ میں عشق حقیقی کی جلوہ سامانی پنہاں ہے۔ وہ اپنے محبوب سے جدا ہو کر رہنا نہیں چاہتے، جدائی کی صورت میں اپنی اشک باری کا ذکر کرتے ہوئے اس منظر کی عکاسی کرتے ہیں جس میں گلشن کے سرسبز ہونے کے باوجود محبوب کی جدائی کے سبب ان کے عشق کا بلبل افسردہ وروسیاہ ہے۔ خسرو اپنے محبوب سے یہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ جب تم نے مجھے اپنی زلفوں سے باندھ لیا تو اچانک مجھ سے کیوں جدا ہوتے ہو؟ ظاہر ہے اشعار میں مذکور محبوب ان کے مرشد ہی ہیں، چونکہ اہل اللہ سے عشق، محبت الٰہی کی دلیل ہے اس لیے اس عشق مجازی کو عشق حقیقی تک متعدی مانا جا سکتا ہے۔ خسرو کی غزل سے چند شعر اور دیکھیں!

مست ترا به هیچ مئے احتیاج نیست
رنج مرا زهیچ طبیبی علاج نیست
ای مه مشو مقابل چشمم که بارخش
مارا به هیچ وجه بتو احتیاج نیست
بامن مگو حکایت جمشید وافسرش
خاك درسرای مغان کم زتاج نیست

باتوست عرض حاجت خود چند می کنی
اوواقف ست حاجت چندین لجاج نیست

ترجمہ: تیرے مست کو کسی شراب کی حاجت نہیں، میرے مرض کو کسی طبیب کے علاج کی ضرورت نہیں۔ اے چاند! تو میری نظروں کے سامنے مت آ کہ مجھے اس (یار) کے چہرے کے مقابلے میں تیری کوئی ضرورت نہیں۔ لوگو! میرے سامنے جمشید اور اس کے وزرا کے قصے مت بیان کرو کہ میرے یار کے در کی مٹی تاج سے کچھ کم نہیں۔ اپنی حاجت دوست کے سامنے پیش کرو کہ وہ واقف ہے کہ اس میں کوئی عداوت یا کینہ نہیں ہے۔)

درج بالا اشعار میں خسرو نے محبوب کی بارگاہ میں خودسپردگی ظاہر کرتے ہوئے محبوب کے علاوہ ہر چیز سے پہلو تہی اختیار کی ہے، محبوب کی نگاہ التفات کے علاوہ ہر جام سے بے نیازی کا اظہار کیا ہے اور اپنا سب کچھ محبوب کو قرار دیتے ہوئے محبوب کی گرد راہ کو تاج سر سے بہتر قرار دیا ہے، ان کے عاشقانہ مزاج کو فقط محبوب کا ذکر وفکر ہی راس آتا ہے اس لیے انھیں بادشاہ جمشید اور اس کے وزرا کی حکایات سننا گوارہ نہیں، جبکہ انھوں نے خود بادشاہوں وشہزادوں کی مدح میں قصائد کہے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو قصیدہ نگاری کو فقط منہ کا ذائقہ بدلنے یا شاہی مراعات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ورنہ ان کی روح کی غذا تو عشق حقیقی ہے جس کے بیان سے پورا دیوان بھرا پڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ دیوان کامل میں غزلیات کے مقابلے میں قصائد بہت ہی کم ہیں، ان میں بھی حمد باری تعالی اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی کلام ہیں۔ خسرو اپنی زندگی میں شاہی درباروں سے بھی منسلک رہے یہاں تک کہ انھیں اور ان کے رفیق ہمدم حسن سجزی دہلوی کو سلطان محمد خان شہید ابن بادشاہ غیاث الدین بلبن اپنے ساتھ ملتان لے گیا تھا اور خسرو کو مصحف بردار جبکہ حسن کو دوات بردار کے عہدے پر فائز کیا تھا جہاں دونوں صاحب پانچ سال رہ کر دہلی واپس آئے تھے۔ شاہی دربار میں اتنی قدر ومنزلت کے باوجود خسرو کے اندر خانقاہی ومذہبی رنگ شاہی رنگ پر غالب رہا اور انھوں نے اپنی شاعری میں قصیدہ حسب ضرورت کہہ کر اپنی طبیعت کے مطابق غزلوں میں اپنے روحانی جذبات کا خوب اظہار کیا۔ قصائد کے باب میں خسرو نے حمد باری اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چند کلام کے علاوہ سلطان کیقباد، شہزادہ چھجو، سلطان جلال الدین، سلطان علاء الدین اور سلطان محمد شاہ کی مدح میں قصیدے کہے ہیں، جبکہ ایک کلام وعظ ونصیحت پر مشتمل کہا، ساتھ ہی ترکیب بند کلام میں شیخ نظام کی مدح میں ایک کلام کہا اور ایک ترکیب بند نعت بھی کہی ہے، البتہ نعت کا طرز واسلوب علیحدہ ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں

مرزا مظہر جان جاناں خانوادۂ چشت کے ایسے چشم وچراغ ہیں جنھوں نے قلت شعر گوئی کے باوجود اردو زبان وادب میں وہ مقام حاصل کیا ہے جو قابل ستائش وتقلید ہے۔ اردو ادب میں ان کی وہ خدمت جس کی وجہ سے انھیں میر وسودا جیسے شعرا کی صف میں شمار کیا جاتا ہے، وہ

یہ ہے کہ انھوں نے زبان کی اصلاح کی اور انداز سخن کے نت نئے اسالیب ایجاد کیے جن کی بنیاد پر زبان سلیس اور شستہ ہوگئی۔ ان کا تعلق بیجاپور کے شریف ترین گھرانے سے تھا، ان کے والد عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے 1111ھ میں جب عالمگیر نے دکن پر فوج کشی کر رکھی تھی اسی اثنا میں ان کے والد نے عالمگیر کی نوکری چھوڑ دی اور دہلی کی طرف روانہ ہوگئے، جب وہ مالوہ علاقے کے کالا باغ میں پہنچے تو مظہر جان جاناں کی پیدائش ہوئی۔ اس زمانے میں جب امرا کے گھر بچے کی پیدائش ہوتی تو آئین سلطنت کے مطابق بچے کا نام خود بادشاہ طے کرتا تھا یا گھر والوں کے منتخب کردہ نام پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا تھا، اس رسمی آئین کے سبب بادشاہ وامرا کے درمیان تعلقات میں خوش گواری آتی اور امرا کے اندر جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ مرزا کا نام یوں رکھا گیا کہ بادشاہ عالمگیر نے کہا کہ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے، چونکہ ان کے والد کا نام مرزا جان تھا اس لیے ان کا نام جان جاناں رکھ دیا، اگرچہ ان کے والد نے ان کا نام شمس الدین رکھا تھا لیکن یہ نام بادشاہ کے رکھے ہوئے نام کے مقابلے میں مشہور نہ ہوسکا، مرزا نے اپنا تخلص 'مظہر' خود ہی رکھا، اس طرح وہ دنیائے ادب میں مرزا مظہر جان جاناں سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد کی طرح ان کے دادا بھی عالمگیر کے دربار میں منصب پر تھے جبکہ دادی عالمگیر کے وزیر اسد خاں کی خالہ زاد بہن اور پردادی اکبر بادشاہ کی بیٹی تھیں، اس طرح ان کا گھرانہ شاہی گھرانہ تھا۔ سولہ سال کی عمر تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا، تب سے تیس سال کی عمر تک خانقاہوں سے منسلک رہ کر تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے۔ انھیں مدرسوں اور خانقاہوں کی تعلیم وتربیت نے ہی تصوف کی طرف مائل کیا، جس کا اثر ان کی شاعری میں بھی جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے، ان کے یہاں بھی عشق مجازی کے ضمن میں عشق حقیقی کا بیان ملتا ہے۔ ہم ذیل میں ان کی غزلوں سے چند اشعار پیش کرتے ہیں جو ان کی ماہرانہ واستادانہ صلاحیت پر غماز ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں!

آبرو پیش کسی نیست کف خاک مرا
شعلہ هم از نظر انداخته خاشاك مرا
قبلهٔ مردم حرمان زده امروز منم
میکند باس پرستش دل غمناك مرا
یك سر طُرّه بدست من ویك در کف او
شانه ا م زلف بود سینهٔ صد چاك مرا
چون شود بزم سخن گرم توان دید بچشم
از چنین شمع صفت شعلهٔ ادراك مرا

ترجمہ: میری آبرو کسی کے سامنے مشت خاک کے برابر بھی نہیں، نیز لوگ میرے تنکوں پر شعلہ نظر بھی ڈالتے ہیں۔ آج میں نے حرماں نصیبوں کے قبلہ کو ٹھکرا دیا ہے کہ ناامیدی میرے غمزدہ دل کی پرستش کرتی ہے۔ طرے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا اس کے ہاتھ میں، میرا شانہ زلف ہوگیا (یعنی غم واندوہ بڑھ گیا) اور سینہ سیکڑوں بار چاک ہوا۔ جب بزم سخن گرم ہوتی ہے تو آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے کہ میرا شعلۂ ادراک شمع کے مانند کیسے بھڑکتا ہے۔)

درج بالا اشعار میں مرزا مظہر جان جاناں نے عشق میں اپنی بیچارگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی عملی بے مائیگی کو اشارے کنائے میں بیان کیا ہے، جس کے لیے انھوں نے ایسی لطیف مضمون بندی کا سہارا لیا ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں کے ستائے ہوئے ہیں اور اسی دست وگریبانی میں ان کا دل پارہ پارہ ہوا ہے، جبکہ شعر کے اندر ان کی تعلی کا رنگ بھی ہے کہ وہ حرماں نصیبوں کے قبلے کو ٹھکرا کر اپنے غمزدہ دل کو ناامیدی کا قبلہ بنا بیٹھے ہیں۔ آگے یہ بھی کہتے ہیں کہ جب بزم سخن گرم ہوتی ہے تو شاعر کا ادراک شمع کے مانند شعلہ زن ہوتا ہے، مظہر جان جاناں کے اس طرز بیان کو جتنی داد دیجیے کم ہے۔ دراصل وہ اپنے اشعار بالا میں شکوہ، تعلی اور درد جیسے مختلف مضامین کو پیش کرتے ہیں لیکن انداز بیان اتنا اشاراتی ہے کہ اول مرحلے میں ذہن کا تبادر وہاں تک نہیں ہوتا ہے اس اعتبار سے مظہر جان جاناں کو بلا تامل استاد سخن کہا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ان کی ایک غزل سے چند شعر اور دیکھیے!

تا نفس باقیست چون نی نالہ سامانیم ما
زندہ تا هستیم همچون شمع گریانیم ما
کردہ اند این شوخ چشمان نالۂ مارا خراب
سر بصحرا دادۂ شهر غزالانیم ما
بر نمی داریم دست از دامن دیوانگی
همچو گل لب تشنۂ خون گریبانیم ما
بررخ وچشم تر ما در مبند ای باغبان
بهر گل ابریم وبهر سبزہ بارانیم ما
نیستم آگاہ مظهر از فن آوارگی
همچو موی اهل ماتم نو پریشانیم ما

ترجمہ: جب تک سانس باقی ہے،ہم بانسری کی طرح (نالہ سامانی) دردوسوز کی صدائیں بلند کرتے رہیں گے، ہم جب تک زندہ ہیں شمع کی مانند پگھل پگھل کر روتے رہیں گے۔ان شوخ چشموں نے ہماری آہ وزاری کو برباد کردیا ہے، ہمارے شہر غزالاں (ہرنیوں کے شہر) نے ہمارا سر صحرا میں ڈال دیا ہے۔ہم دیوانگی کے دامن سے ہاتھ نہیں جھاڑتے، کہ لب گل کے مانند ہمارے خون گریبان کا پیاسا ہے۔اے باغبان! ہمارے چہرہ وتر نگاہ پر دروازہ مت بند کر، کہ ہماری پلکیں گل کے لیے اور آنسو سبزہ کے لیے ہیں۔اے مظہر! میں آوارگی کے فن سے آگاہ نہیں، اس لیے اہل ماتم کی آہ وزاری کے مانند پریشان نہیں۔)

حضرت مظہر جان جاناں کے درج بالا اشعار پڑھنے کے بعد ان کے عشقیہ بیان میں مضمون آفرینی کی جودت کمال کا ادراک ہوتا ہے، وہ عشق میں اس طرح راسخ نظر آتے ہیں کہ ان کی ہر سانس عشق کی ضرب سے ہونے والے درد کا اظہار کرتی ہے،وہ محبوب کی شوخ چشمی کی شکایت یوں کرتے ہیں کہ اس نے ان کے شہر غزالاں کو صحرا میں ڈال کر ویران کردیا ہے، وہ دیوانگی کے دامن سے ہاتھ نہیں کھینچتے اس لیے کہ ان کا لب گل کی طرح خون گریبان کا پیاسا ہے(یعنی سرخ ہوا چاہتی ہے)اور وہ باغباں سے یوں فریاد کناں ہیں کہ اے باغباں! میرے پژمردہ چہرے اور اشک برساتی آنکھ پر اپنا دروازہ بند نہ کر، کیونکہ میرا بادل (آنکھ) گل کے واسطے اور میری بارش (آنسو) سبزہ کے واسطے ہے۔اخیر میں خود سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے مظہر! میں آوارگی کے فن سے آگاہ نہیں ہوں اور نہ ہی اہل ماتم کی طرح پریشان ہوں۔مظہر جان جاناں کی شاعری میں جہاں شکوۂ زمانہ ہے وہیں عشق کے لازمہ عاجزی، آہ وزاری، دردوسوز اور عشق میں دل کی ویرانی بھی ہے، ان کے اشعار پڑھتے جایئے اور ان کے مجازی عشق میں موجود وارفتگی کی کیفیت کا ملاحظہ کرتے جایئے! جو دراصل ان کے دل میں پوشیدہ عشق حقیقی کا آئینہ دار ہے۔رنج والم، دردوکسک اور عشق میں کامل رسوخ ان کے کلام کے لازمی اجزا ہیں جن کا احساس ہر قاری کو ہوتا ہے۔

خواجہ میر درد

اردو زبان وادب میں حضرت خواجہ میر درد کی شناخت ہی ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے بن چکی ہے، اس لیے ان کے مشائخ شعرا میں شمار کیے جانے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، تاہم ان کے حالات زندگی کی مختصر تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

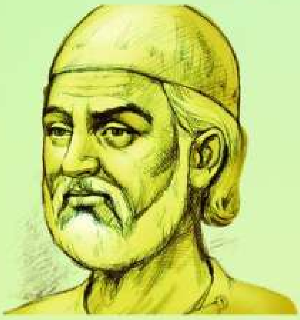

خواجہ میر درد (پیدائش 1133ھ۔ وفات 24 رصفر 1199ھ مطابق 1720) کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا، آپ نجیب الطرفین سید تھے جن کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت بہاء الدین نقش بند سے اور ماں کی طرف سے غوث اعظم سید شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے،ان کے نانا میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خان نے ان کا نام 'خواجہ میر' رکھا تھا، درد نے خود اپنا تخلص 'درد' اپنے والد خواجہ محمد ناصر کے تخلص 'عندلیب' کی مناسبت سے رکھا، جبکہ ان کے والد نے اپنا تخلص 'عندلیب' اپنے پیر حضرت سعداللہ گلشن کی مناسبت سے رکھا اور سعداللہ گلشن نے بھی اپنا تخلص 'گلشن' اپنے پیر 'عبدالاحد گل وحدت' کی مناسبت سے رکھا تھا۔درد نے اپنا تخلص رکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے اپنے مشائخ کے تخلص کا خوبصورت بیان اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

درد از بس عندلیب گلشن وحدت شدست
جلوۂ روی گل او را غزل خوان می کند

ترجمہ: درد تو بس حضرت عبدالاحد گل وحدت کے مرید حضرت سعداللہ گلشن، بلکہ سعداللہ گلشن کے مرید خواجہ محمد ناصر المتخلص بہ عندلیب سے نسبت رکھتا ہے، اسی کے رخ گل کا جلوہ غزل خوانی کرتا ہے۔

درد نے درج بالا شعر کے مصرع اول کو اس طرح باندھا ہے کہ ان کے، ان کے والد، ان کے والد کے پیر اور ان کے والد کے پیر کے پیر کے تخلص کا ذکر علی الترتیب درد، عندلیب، گلشن اور وحدت ہوگیا اور ساتھ ہی سارے تخلص کی ترتیب سے ایک خوبصورت معنی بھی پیدا ہوگیا ہے جس کا براہ راست معرفت وتصوف سے تعلق ہے، اسی سے درد کی شاعرانہ مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔درد جس دور میں پیدا ہوئے، وہ فتنہ وفساد کا زمانہ تھا، سلطنت مغلیہ روبہ زوال تھی، دہلی میں ایسی کس مپرسی کا عالم تھا کہ لوگ دہلی چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، ایسے عالم میں درد اپنے استقلال اور خدا پر توکل کے سبب دہلی میں ہی جمے رہے، اہل مملکت اور صاحب ثروت وامارت سے ان کی بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ ایک بار انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر کو بہت سخت جواب دیا تھا، ان کے والد بھی صاحب کشف بزرگ تھے جو اپنے زمانے میں برپا شیعہ سنی اختلافات اور بیجا تکرار سے بیحد پریشان تھے، انھوں نے خلق خدا میں بیجا اختلافات کے رفع کے لیے خدا کی بارگاہ میں التجائیں کیں یہاں تک کہ ایک مرتبہ وہ اپنے حجرے میں سات دن اور سات رات بغیر کھائے پیئے عالم سکوت میں بند رہے، اس دوران میر درد دروازے پر سر رکھے روتے رہے، جب ان کے والد مکرم عالم سکوت سے باہر آئے تو درد کو دروازے پر سر رکھے روتا دیکھا چنانچہ انھوں نے میر درد کو گلے لگایا اور فرمایا کہ اے فرزند مبارک ہو کہ حضرت علی اور امام حسن کی روحوں کا نزول ہوا تھا، انھوں نے مجھے مخلوق کے درمیان اختلاف کو رفع کرنے کے لیے طریق محمدیہ کی اشاعت کا حکم دیا ہے، دوران گفتگو میں نے حضرت امام حسن سے عرض کیا تھا کہ اس تبلیغی سلسلے کا نام 'طریق حسن' رکھوں، لیکن انھوں نے مجھے منع فرمایا اور کہا کہ ہم سب غلام محمد ہیں اور ہمارا سلوک سلوک محمد ہے اس لیے اس کا نام 'طریق محمدیہ' رکھو۔ چنانچہ درد کے والد کی محنت سے لوگ جوق در جوق طریق محمدیہ میں داخل ہونے لگے اور وہ محمدی کہلائے، جن میں سب سے پہلا محمدی خود درد ہیں۔طریق محمدیہ میں قرآن وسنت کی پیروی پر زور دیا جاتا تھا، اس تبلیغی مشن سے لوگوں کے درمیان اختلافات ختم ہونے لگے، درد اس طریق سے لوگوں کو تصوف اور سلوک کی اس منزل تک پہونچانا چاہتے تھے جہاں پہنچ کر سالک کے دل میں خدا کی یاد کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔درد خود ساقی جام وحدت تھے جس کا اثر ان کی شاعری میں جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔درد بہت کم عمر سے ہی تصنیفی کام انجام دینے لگے تھے، چنانچہ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں اعتکاف کی حالت میں 'رسالہ اسرار الصلوٰۃ' لکھا، انتیس سال کی عمر میں 'واردات درد' نامی رسالہ لکھا، پھر اس کی شرح 'علم الکتاب' کے نام سے کی جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔اس کے علاوہ 'نالۂ درد'، 'آہ سرد'، 'درد دل'، 'سوز دل' اور 'شمع محفل'

جیسے معرکۃ الآرا رسالے تحریر کیے، جو دنیائے تصوف میں بڑے ادب کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس مختصر سے سوانحی خاکے کے بعد اب ہم ذیل میں درد کی غزلوں سے چند اشعار پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان کی شاعرانہ مہارت کی ہلکی معرفت ہو سکے۔ ان کے دیوان کی پہلی غزل کے دو ابتدائی شعر دیکھیں!

زبس فیض سخن روشن کند هرجا بیانم را
سزدبرسر دهم جاشمع سان عضو زبانم را
چنان درمن تجلی کرده حسن بی نشان او
هما عنقا شود بیشک خورد گر استخوانم را

ترجمہ: بس فیض سخن میرے بیان کو روشن کرتا ہے، نیز وہ سر پر شمع کے مانند زیب دیتا ہے جہاں میں عضو زبان دیتا ہوں۔ مجھ میں اس کے بے نشان حسن نے ایسی تجلی کی ہے کہ اگر ہُما میری ہڈی کھالے تو وہ بیشک عنقا ہو جائے۔

درد اپنے مذکورہ اشعار میں اپنے فیض سخن کا بیان جا بجا کرنا چاہتے ہیں، جس کے لیے وہ اپنے جسم کے ہر عضو کو زبان عطا کر دینا چاہتے ہیں، جیسا کہ اس ذات بے نشان کے حسن لازوال نے ان کی ذات میں جلوہ افروزی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تجلی محبوب کی وجہ سے میں اس قدر بابرکت ہو گیا ہوں کہ اگر میری ہڈیاں ہما کھالے تو وہ عنقا ہو جائے۔ درد کو اپنے بافیض عشق میں جو کامل رسوخ حاصل ہو چکا تھا اس کا بیان وہ خود مذکورہ مجازی پیرائے میں کرتے ہیں، جسے تحدیث نعمت بھی کہا جا سکتا ہے نیز ان کا عشق بھی ان سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ محبوب کے ذکر میں وہ اپنے جسم کے سارے اعضا کو زبان بنا کر عشق کا خراج پیش کریں، درد کو یہ افکار ان کے والد کے مشن 'طریق محمدیہ' کی پیروی و اشاعت میں ملے ہیں۔ آگے یوں کہتے ہیں۔

جوش زبادۂ توحید بمیخانۂ ما
بحر داردبگره قطرۂ پیمانه را
بیخودی پرده کشای حرم دل باشد
بسته احرام رهش لغزش مستانۂ ما

ترجمہ: میرے میخانے میں توحید کے جام سے جوش اٹھتا ہے، میرے پیمانے کا قطرہ روئے زمین پر سمندر کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیخودی دل کے حرم سے پردہ ہٹائے دیتی ہے، میری مستانہ لغزش (لڑکھڑاہٹ) اس کی راہ میں احرام باندھے ہوئے ہے۔

درد جام عشق و عرفان کے ایسے میخوار ہیں کہ ان کے میخانے میں نہ صرف یہ کہ جام وحدت چھلک رہا ہے بلکہ ان کے پیمانۂ عشق کا قطرہ اپنے اندر سمندر کو سموئے ہوئے ہے، عشق میں ان کی بیخودی نے دل کا پردہ اٹھا دیا ہے، جبکہ ان کے مستانہ قدموں کی لڑکھڑاہٹ ایسی ہے جو

درد کو اپنے بافیض عشق میں جو کامل رسوخ حاصل ہو چکا تھا اس کا بیان وہ خود مذکورہ مجازی پیرائے میں کرتے ہیں، جسے تحدیث نعمت بھی کہا جاسکتا ہے نیز ان کا عشق بھی ان سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ محبوب کے ذکر میں وہ اپنے جسم کے سارے اعضا کو زبان بناکر عشق کا خراج پیش کریں، درد کو یہ افکار ان کے والد کے مشن 'طریق محمدیہ' کی پیروی و اشاعت میں ملے ہیں۔

محبوب کا احرام باندھے ہوئے ہے۔ درد نے اپنے شعروں کو اپنے پوشیدہ درد کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے جو اندرون دل جوش زن ہے، آگے کے چند شعر اور دیکھیں!

رنگ هستی بهار جان وتن ست
چمن آرای باغ ما ومن ست
ازحدوث وقدم مپرس اینجا
نوشدن نیز عادت کهن ست

ترجمہ: ہستی کا رنگ، جان و بدن کی بہار ہے، جس نے میرے اور ہمارے چمن کو سجا رکھا ہے۔ یہاں جدت و قدامت کے بارے میں مت پوچھ کہ نیا ہونا بھی پرانی عادت ہے۔

درد نے درج بالا شعروں میں وجود کی ماہیت کی تعبیر باغ و بہار سے کی ہے نیز اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ حدوث و قدم کا معنی اس جہان میں فقط اتنا ہے کہ پرانی شے کو نئی ہونے کی عادت ہو۔ یہ مضامین درد کی دنیا سے بے رغبتی پر دال ہیں۔ اب اخیر میں درد کے چند شعر اور دیکھیں!

تا گره از زلف وا آن رشک خوبان می کند
خاطر جمع جهانی را پریشان می کند
شورش عشق تو انجاہر سحر با جیب صبح
پنجۂ خورشید را دست وگریبان می کند
موج حسن کیست اینجا سلسله جنبان اشک
چشمه های چشم من امروز طوفان می کند

ترجمہ: وہ رشک خوباں جب تک اپنی زلف کی گرہ کھولے رکھتا ہے ایک جہان کی دل جمعی کو پریشان کر دیتا ہے۔ یہاں تیرے عشق کا شور و ہنگامہ ہر روز وقت سحر میں صبح کے گریبان کے ساتھ پنجۂ خورشید کو دست گریباں کر دیتا ہے۔ یہاں موج حسن کیا ہے؟ آنسوؤں کی زنجیر ہلانے والا ہے، آج میری آنکھوں کے چشمے پھوٹ کر طوفان برپا کیے ہوئے ہیں۔

درد نے اپنے درج بالا شعروں میں عشق مجازی کے ضمن میں عشق حقیقی کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ محبوب کی زلفوں کی گرہ کشائی سے دل پر ہونے والے حملے کا بڑے خوبصورت اسلوب میں بیان کیا ہے، عشق کی شورش کا عالم یہ ہے کہ وہ ہر صبح خورشید سے دست و گریباں ہوتی ہے، ساتھ ہی محبوب کے دیے ہوئے درد عشق نے آنکھوں سے اشکوں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور آنکھوں سے نکلنے والے چشمۂ اشک نے طوفان برپا کر رکھا ہے۔ درد کے مذکورہ شعروں میں چھپے مضامین سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ درد کا تخلص ان کی ذات و جذبات پر سو فی صد صادق آتا تھا۔

حواشی

1 دیوان کامل، امیر خسرو، با اہتمام م درویش، انتشارات جاویدان، تہران۔ 1343 شمسی
2 دیوان حسن سجزی دہلوی، با اہتمام۔ مسعود علی محوی (علیگ) مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدرآباد، دکن۔ 1352ھ
3 دیوان فارسی حضرت خواجہ میر درد، حسب فرمائش مولانا سید نور الحسن، مطبع انصاری، دہلی۔ 1309ھ
4 دو باقی ز درد ساقی، مرتب راجہ نرسنگھ راج بہادر خلف اکبر راجہ صاحب، سردار پریس، حویلی قدیم، حیدرآباد، دکن 1342م 1332ف
5 دیوان مظہر جان جاناں، بفرمائش شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین۔ کشمیری بازار، لاہور، مطبع کانسی رام لاہور۔ س ن
6 تاریخ فیروز شاہی، مولانا ضیاء الدین برنی، (مقدمہ) سید عزیز الدین حسین، رضا لائبریری، رامپور۔ 1391 شمسی مطابق 1213
7 آب حیات، محمد حسین آزاد، کتابی دنیا، دہلی۔ 2008
8 تاریخ ادب اردو، (جلد دوم حصہ اول) جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2011
9 بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبد الرحمان، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی 2011
10 خسرو شناسی، ظ انصاری، ابو الفیض سحر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2010
11 امیر خسرو شخصیت افکار و خیالات فکر و فن، شاہد مختار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2009
12 فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر محمد ریاض و ڈاکٹر صدیق شبلی، بسمہ کتاب گھر، دہلی 2011

■

Ghulam Akhtar
Vill. Begampatti,P.O. Khaje Chand Chhapra
Dist. Vaishali-844112 (Bihar)
Mobile No.9958602553
Emil ID gavaishalwi@gmail.com

نظیر اکبرآبادی کی نظمیہ شاعری

ندیم احمد

نظیر اکبرآبادی کا اصل نام سید ولی محمد تھا وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ ان کا بچپن دہلی میں ہی گزرا۔ لیکن اٹھارہ سال کی عمر میں ہجرت کر کے آگرہ چلے گئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

وہ اردو اور فارسی پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں میر اور سودا کا طوطی بول رہا تھا اور شعرا دہلوی و لکھنوی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کے برعکس نظیر نے اسی زمانے میں اپنے زور قلم سے ایک نئے شاعرانہ انداز کی طرح ڈالی۔ جس کے وہ خود ہی خالق وموجد ہیں۔ نظیر کے یہاں مقامی رنگوں کی بھرمار ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر شاعری کی اسے ایک نظیر ہی بنادیا۔ اردو وفارسی کا عالم وشاعر ہونے کے باوجود انھوں نے ہندوستانی الفاظ کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں ہندوستانی رنگ اور مقامی زبان کی ایسی حسین آمیزش ہے کہ وہ بلبل کا چہکنا اور ہدہد کا ٹرٹرانا سننے کے لیے کبھی ایران وعرب نہیں جاتے بلکہ ہندوستان میں رہ کر کوئل کی کوک کو خود بھی سنتے ہیں اور قاری کو بھی سناتے ہیں۔

نظیر فطری اور حقیقی طور پر مکمل ہندوستانی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں صد فیصد ہندوستانی لفظیات نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں کسی مستند فلسفے پر شاید ہی کوئی شعر ملے لیکن کسی کو بھی یہ تسلیم کر لینے میں کوئی گریز نہ ہوگا کہ مزاحیہ انداز میں کہی گئی ان کی ایک ایک بات کسی بڑے فلسفی کی حکایتوں سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔

خسرو کی شاعری میں جہاں فارسی بھی مخلوط ہے وہیں نظیر کی زبان فارسی عناصر سے پوری طرح عاری ہے۔ جسے مکمل ہندوستانی کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ خالص ہندوستانی تراکیب کے استعمال کی وجہ سے نظیر کے اشعار اس قدر سادہ سہل وعوامی زبان میں ہیں کہ یہ لوگوں کو آج بھی زبان زد ہیں۔ جسے وہ موقع بہ موقع محاورے کے طور پر بھی سنادیا کرتے ہیں۔ جیسے۔

پورے وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
یاں تک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا
جب موت سے آکر کام پڑا
سب قصے قضیے پاک ہوئے

جہاں تک اردو نظم کا تعلق ہے تو یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نظیر نے ہی اس صنف کو اصل معنوں میں معراج کمال تک پہنچایا ہے۔ حالانکہ نظیر نے غزلیں بھی لکھیں مگر ان کا کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے دراصل شاعری میں ان کے نام کو روشن کردینے والی صنف صرف اور صرف ان کی نظمیں ہیں۔

نظیر مزاج کے اعتبار سے سادگی پسند تھے جوانی میں جو کچھ رہے ہوں البتہ پیری میں انھوں نے جوگ اختیار کرلیا تھا۔ جس کا پرتو ان کی شاعری میں مکمل طور پر عیاں ہوتا ہے۔ انھوں نے آئینہ نامہ، بنجارانامہ اور آدمی نامہ جیسی درجنوں نظمیں لکھی ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کے حقائق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ہندی کوی 'بہاری' کے مانند وہ الفاظ کے جوڑ توڑ اور الٹ پھیر سے کافی استفادہ کرتے ہیں۔ شعر میں وزن پیدا کرنے اور اسے آسان تر بنانے کی غرض سے انھوں نے اصل الفاظ کی صورت تک بدل دینے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ان کے یہاں اپنے ایجاد کردہ الفاظ کی بھی کثرت ہے۔ مگر ان کے یہ الفاظ ہمیں گراں نہیں گذرتے بلکہ اور بھی لطیف معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے 'تھم' 'کھچا' اور 'رچا' وغیرہ۔ اگر شاعری صرف ترکیب الفاظ کی بندش کا ہی نام ہے تو نظیر کو ایک کامیاب شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اگر اپنے دل کی بات اور جذبات واحساسات کو دوسروں کے ذہن ودل تک پہنچادینا شاعری ہے تو نظیر ایک کامیاب ہی نہیں بلکہ مکمل شاعر کہے جاسکتے ہیں۔

نظیر نے اپنے دیوان کا آغاز بھی مروجہ روایت کے مطابق حمد باری تعالی سے کیا ہے۔ جس کا پہلا بند کچھ اس طرح ہے۔

اس ارض وسما کے عرصے میں یہ کتنا تھم کھچا ہے
یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے یہ رنگ تجھی نے رچا ہے
حیوان بکھیر و نر ناری کیا بوڑھا بالک بچا ہے
کیا دانا بینا ہوش بھرا کیا بھولا ناداں کچا ہے
کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

نظیر مذہبی جھگڑے اور فساد کے سخت خلاف تھے ان کے نزدیک جو جس مذہب سے عقیدت رکھتا ہے اسے اسی مذہب سے مسرت حاصل کرنا چاہیے۔ حقیقی عقیدت مند کا مذہب ان کے نزدیک صرف محبت ہی ہوسکتا ہے۔ اور جہاں محبت ہوتی ہے وہاں نفرت کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ خود فرماتے ہیں۔

جھگڑا نہ رہے ملت ومذہب کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑا خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں
عاشق وقلندر رہے نہ ہندو نہ مسلماں

صوفی ہونے کی وجہ سے نظیر کو ہر چیز میں خدا کا نور اور اس کے جلوے نظر آتے ہیں جسے وہ قاری کو بھی اپنے منفرد انداز میں سمجھاتے ہیں اور بتاتے ہیں۔

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان
ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں، بارنگ میں، نیرنگ میں پہچان
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

نظیر کا آدمی نامہ بہت مشہور ہے یہ ایک طویل نظم ہے جس میں آدمیوں کی خصوصیات اوران کی خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس وگدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر خدا ہوا........

ان اشعار میں کتنے معرکے کی بات کہی گئی ہے شاعر کی نگاہ کتنی باریک بیں اور تجربہ کس قدر پختہ ہے۔ زبان اس قدر پراثر ہے کہ جو بات سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے وہ قاری کے ذہن ودل پر تادیر قائم رہتی ہے۔ یہاں نظیر کے نزدیک تمام انسان ایک ہی طرح سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی طرح سے مرتے ہیں مگر وہ انسانیت کے اعتبار سے ہی اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔ اور دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی نیک واچھے آدمی اپنی انسانی قدروں کی وجہ سے لوگوں کے ذہن ودل میں ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہتے ہیں۔ نظیر کی سب سے اہم خوبی جو انھیں دیگر نظم نگاروں سے منفرد کرتی ہے وہ ان کا بے باک انداز بیان ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے طوالت وزور بیان کے ساتھ اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اور مزید جاننے کی نہ تو کوئی گنجائش باقی رہتی ہے اور نہ ہی کوئی طلب بیدار ہو پاتی ہے۔ اسے نظیر کا شیوہ شاعری ہی کہا جائے گا کہ وہ اپنے شاعرانہ موضوع سے قاری کی ادبی تشنگی کو پورا کردیتے ہیں ان کا زندگی سے متعلق فلسفہ بہت ہی سیدھا سادہ اور دلچسپ رہا ہے۔ جہاں ایک جانب وہ آدمی نامہ میں آدمی کی خصوصیات بیان کرتے ہیں تو وہیں اس انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی کا بھی بیان روٹی نامہ جیسی نظم لکھ کر اس جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں ان کے نزدیک دنیا میں انسان کے ذریعے اٹھائے جانے والا کوئی بھی قدم اور اس کے ذریعے کیے جانے والا کوئی بھی عمل گھوم پھر کر یا سیدھے طور پر روٹی کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں ہی کیا جاتا ہے۔ انسان روٹی کو حاصل کرنے کے لیے ہی برا اچھا یا برا کام کرتا ہے اس کی خاطر وہ کسی کی جان تک لے لینے سے گریز نہیں کرتا اور جب یہ میسر نہیں ہوتی تو انسان کی عقل بھی کام کرنا بند کردیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بدنام ہے اسی کے لیے خلق میں قلال
ذبح بھی کرے ہے اسی کے لیے حلال
صیاد بھی اسی کے لیے لے چلا ہے جال
ٹھگ بھی اسی کے واسطے پھانسی گلے میں ڈال..

نظیر نے دیوالی، دسہرہ، جنم کنہیا اور راکھی جیسے ہندو تہواروں پر کافی طویل اور لاجواب نظمیں لکھی ہیں۔ اسی طرح ہولی پر لکھی ان کی نظم کافی مشہور ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

یا حسن بتاؤں ہولی کا یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں
اور قیصر کا ماتھے ٹیکا سب ابھرن تن پر جھمکارہا
دکھلانا سج دھج شوخی کا ہنس دینا ہردم نازبھرا
ہر ایک قدم اٹھکیلی کا ہر گالی مصری قند بھری
یہ جوبن پایا ہولی نے دلشاد کیا اور موہ لیا

اسی طرح 'برسات کی بہاریں' نامی نظم میں انھوں نے دلکش منظر نگاری کی ہے اور برسات کا ایک سماں سا باندھ کر رکھ دیا ہے۔ خود لکھتے ہیں۔

بادل ہوا کے اوپر مست ہو چھا رہے ہیں
جھاڑیوں کی مستیوں میں دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا، جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

کہا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی موسم ہندوستانی برسات جیسا دلکش نہیں ہوتا۔ اس موسم کی خصوصیت ہے کہ یہ دل کو مسرت اور طبیعت کو شوخی عطا کرتا ہے اس موسم میں دھان کی ہریالی، مور کا شور، پپیہے کی پی ہوں، مینڈھکوں کی ٹرٹر، جھینگر کی جھنکار، بادلوں کی گرج اور برق کی چمک بے جان شخص کے جسم میں بھی نئی روح پھونک دیتے ہیں لہٰذا نظیر نے بھی برسات کے موسم میں پیش آنے والی فطری تبدیلیوں کو صداقت کے ساتھ اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے۔ علاوہ ازیں نظیر نے ہندوستان کے دیگر موسموں جیسے گرمی اور سردی پر بھی کافی طویل اور کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ جن کے مطالعے سے ایک محاکاتی تصور بیدار ہو جاتا ہے۔

نظیر کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر شاعری کی اس میں نہایت ایمانداری اور کامیابی کے ساتھ تفصیلی انداز میں پیکر تراشی کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں وہ اس قدر کامیاب رہے کہ ان کی تحریر کردہ ہر نظم بے نظیر بن گئی ہے۔ ان کی نگاہ چھوٹی سے چھوٹی بات اور شے پر بھی رہتی ہے۔ برسات کی گرمی والی امس کیا ظلم برپا کرتی ہے۔ اس پر بھی نظیر نے ایک نظم لکھی ہے اور میرے مطالعے کے مطابق نظیر سے قبل شاید ہی دنیا کے کسی شاعر نے امس پر کوئی شعر کہا ہو۔

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے امس
سب چیز تو اچھی ہے پر ایک قہر ہے اُمس...

نظیر نے بھگوان شیو شنکر کی بارات پر بھی ایک نظم بعنوان 'مہادیو کا بیاہ' قلم بند کی ہے۔ جو پورے اردو ادب میں اپنی نوعیت کی انفرادی نظم کہی جاسکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پھر ساتھ ہزاروں اور چلے جو بھوت، پریت اور راکش تھے
ڈیل اونچے ان کے برج شمن اور سیس بھی ان کے گٹ تھے
ہر پگڑان کا سومن کا اور موٹے رسے کے پٹکے
اور پگڑی پر طرہ کی طرح تھے سا کھو بر کے بر رکھے
کوئی ننگے سر اور بال اس کے جیوں بانس کھڑے دس دس گز کے
کوئی منڈ کورنڈ اور کوئی بن پاؤں ناچے اور کودے

تلسی داس کو چھوڑ کر شاید ہی کسی ہندی شاعر نے اس موضوع پر کبھی ایسی نظم کہی ہو جسے نظیر نے اپنے شاعرانہ جوہر وفن اور فکری بصیرت سے اس نازک اور غیر معمولی بیان کے ذریعے معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔ شو جی کی اس بارات میں بھوت پریتوں کی آرائش وزیبائش کے لیے نظیر نے جن تراکیب والفاظ کا استعمال کیا ہے یہ انھیں کا خاصہ ہے کیونکہ شیو شنکر جیسی اہم اور عظیم شخصیت کے براتی اسی طرح کے مافوق الفطرت عناصر ہو سکتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نظیر کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے وہ ایک فطری اور عوامی شاعر ہیں ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ ان کے تمام موضوعات انسانی زندگی کی ضروریات، دنیاوی حقائق مناظر فطرت کی جزئیات وکیفیات اور انسانیت کے لیے ضروری کاوشوں سے متعلق ہیں۔ نظیر فلسفی نہیں ہے مگر زندگی اور انسانیت کے تئیں ایک بہت واضح اور صحت مند نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں حقیقت اور جذبات نگاری کی ایسی حسین آمیزش ہے جسے الگ کرپانا ناممکن ہے نظیر ایک کامیاب معلم کی طرح اپنے موضوع کو سمجھانے اور اس سے نصیحت بہم پہنچانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ ان کا سیکولر مزاج ہندوستانی سماج وماحول کے لیے تمام ہندوستانیوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے کی سمت میں ایک ترغیبی نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظیر بیک وقت ایک صوفی، شاعر، استاد اور مصلح انسانیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان اور اردو والوں کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں نظیر جیسا عظیم شاعر نصیب ہوا جس پر کتنا ہی فخر کیا جائے وہ کم ہی ہوگا۔

■

Dr. Nadeem Ahmad
Assistant Prof. Dept. of Urdu
Kirori Mal College
University of Delhi
Delhi-110007
Email : nadeemahmad_126@yahoo.co.in
Mob.09136162160

محمد عبدالقادر

اردو تذکراتی تحقیق وتنقید میں حنیف نقوی کے امتیازات

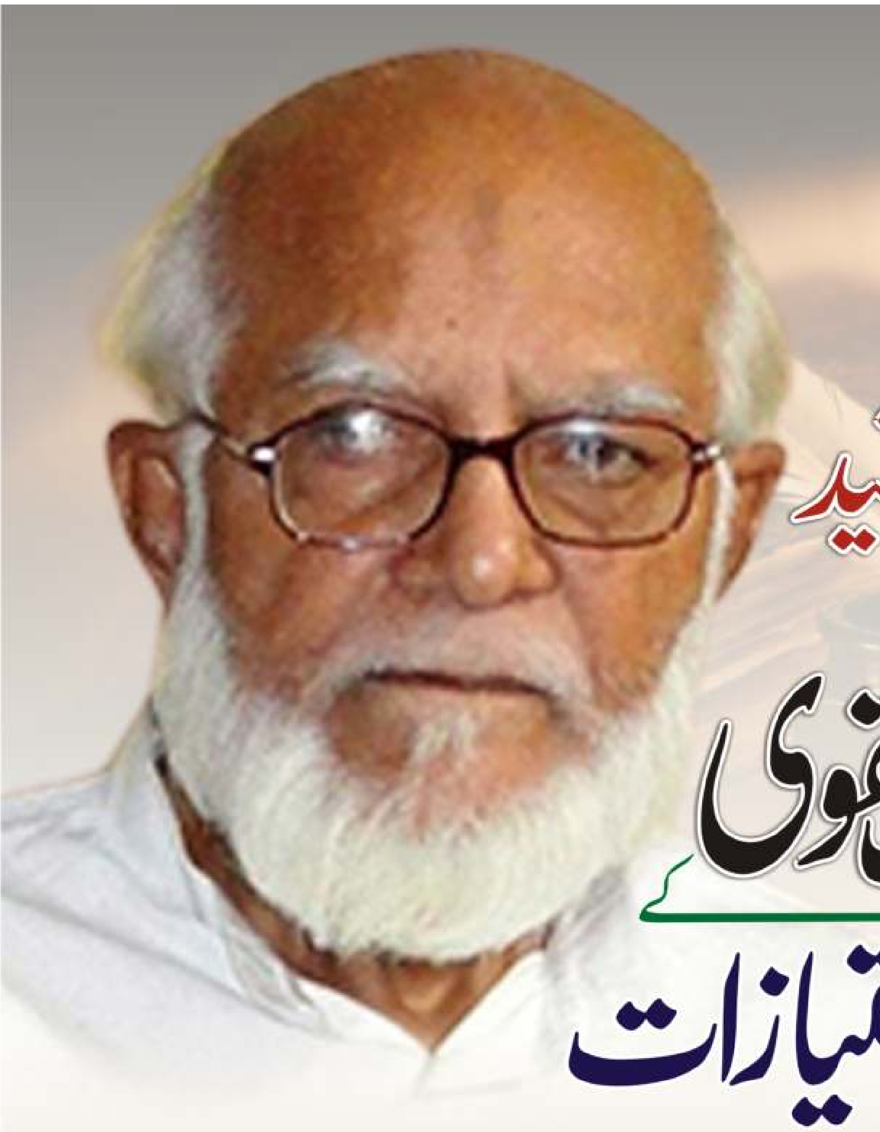

حنیف نقوی کا شمار اردو کے نامور محققین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے، لیکن میدان تحقیق ان کا سب سے پسندیدہ میدان رہا، اردو کے کلاسیکی ادب پران کی مضبوط پکڑ تھی، تذکرہ نگاری کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، اردو کے اس میدان میں عملی کاوشیں کرنے والے محققین کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، ان میں یہ اپنے امتیاز سے بلندی کے ایسے درجے پر فائز ہیں جس تک پہنچنا ہر کہ ومہ کے بس کی بات نہیں۔

تذکرہ نگاری کے میدان میں ان کی روش تحقیق سب سے جدا اور نرالی رہی، کیوں کہ تذکرہ نگاری سے دلچسپی ہونے کے باعث انھوں نے اس کی اہمیت وافادیت کو جس احسن طریقے سے ثابت کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ تذکراتی ادب سے کلاسیکی ادب کا جو رشتہ ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں کلاسیکی ادب کی بہت سی گتھیاں انھیں تذکروں کے ذریعے سلجھتی ہیں، اگر ان کے نقوش اولیں نہ ہوں، تو راہ میں ظلمت ہی ظلمت ہے۔ لیکن پتا نہیں کہ ادبا کے سامنے ایسے کون سے عوامل تھے؟ جن کی وجہ سے یہ علمی ورثہ ان کی توجہ سے محروم رہا اور محرومیت کے بادل بھی اس قدر طویل تھے کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، بھلا ہو ان گنے چنے افراد کا جنھوں نے اپنے قرطاس وقلم کے ذریعے انھیں ایک نئی زندگی عطا کر کے ان میں پوشیدہ نظریات، رجحانات وتحریکات، سیاسی اثرات، ادبی چاشنی، تنازعات، لفظی مباحث، محاوراتی رچ رچاؤ اور رنگا رنگی کو ہمارے سامنے پیش کیا، ان تذکروں میں شاعری کے ایسے گلشن آباد ہیں، جن کی نظیر ان کے علاوہ کہیں دوسری جگہ نہیں ملتی، مزید یہ بات بھی مسلم الثبوت ہے کہ تنقید کے اولین سرچشمے انھیں تذکروں سے پھوٹتے ہیں۔ تنقید نے انھیں کے سہارے چلنا سیکھا، ماضی میں اس کا انداز کیسا تھا؟ ناقدین کا طریقہ کار کیا رہا؟ تنقید کی نوعیت کیا تھی؟ زبان کے رنگ وآہنگ، شعر وادب، زبان اور مسائل زبان، زبان کی پیدائش، جیسے گراں قدر مسائل پر بھی، ان تذکروں ہی سے روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے کلاسیکی روایت کے تسلسل کے امین اور اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ روایت عہد شباب تک کن کن مراحل سے ہو کر گزری۔ کن ادبا نے اس کو اپنی گود میں پال پوس کر بڑا کیا، اگر یہ نہ ہوتے، تو ہم بہت سے شعرا وادبا سے محروم ہو جاتے، جن کے نام ونشان کی حفاظت کی ذمے داری ان تذکروں نے برداشت کی، تذکرے ہمیں ایسی پر خطر وادیوں سے سلامتی کے ساتھ گذرنے کا ہنر بھی سکھاتے ہیں، جن میں ان کے سوا کوئی اور چراغ راہ ہے ہی نہیں، وہاں تہ در تہ تاریکی ہے، اگر تھوڑی بہت روشنی کی کہیں سے آس ہے، تو یہی صنف ہے۔ فی زمانہ اگرچہ ان کا رواج نہیں ہے۔ لیکن ان کے بغیر ادبی، اور مشرقی روایت کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔

حنیف نقوی فارسی اور عربی کے اچھے اسکالر تھے۔ ان کے مطالعے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے نقوی ان تمام سے لیس تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی، اور اس پر پڑی بے اعتنائی کی چادروں کو اس کے سر سے ہٹانے کی جدو جہد کی، جس وقت ان کا یہ قابل قدر کارنامہ منظر عام پر آیا سبھی نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اس کی توصیف کی، رشید حسن جیسا ناقد بھی داد تحسین سے اپنے آپ کو نہ روک سکا۔

''میں نے اس تحقیقی مقالہ کو اول سے آخر تک پڑھا آپ نے جس لگن سے مسالا اکٹھا کیا ہے وہ قابل داد ہے اور جس دیدہ ریزی سے اسے مرتب کیا ہے وہ مستحق تحسین و آفرین ہے۔'' (تذکرے اور تبصرے، ص 6)

''گیان چند جین جیسا سخت گیر ناقد بھی ان کے طرز کا دیوانہ ہوگیا، آپ کا ذوق تحقیق دیکھ کر نہایت مسرت ہوتی ہے۔'' (ایضا، ص 6)

حنیف نقوی کا طریقہ کار بالکل صاف انداز کا ہے اور اسی کے تحت انھوں نے اس کاوش کو پیش کیا ہے۔ جن ادبا وشعرا کے حالات زندگی یا ان کی تصانیف با آسانی

دستیاب ہو جاتی ہیں تو وہ ان کی تاریخ وفات بیان کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں، لیکن اگر اس میں ادبا کے درمیان اختلاف ہو تو محاکمہ کرتے ہوئے اس کے سبھی پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔

''میر تقی میر متوفی 1225ھ/ 1810 نے فارسی نثر میں تین کتابیں نکات الشعراء، ذکر میر، فیض میر اپنی یادگار چھوڑیں ہیں۔ ان میں سے جو شہرت و مقبولیت 'نکات الشعرا' کے حصے میں آئی ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔'' (شعرائے اردو کے تذکرے، ص 179)

یہ تو رہا نکات الشعرا کے خالق اور ان کی نثری کتب کا تعارف، لیکن ابھی اس میں نکات کے نسخ کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں چل رہا ہے۔ اس کے سبھی نسخوں کا تعارف بھی بڑے اچھے انداز سے اس بیان کا حصہ ہے۔ اس کی اشاعت کب، کہاں سے ہوئی؟ کس نے اس پر مقدمہ لکھا؟ یہ سب ابتدائی معلومات درج کی ہے ملاحظہ کریں۔

''شعرائے اردو کا یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو، ہند اورنگ آباد سے دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

پہلا ایڈیشن 1922 میں نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے مقدمے کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔

دوسرا ایڈیشن 1935 میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ترتیب دیا جس کی طباعت غالباً انجمن کے ذاتی پریس میں عمل میں آئی۔

تیسرا ایڈیشن 1972 میں ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے یہ ایڈیشن پیرس کے قومی کتب خانے کے خطی نسخے پر مبنی ہے جو 'بندر سورت' میں نقل کیا گیا ہے اور چہار شنبہ 17 ماہ شوال 1178ھ 10 اپریل 1765 کو مکمل ہوا'' (ایضاً، ص 180)

اس کے علاوہ اور بھی خطی نسخوں کا تعارف اور کیفیات کا ذکر کیا ہے نسخہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہے اس میں ترقیمہ ہے کہ نہیں، یہ ناقص الاول ہے یا ناقص الآخر مذہب ومطلی ہے اگر ہے تو کس انداز کی روشنائی اور ورق کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے نسخے ہندوستان میں کہاں کہاں دستیاب ہیں وغیرہ۔

حنیف نقوی کی استخراجی صلاحیت کا ملکہ زبردست ترقی پذیر تھا جس کے دم پر وہ نتائج کا استنباط کر کے اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں ان کی تحقیقی حس بڑی بیدار ہے صحیح و سقیم کو وہ بڑی جلدی پہچان لیتے ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مخزن نکات کو نکات الشعراء پر فوقیت دی ہے۔ اس کے علاوہ نثار احمد فاروقی کا موقف یہ ہے کہ نکات الشعراء کی ترتیب کے وقت مخزن نکات ان کے پیش نظر تھا اس کی بہت سی دلیلیں انھوں نے پیش کی ہیں۔ ان سب ادلہ کو بالترتیب رد کر کے خارجی اور داخلی شہادتیں پیش کر کے مخزن نکات پر نکات کی اولیت کو ثابت کیا ہے اور اپنے موقف کے خلاف جتنے بھی ممکنہ پہلو ہیں ان کا احاطہ کر کے اس کے شکوک و شبہات کو دور کیا ہے لکھتے ہیں:

''یہ امر طے شدہ ہے کہ گردیزی نے میر کے تذکرے سے پوری فراخ دلی کے ساتھ کسب فیض کیا ہے حتی کہ انھوں نے شاہ حاتم کا ایک شعر اس ترمیم شدہ شکل میں اپنے ہاں نقل کر لیا ہے جو میر نے اصل شعر کا مصرع اول بدل کر متعین کی تھی۔'' (تذکرے اور تبصرے 36)

اس کے علاوہ استفادہ پر ایک قوی دلیل قائم کرتے ہیں اور اس بات کو مضبوط بناتے ہیں کہ میر نے مخزن نکات سے استفادہ نہیں کیا بلکہ قائم نے استفادہ کیا ہے اور خوب کیا ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میر محمد یار خاکسار اور آفتاب رائے رسوا کے منتخب کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نکات الشعراء سے ماخوذ ہے میر صاحب نے خاکسار کے بارہ اور رسوا کے چار شعر انتخاب کیے ہیں۔ قائم نے ان میں سے خاکسار کا صرف ایک شعر حذف کیا ہے باقی تمام اشعار بعینہٖ نکات الشعرا کی ترتیب کے مطابق نقل کر دیے ہیں۔ رسوا کے نمونہ کلام کی صورت یہ ہے کہ میر کے انتخاب کردہ چوتھے شعر کو قائم نے دوسرے نمبر پر رکھا ہے۔ باقی تین اشعار میں کوئی الٹ پھیر نہیں کیا ہے ان دونوں مثالوں سے نکات الشعرا کی اولیت و مرکزیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے قائم نے یقیناً اس سے خوشہ چینی کی ہے اور یہ اس دور کی روایت کے عین مطابق ہے۔'' (ایضاً، ص 37)

ان کی تذکراتی تحقیق کی یہ خوبی بھی ہے کہ یہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ترک نہیں کرتے، وہیں مختلف نسخوں کو دیکھے بغیر کوئی رائے بھی قائم نہیں کرتے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام کتب کا احاطہ کر کے نیز مسئلے کو ہر پہلو سے جانچ کر ہی اس کو لکھتے ہیں اس کے بعد یہ املا، نسخوں کی کیفیت، تصحیح و تصحیف، تحریف متن، سقوط جمل، فساد معنی پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے تحقیق و تدوین کے اصول کے ساتھ مرتبین و مدونین پر بھی جامع اور معلوماتی انداز کے تبصرے کرتے ہیں جن کے لیے سر کھپانا پڑتا ہے۔ اگر ترتیب متن کا معیار بلند ہوتا ہے تو اسے سراہتے ہیں اگر اس میں کوئی خامی ہوتی ہے تو اسے ضرور بیان کرتے ہیں۔ تدوین متن تو ویسے بھی بڑا مشکل فن ہے اس کو

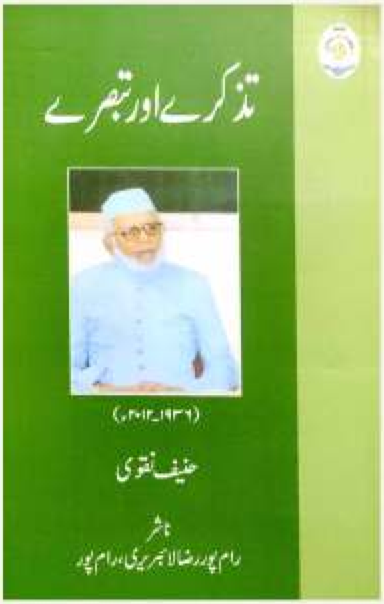

پورے طور پر نبھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ڈاکٹر اقتدا حسن نے جو نسخہ مرتب کیا ہے اس میں اغلاط کی بھرمار ہے۔ اس نسخے اور مولوی عبدالحق کے مرتب کردہ نسخے کو پیش نظر رکھ کر اختلافات کو حواشی میں درج کیا ہے۔ اقتدا حسن اور مولوی عبدالحق دونوں کے مرتبہ متن تدوین کے معیار پر پورا نہیں اترتے، اقتدا حسن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اشاعت ثانی مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن کا متن بھی تدوین کے متوقع معیار کے مطابق تحقیق و تصحیح کی شرائط پوری نہیں کرتا۔'' (ایضاً، ص 39)

یہ تبصرہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب مبصر دونوں نسخوں کا مطالعہ کرے ورنہ اتنا ٹھوس تبصرہ بغیر مطالعے کے نہیں کیا جا سکتا۔ اس تبصرے کی شان کتنی اونچی اور گہری ہے وہ اس میدان کے شہسواروں پر واضح ہے یہ تحکم اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے کلی لوازمات پر گہری نظر ہو ورنہ لہجے میں اس قدر پختگی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ حک وصک کے بعد تجرباتی بھٹی میں تپ کر ہی یقین میں تبدیل ہوتا ہے اس کے لیے خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔

تصحیح متن کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں تاکہ ان کی گہری نظر پر وہ شاہد ہو سکے۔ اور ان کی تحقیقی کاوش اجاگر ہو سکے جہاں اکثر و بیشتر محققین کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں وہاں پر سلامت روی سے گزر جانا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

''در زینت المساجد کہ کنار دریائے (جمن) چوں از تعمیر زینت النسا بیگم است مسکن خود قرار دادہ۔''

(ایضاً، ص 40)

اس عبارت پر گرفت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

چوں اصلاجمن کی ہی مسخ شدہ شکل ہے جو کہ غور وفکر کی متقاضی تھی لیکن مرتب متن نے پتا نہیں کیوں اس پر غور وفکر نہیں کی؟ اور اس فحش غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے۔ یہ تن آسانی اور دماغ سوزی سے دوری اور کم نظری کی دلیل ہے۔جس پر انھوں نے تنبیہ کی۔ان کی بزم تذکرہ نگاری میں انفرادیت کے ایسے بہت سے گل بوٹے سجے ہیں ان کو آشکار کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ تذکرہ نگار کے تعارف کے بعد اصل موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ اگر تذکرہ نگار معروف نہیں ہے تو اس کے وطن اور تلمذ پر روشنی ڈالتے ہیں۔اس کی سیرت وسوانح سے بحث کرتے ہیں اور اس کی سوانح حیات کن کتب میں موجود ہے اس کی جانب بھی توجہ دیتے ہیں۔دکنی مصنفین کی کتب اور ان کا تعارف بھی پیش کرتے ہیں لیکن کتب کا تعارف کم یاب ہے اگر کوئی خوبی ایسی ہے کہ جس کا ذکر ناگزیر ہے تو اسے بھی کشادہ روئی سے ذکر کرتے ہیں یہ طریقہ کار اس وقت اور بھی شدت اختیار کر جاتا ہے جب تذکرے یا مخطوطہ کا تعلق دکن سے ہو۔یہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ دکنی مخطوطات میں اشکال حروف کے امتیاز کو لے کر بڑے ابہامات ہیں۔مثال کے طور پر دوچشمی ھا اور ہائے ملفوظ دکنی مخطوطات میں امتیاز نہیں رکھتی دھڑلے سے اس کے لیے دوچشمی ھا کا استعمال ہوتا ہے اس ابہام کے رفع کے لیے بھی انھوں نے اس طریقہ کار کو اپنایا ہے۔

''چمنستان شعرا دکنی تذکروں میں حسن ترتیب، جامعیت اور ادبی معیار کے لحاظ سے چمنستان شعرا کا سر فہرست ہے اس کے مؤلف لچھمی نرائن شفیق بڑے باصلاحیت اور ذی علم انسان تھے اورنگ آباد جیسے گہوارہ علم ادب سے وطنی وابستگی اور علامہ آزاد بلگرامی کے فیضان تربیت کی بدولت ان کی شخصیت کے جوہر نکھرے اور کم عمری ہی میں شعر و ادب نیز تصنیف وتالیف سے ان طبعی دلچسپیاں بام عروج تک پہنچ گئیں۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے، ص217)

شفیق کی تنقیدی صلاحیتوں پر بھی نقوی نے کھل کر داد تحسین پیش کی ہے اور ان کے نپے تلے انداز کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بیان کیا ہے اور ان کے ساتھ ادبی انصاف کیا ہے کہیں بھی ان کی پسند دخیل نہیں ہے۔دیانت داری رواداری کا ایسا نمونہ پیش کیا ہے جو شخص بھی بغیر کسی تعصب کے اس کا مطالعہ کرے گا وہ ان سب خوبیوں پر مطلع ہو جائے گا۔شفیق کی تنقیدی بصیرت کے اظہار واعلان کے لیے انھوں نے تین مثالیں پیش کی ہیں جو اس بات کی گواہ ہیں کہ دعویٰ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کیا گیا ہے نا کہ الفت ومحبت کے پیش نظر یہ باتیں کہی گئیں ہیں۔

''چمنستان شعرا میں ابتدائی دور کی عام روایات کے برخلاف تنقیدی مواد بھی خاصی مقدار میں موجود ہے شفیق نے کلام کے متعلق عام طور پر جن الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ان کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری کے لیے معانی تازہ ومضامین بیگانہ کی تلاش اور متانت وخیال اور شیرینی مقال کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور ان فن پاروں کو لائق تحسین خیال کرتے ہیں جو پڑھنے اور سننے والوں کے لیے انشراح طبیعت کا سامان فراہم کر سکیں بہ الفاظ دیگر ان کے نزدیک کوئی شخص اس وقت تک ایک کامیاب شاعر کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوسکتا جب تک اس کے کلام میں متذکرہ خوبیاں موجود نہ ہوں۔'' (ایضاً،ص218)

تذکراتی ادب کی تحقیق و تفتیش میں حنیف نقوی نے بڑی کامیابی حاصل کی ان کے عنوانات خود اس بات کے گواہ ہیں کہ انہوں نے اس میدان میں بہت سے نئے گوشے سر کیے ہیں- جس کا اندازہ ان کی تذکراتی تحقیق کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے-

مرتب تذکرہ کسی خاص فن سے لگاؤ رکھتا ہے تو اس کی جھلکیاں اس کے کام میں نظر آتی ہیں ان کو بھی انھوں نے بیان کر کے ان مقامات کی نشان دہی کی ہے اور جن تذکروں میں سوانح نگاری کے ساتھ سنین اور حالات زمانہ کی رعایت برتی گئی ہے اور اس سے اس عہد کی ادبی اور سیاسی تاریخ پر کچھ انفعالی اثرات مرتب ہوئے ہیں تو ان سب کو بھی عمدہ انداز سے نقوی نے ذکر کیا ہے۔ان کی تنقید میں جماؤ، گیرائی، سلیقہ مندی، اظہار کے پیرایے سبھی درمیانہ ہیں کہیں بھی کسی کے دباؤ میں نظر نہیں آتے، کسی پر آنکھ موند کر بھروسہ نہیں کرتے، تن آسانی ان کے قریب سے نہیں گذری جدو جہد محنت ومشقت کی چکی میں اپنے آپ کو پیتے ہیں اور اس قدر پیتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ اس قدر انہماک، شدت اور کام کی لگن ان کے سوا کم یاب ہے جس کے تصور سے ہی اچھے اچھے دور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔لیکن ان کی دھن نے ان کے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں۔

تقابلی مطالعہ کرتے وقت بہت سے تاریخی واقعات کی اسناد اور اس کی صحت وسقامت کو بڑے اچھے انداز سے بیان کرتے ہیں۔تذکروں کی اس خامی پر تنبیہ کرتے ہوئے اس کے مخرج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ صحیح یہ ہے یہ غلط بیانی یا انتساب اس عہد میں اس مقام سے تذکروں میں در آئی اور اس کی صحت کا ماخذ یہ ہے۔تذکرے میں کلام کا انتخاب کس نوعیت کا ہے غزلیں، قصیدہ یا اس کے علاوہ کسی اور صنف سے اس کا تعلق ہے وہ ان سب پر روشنی ڈالتے ہیں۔تذکرے میں غالب رجحان کیا ہے، یہ تذکرہ دوسرے تذکروں سے کن وجوہات سے مختلف ہے۔ اخیر میں جب وہ تبصرہ کرتے ہیں تو اس مجموعے کی پوری خوبیاں خوش اسلوبی سے بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی خامیوں کی طرف بھی توجہ کرتے ہیں جس سے قاری کے دماغ میں اس کا ایک خاکہ مرتب ہو جاتا ہے۔اس کی ادبی اہمیت کیا ہے؟ اور اگر اس کی اہمیت ہے تو کن عناصر کی وجہ سے ہے اور ادبیت کس درجے کی ہے اور اس کی ادبیت مجروح ہوئی ہے تو کیوں مجروح ہوئی ہے؟ وہ کون سے عناصر ترکیبی ہیں جو اس کی ادبی اہمیت کو گھٹا رہے ہیں ان سب پر روشنی ڈالتے ہیں۔

''آخر میں قائم کے بعض ایسے بیانات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو غلط فہمی اور حقائق سے بے خبری پر مبنی ہیں اور ہمارے لیے قابل قبول نہیں مثلاً سعدی کے ذکر سے طبقہ اول کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اتفاق جمہور بر آنست کہ چوں حضرت شیخ سعدی شیرازی در ہنگام سیاحت بہ طرف گجرات تشریف آوردند بی سبب مجاورت سومنات چناں کہ در نسخہ بوستاں مذکور است بہ زبان ایں دیار وقوف یافتہ یک دو غزل ریختہ... مع دیگر ابیات بر سبیل تفنن ارشاد فرمودند۔

اب یہ بات بالکل پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دیار ہند میں طبع آزمائی کرنے والے سعدی شیخ شیرازی سے بالکل مختلف شخصیت ہیں۔میر اور ان کے متبعین نے انھیں باشندہ دکن قرار دیا ہے لیکن حافظ محمد علی حیدر کاکوروی کے مطابق وہ لکھنؤ کے قصبہ کاکوری کے رہنے والے تھے حافظ صاحب موصوف نے ان کی تاریخ وفات 3 ذی الحجہ 1003ھ مطابق 10 اگست 1594 بتائی ہے... آگے رقم کرتے ہیں آنچہ بعض ایں را شیخ سعدی گمان بردہ اند خطا است۔'' (ایضاً،ص266)

اختلاف بڑی اچھی چیز ہے کیوں کہ انسان کا فکری تنوع خود اختلاف کی دلیل ہے لیکن ادب میں اس کی اہمیت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب یہ تحقیقی دروازوں کے وا کرنے یا ادب میں در آئی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے کیا جائے۔اور اگر اس میں تعصب وہٹ

دھری شامل ہوجائے تو یہ حقیقتوں کا قاتل بن بیٹھتا ہے۔نقوی نے بہت سی جگہوں پر اپنے پیش روؤں سے اختلاف کر کے ان کے تسامحات کی قلعی کھولی لیکن دامن ادب کو ہاتھوں میں تھامے رکھا۔ پروفیسر محمود الٰہی نے تذکرہ شورش کے نسخہ جون پور کا اولا تعارف کرایا جس میں انھوں نے جناب شورش کی تنقیدی بصیرت کو بڑا سراہا، ان کی آزادانہ رائے کی اہمیت کے قصیدے پڑھے، ان کے نقد ونظر کو عظیم آباد کی مٹی کا اثر اور علما فضلا کی صحبتوں کا فیضان قرار دے کر ان کی تعریف وتوصیف کے قلابے ملانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، جتنی تعریف وتوصیف ہوسکتی تھی وہ انھوں نے کی نقوی اس بارے میں نہایت صاف گو تھے انھوں نے مقابلہ اور توازن کرکے محمود الٰہی کی سخت سرزنش کی ہے لکھتے ہیں:

''نسخہ جون پور کے واسطے سے تنقید کلام کی جتنی مثالیں ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں اعتماد اور آزادی رائے کی جھلک کسی جگہ بھی نظر نہیں آتی، البتہ اگر کلام پر اظہار رائے کی تخصیص ختم کرکے میر صاحب کے تذکرے کی حریفانہ خردہ گیری کو بھی تنقید ہی کے زمرے میں شامل کرلیا جائے تو کسی حد تک ڈاکٹر صاحب کے قول سے اتفاق کی گنجائش نکل سکتی ہے۔'' (ایضا،ص 316)

شورش کے انداز انتخاب سے بھی نقوی مطمئن نظر نہیں آتے کیوں کہ جو خامیاں دیگر تذکروں میں ہیں وہ سب ان کے اس تذکرے میں موجود ہیں۔ ان کے انتخاب میں نیا کچھ بھی نہیں جو ماقبل کے تذکروں میں موجود نہ ہو، جدت ان کے پڑوس کو بھی نہیں گذری، کسی بھی جہت سے اس کو پرکھا جائے تو آغاز سے انتہا تک قدیم نہج کا مرقع معلوم ہوتا ہے۔

تذکروں میں اسلوبیاتی مطالعے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور یہ بات بھی طے ہے کہ ہر مصنف کا اسلوب تحریر جداگانہ ہوتا ہے جو اس کی شناخت ہوتا ہے، جس کا تشکل محاورے، روز مرہ، اسما وافعال کنایہ، مجاز، تشبیہ و استعارہ اور جملوں اور فقروں سے ہوتا ہے۔ یہ ترکیب اسی مصنف کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار وہ اس ترکیب میں چوک جاتا ہے اور اس طرح کی چوک کو نقاد اپنی گرفت میں لے کر اس کی خرابیوں پر قارئین کو آگاہ کرتا ہے یہ فنی نقطہ نظر سے زبان وبیان پر اس کی مضبوط گرفت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ نقد ونظر کے اولین مرحلے سے آج تک ہر زبان میں رائج ہے۔ خاص کر اردو تذکرہ نگاری نے جب تنقید کی داغ بیل ڈالی تو اس طرف بھی توجہ کی اور از میر تا حال یہ زبان کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

''بعض جگہ شفیق نے میر کی طرح الفاظ ومحاورات کے نامناسب یا غلط استعمال پر بھی گرفت کی اور اشعار کے ظاہری ومعنوی اسقام سے بحث کرتے ہوئے مناسب تر الفاظ اور متبادل مصرعے بھی تجویز کیے ہیں...

لالہ نہال کرن داغ کا ایک شعر ہے۔

انتظاری سے تری اے گل پر کیفیت
دیدہ نرگس فناں میں بھرے ہیں جالے

شفیق اس پر لکھتے:

''اگر بجائے پر کیفیت، نسریں رخساری گفت خوب است۔'' (ایضا،ص 284)

اس پیراگراف سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ تذکراتی ادب میں زبان وبیان پر خاصی گرفت کی جاتی ہے اور ابتدائی دور میں تو اس پر بڑی شدت برتی جاتی تھی، یہ ایک نمونہ ہے ان صاحبان فکر وقلم کے لیے جو تذکروں کی اہمیت کا اعتراف نہیں کرتے اس کے ساتھ ہی تذکراتی ادب انھیں مطالعے کی دعوت بھی پیش کرتا ہے کہ اگر واقعی انھیں ادب اور اس کے مستقبل کی فکر ہے تو اس سرمایے کو اپنی توجہ کا مستحق قرار دے کر اس سرمایے کو اس کا حق عطا کریں ورنہ ان کا ادب کے تئیں فکر مند ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔

تاریخ اور تذکرہ بعض نوعیتوں سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ تاریخ تذکرہ کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ تذکرہ اس کے قائم مقام ہوسکتا ہے۔ البتہ ایک دوسرے کے ممد ومعاون ضرور بن جاتے ہیں اور بالکلیہ ایسا بھی نہیں کہ تذکروں میں تاریخی شعور ہی نہ ہو یہ اور بات ہے کہ تذکروں میں تاریخی شعور بعد میں پیدا ہوا لیکن ایسا نہیں کہ تذکرے اس تاریخیت سے بالکلیہ خالی ہوں۔ یہ شعور تذکروں کے آغاز میں بالکل دھیما تھا۔ بعد میں اس کی جانب بھی توجہ کی گئی اور تذکرہ نگاروں نے اس نقص سے تذکرہ نگاری کو دور کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ ہمیشہ تذکرہ نگاروں کو ایک دوسرے سے شکایتیں رہیں لیکن پیش قدمی کا سہرا کریم الدین کے سر جاتا ہے۔ کریم الدین نے نہ صرف اس طرف توجہ دی بلکہ تذکرہ نگاری کو ادبی تاریخ نگاری سے قریب تر کرنے کی عملی کوشش بھی کی۔ حنیف نقوی لکھتے

''انھیں (کریم) اپنے پیش رو تذکرہ نویسوں سے یہ شکایت بھی تھی کہ ان میں سے کسی نے اس کو شاخ تاریخ نہ رکھا اس لیے انھوں نے اپنے تذکرے میں شعرا کو مختلف ادوار اور طبقات میں تقسیم کرکے اسے تاریخ ادب سے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔'' (تذکرے اور تبصرے ص 129)

حنیف نقوی کی یہی خصوصیات ان کو دیگر محققین سے جدا کرکے ان کی علمی برتری کو ثابت کرتی ہیں، تنقید تذکرہ نگاری میں کوئی بھی ان کے ہم پلہ نظر نہیں آتا، ان کی تحریروں کا اسلوب دلکشی کے ساتھ ادبیت اور چاشنی لیے ہوئے ہے، نقوی کے صبر وشکر نے بھی ان کی علمیت کی گیرائی میں بڑا اہم رول پلے کیا ہے۔ ان کی تحقیق اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک وہ اپنے نتائج سے پوری طرح سے مطمئن نہ ہو جائیں وہ اردو کے پہلے محقق ہیں جو نتائج کے معاملے میں نہایت محتاط ہیں، کسی بھی مسئلے پر وہ جلد بازی نہیں کرتے، اور نہ اس کو پسند کرتے ہیں، جدید تنقید کی اس چکاچوند میں بھی حنیف نقوی غلغلے، شور وشغب کے بغیر ہی تن دہی کے ساتھ کام کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ تذکراتی نقد ونظر کے ساتھ انھوں نے اپنے طور پر انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں یہ کامیاب بھی رہے ہیں، اس میدان میں انھوں نے نظریہ شکنی کے مظاہرے کیے ہیں۔ بڑے بڑے ناقدین کے نظریاتی شیش محل کو زمین بوس کیا ہے۔ اور ان کی حقیقت عیاں کی ہے کہ ان کے ان اقوال کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں، ہاں انھوں نے تذکروں کے سلسلے میں مختلف مفروضات کو ضرور جنم دیا جو تذکراتی ادب کے لیے مضر ثابت ہوئے اور انھیں مفروضات کی وجہ جدید تنقید میں تذکروں کو چند توصیفی کلمات کا ڈھیر تصور کیا گیا لیکن حنیف نقوی نے اس بات پر زور صرف کیا کہ ہرگز ایسا نہیں ہے، بلکہ ان کے مطالعے اور بحث وتمحیص کی ضرورت ہے اور انھیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور ایسا کہنے میں وہ حق بہ جانب تھے تو ہم اپنی مشرقی روایت نقد ونظر کو کما حقہ نہیں پہچان سکتے یہی وجہ رہی کہ انھوں نے مشرقی تنقید کے الگ الگ ابعاد سے تذکراتی ادب کو جانچنے پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی روشنی میں تذکرہ کی ادبی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی مشکور ہے اور یہ بات بھی ثابت کی کہ تذکرے نہ صرف ہندوستانی ادب کے افہام وتفہیم میں مددگار ہیں بلکہ تاریخ ادب اردو کا جزو لاینفک ہیں اگر کوئی بھی تاریخ نگار ان کے بغیر ادب کی تاریخ لکھتا ہے تو اس کی ادبی تاریخ ادبی حلقوں میں کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

تذکراتی ادب کی تحقیق وتفتیش میں انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی ان کے عنوانات خود اس بات کے گواہ ہیں کہ انھوں نے اس میدان میں بہت سے نئے گوشے سر کیے ہیں۔ جس کا اندازہ ان کی تذکراتی تحقیق کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

■

Mohd Abdul Quadir
H. N.: 237, Gangan Wali Mainather
Near Pani ki Tanki
Moradabad -UP-244001
Mob.: 8882370711/941659868

اعجاز احمد شاہ

آزادی کے بعد اردو غزل کا بدلتا منظرنامہ

جدید اردو غزل کے مرکزی خیال اور اس کے اظہار کو جب قبولیت ملی تو اس کے اظہار میں تبدیلیاں آتی رہیں جو ادب میں ایک فطری عمل ہے۔یہ تبدیلیاں جدید غزل کے فکروفن میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں جدید غزل میں ہجرت اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا۔دہشت گردی اور فسادات نے جو تباہی مچائی اور خوف کا ماحول پیدا کردیا اس کی عکاسی بھی جدید غزل میں ملتی ہے اس کے علاوہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف جدید شعرا شدت سے احتجاج کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد سیاسی مسائل کی نوعیت وہ نہیں رہی تھی جن سے ترقی پسند تحریک کو زیادہ سروکار تھا۔ بدلتے حالات میں تخلیقی صلاحیت رکھنے والے شاعروں نے غزل کو نیا موڑ دینے کی کوشش کی۔ اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک کو فروغ ہوا۔ یہ ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کا فکری ردعمل تھا۔ جدیدیت کی تحریک کے نظریہ سازوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادیب کی وابستگی کسی دیے ہوئے سیاسی نظریے، کسی سیاسی گروہ کی اعلان شدہ پالیسی یا منشور سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہونی چاہیے۔ انھوں نے عصری آگہی پر زور دیا اور ادب برائے ادب کی تقلید کی۔ اس تحریک کے زیر اثر سیاسی مسائل کی جگہ عصر حاضر کے انسان کے وجودی مسائل نے لے لی۔ بعض جدید ادیبوں اور شاعروں نے ماضی کی ادبی روایات سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور شعر و ادب میں زبان اور فن کے نئے تجربے کیے۔ ان ہی تجربات و مشاہدات سے زندگی اور فن ترقی کے زینے طے کرتا گیا بقول رشید احمد صدیقی:

''میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں، تجربات میں شاعری کا نہیں، تجربہ کو تجربہ سمجھنا چاہیے الہام نہیں۔ فن اور زندگی دونوں میں جان تجربے سے آتی ہے۔ جو تجربے سے بھاگے یا تجربے میں مقید ہوگئے ان کا مستقبل کوئی نہیں۔ مستقبل کا شیدائی ہونا کوئی کارنامہ نہیں ہے، اہمیت دراصل مستقبل کے ماضی یا ماضی کے مستقبل کو حاصل ہے۔ بہ الفاظ دیگر حال ماضی کا مفسر اور مستقبل کا معمار ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری اولین اور بہترین توجہ کا مستحق ہے۔''

(جدید غزل از رشید احمد صدیقی، ایڈیشن 1974، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ ص38)

غزل کی زبان میں تبدیلیاں آئیں، نئے استعارے اور علائم وضع کیے گئے۔ جدید غزل کی ایک اہم شناخت یہ رہی کہ روایتی غزل کے مثالی عشق کی جگہ دور حاضر میں معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ عشق کی بدلتی ہوئی گونا گوں کیفیات اور واردات کو حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا جانے لگا۔ آل احمد سرور کے بقول:

''غزل اپنے طور پر زندگی کی واردات اور کیفیات پیش کرتی رہے گی۔ اس کی زبان میں خاموش تبدیلی رہے گی مگر اس کی ایمائی صلاحیت اور دروں بینی کی خصوصیت باقی رہے گی۔'' (اردو غزل از آل احمد سرور، اردو اکادمی دہلی، ص30)

اردو غزل ہماری زندگی اور تہذیب کے ساتھ چلتی رہی اور اپنے دور کے سیاسی اور سماجی نظریوں کی عکاسی کرتی رہی ہے۔ غزل امیر خسرو سے عصر حاضر تک برصغیر اور باہر کے تہذیبی مزاج کی ترجمانی کرتی رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔ غزل اظہار کے نت نئے اسالیب سے روشناس ہوئی۔ اس کے موضوع میں وسعت پیدا ہوئی۔ علامت اس کی شیرازہ بندی بن گئی۔ ناصر کاظمی کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

کچھ یادگار شہر ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

جدید اردو غزل کے مرکزی خیال اور اس کے اظہار کو جب قبولیت ملی تو اس کے اظہار میں تبدیلیاں آتی رہیں جو ادب میں ایک فطری عمل ہے۔ یہ تبدیلیاں جدید غزل کے فکروفن میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں جدید غزل میں ہجرت اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا۔ دہشت گردی اور فسادات نے جو تباہی مچائی اور خوف کا ماحول پیدا کردیا اس کی عکاسی بھی جدید غزل میں ملتی ہے اس کے علاوہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف جدید شعرا شدت سے احتجاج کرتے ہیں۔ اس رجحان کے نمائندہ

شعرانے ہر طرح کے فکری جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور زندگی کے تمام تر معمولات کو اپنے بیان کے دائرے میں سمیٹ لیا۔

جدید غزل ایک رجحان کی نمائندگی نہیں کرتی، نہ کسی خاص قسم کی کیفیت یا صفت میں قید ہے بلکہ ہر کسی موضوع اور رجحان میں اپنی انفرادیت رکھتی ہیں۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''جدید تر غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل پر آپ کسی قسم کا لیبل نہیں لگا سکتے۔ نہ کسی ایک صفت یا کیفیت کے دائرے میں اس کو مقید کر سکتے ہیں۔''

(رسالہ فنون لاہور، 1969 ص 66)

ابتدائی دور سے عصر حاضر تک غزل کے اسلوب، موضوع اور طرز بیان میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے۔غزل ایک ایسا فن ہے جس میں اختصار کے ساتھ حیات وکائنات کے رمز بیان ہوسکتے ہیں۔جہاں تک جدید غزل کی لفظیات کا سوال ہے، تو اردو زبان نے مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کیا ہے جن الفاظ کو شعرانے اپنے کلام کی زینت بنایا ہے جس سے شعرانے اپنے تجربات وحوادث کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالا بلکہ اردو زبان کے ڈکشن کو بھی وسعت بخشی ہے۔ 1960 میں رسالہ کتاب لکھنؤ میں بشیر بدر کا یہ شعر شائع ہوا۔

یہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

بشیر بدر کے اس انگریزی لفظ (Pullover) کو غزل میں لانے پر اکثر ادیبوں نے اعتراض کیا لیکن اس طرح الفاظ نئے تجربے کے ساتھ استعمال میں لائے گئے۔ چند ہی برس کے اندر اردو غزل میں ایسے بے شمار انگریزی کے الفاظ آگئے تھے جن کا اردو ہندی کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ خاص طور سے ایسے الفاظ مثلاً ٹکٹ، گلاس، اسکول اور فون وغیرہ یہ الفاظ عام بول چال کی ہندی اردو میں شامل ہو چکے تھے۔ اس عہد کے شعرانے انگریزی لفظ بڑے سلیقے سے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً

میں اتنا بدمعاش نہیں یعنی کھل کے بیٹھ
چبھنے لگی ہے دھوپ سویٹر اتار دے

(ظفر اقبال)

عربی، فارسی اور اردو کے جو کلیدی الفاظ کئی سو برس سے محفوظ تھے ان سے ناصر کاظمی اور ان کے بعد کے شاعروں نے دھیرے دھیرے جان بوجھ کر اجتناب کیا اور عام طور پر بولی جانے والی زبان میں غزل کہنے کی کوشش کی، یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔اس دور میں جن جدید غزل گو شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا ان میں اہم نام ناصر کاظمی، احمد مشتاق، ابن انشاء، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، بشیر بدر، احمد فراز، ندا فاضلی اور ظفر اقبال وغیرہ کے ہیں۔ ان شعرا کے ساتھ ساتھ چند شاعرا ایسے مل جاتے ہیں جن کی لفظیات بنیادی طور پر عربی فارسی کی نہیں بلکہ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی بول چال کی زبان کا حصہ تھیں مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

میرے کوٹ کا میلا کالر اور نمایاں ہوتا ہے
پاگل سج دھج رکھنے والے تیرے سامنے بیٹھے کون

(احمد ظفر)

سید نہ ریڈیو نہ سنیما ہے آپ کا
اپنے ہی گیت گایئے اور رقص کیجیے

(مظفر علی سید)

1960 کے بعد کی غزل میں صرف اداسی، سوگواری، مایوسی اور تنہائی کی مسلسل تکرار ہے جس میں زندگی کے تئیں کسی مثبت رویے کی امید شاذ و نادر ہی کی جاسکتی ہے مگر ادب کبھی ساکت نہیں رہتا۔جدید غزل کا رجحان مایوسی اور امید کا امتزاج بن کر ابھرتا ہے۔زندگی کی اشیا کے ساتھ مظاہر فطرت سے بھی مضبوطی کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کر رہی ہیں۔حالاں کہ مظاہر فطرت کے علائم کلاسیکی غزل میں بھی اتنی ہی شدت اور تکرار کے ساتھ ملتے ہیں جتنا جدید غزل میں، لیکن کلاسیکی علائم کا رشتہ ایک اجنبی سرزمین سے قائم تھا۔غزل کی جڑیں اپنے وطن کی مٹی سے سینچی گئی ہیں۔غزل میں احساس تنہائی تو ہے مگر یہ تنہائی نوحہ خوانی نہیں بلکہ خوابوں کا سرچشمہ ہے۔شہروں کی بے پناہ بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے انسان کی تنہائی کا ذکر غزل میں شدت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ان شعرا کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی یوں رقمطراز ہیں:

''داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعر کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج پر اظہار کرتا ہے جو جدید صنعتی دور، مشینی میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوشحالی کا عطیہ ہے۔جدید ادب گرتی ہوئی حیثیتوں، لڑکھڑاتے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیوں کے خوفناک احساس گم کردگی سے عبارت ہے۔''

(نئی نظم نظریہ و عمل از شمس الرحمان فاروقی، ص 126)

جدید غزل گو شعرا میں جو نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ان میں ناصر کاظمی، ابن انشا، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاد عارفی، منیر نیازی، احمد فراز، بشیر بدر، ظفر اقبال، ندا فاضلی، محمد علی تاج، اختر نظمی، ادا جعفری، فضل تابش،

میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں، تجربات میں شاعری کا نہیں، تجربہ کو تجربہ سمجھنا چاہیے الہام نہیں، فن اور زندگی دونوں میں جان تجربے سے آتی ہے، جو تجربے سے بھاگے یا تجربے میں مقید ہوگئے ان کا مستقبل کوئی نہیں، مستقبل کا شیدا ہی ہونا کوئی کارنامہ نہیں ہے، اہمیت دراصل مستقبل کے ماضی یا ماضی کے مستقبل کو حاصل ہے، بہ الفاظ دیگر حال ماضی کا مفسر اور مستقبل کا معمار ہوتا ہے،اس لیے ہماری اولین اور بہترین توجہ کا مستحق ہے۔

کشور ناہید، پروین شاکر، حمیر الرحمٰن اور کیف بھوپالی وغیرہ ہیں ان شعرانے غزل کے پرانے موضوعات کو نئی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا، جس سے غزل کی لفظیات میں بڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ پرانے استعارے کم ہوگئے اور نئے لفظوں سے نیا تخئیل بنا جو پرانے سے بھی مناسبت رکھتا ہے خاص طور سے ہندو پاک کے مقبول اور اہم شعرا میں احمد فراز، ناصر کاظمی، بشیر بدر، پروین شاکر اور ندا فاضلی وغیرہ کا جہاں ایک جانب اضطراب، بے چینی، بے یقینی، خود اذیتی اور تنہائی کا نام ہے وہیں آج کی غزل میں ان حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ہے۔امید اور اعتماد کی وہ کرن بھی جو جدید غزل کو قنوطیت کا شکار ہونے سے بچاتی ہے۔ زندگی کے معمولی واقعات، سرسری باتوں اور احساسات کو بھی ایک خوشگوار کیفیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جدید غزل کی علامتیں ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی

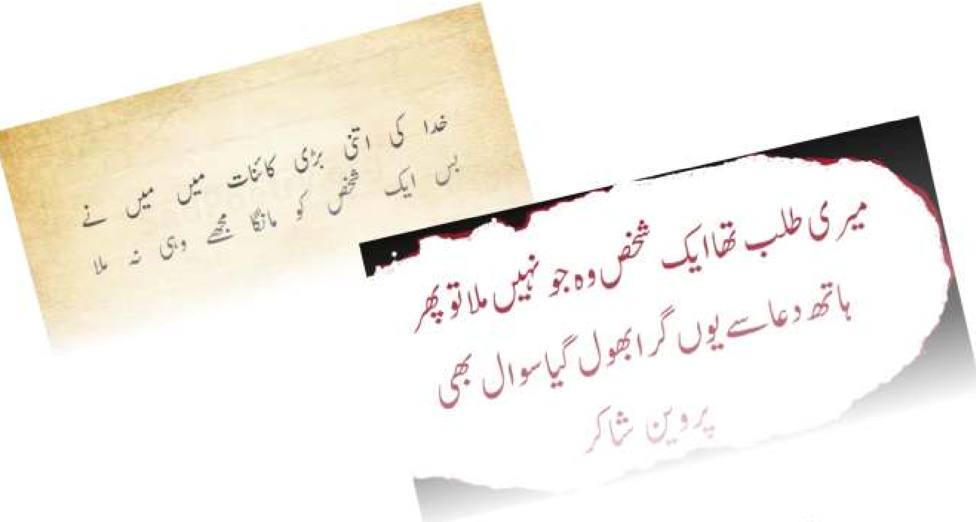

کلام ہندی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی اور سندھی رسم الخط میں چھپنے لگا ہے۔ ان کے علاوہ کئی شعرا کا کلام ہندی اردو میں تو عام طور پر مل ہی جاتا ہے اور شعرا ادب کے میدان میں سائنسی علوم کی آہٹیں محسوس کر رہے ہیں ہر جگہ پرانی چیزوں میں نیا پن تلاش کرنے اور ہر جگہ ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہر طرف کار ریل اور بسیں
اب سمندر میں گھر بناؤں کیا ؟
آج سنڈے ہے کل بھی چھٹی ہے
آسانوں میں گھوم آؤں کیا
(بشیر بدر)

ان مناظر میں بڑی جان سی پڑ جائے گی
سبز تاروں کو کرو چاند کو نیلا کردو
(پرکاش فکری)

ان شعرا حضرات کے علاوہ برصغیر میں شاعرات نے بھی غزل میں نسائی جذبات واحساسات کے ساتھ مرد سے الگ اپنے ایک وجود کا احساس دلایا۔ ان شاعرات میں پروین شاکر، کشور ناہید، ادا جعفری، عرفانہ عزیز، نجمہ تصدق، زہرہ نگاہ، نسیم نسرین، پروین فنا سید وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا
(پروین شاکر)

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں
(کشور ناہید)

آنا کسی کا آج بھی ممکن نہیں مگر
کیوں دیر سے سنگار کیے جارہی ہوں میں
(نسیم نسرین)

جدید غزل میں نئے شعرا عام فہم اور آسان لفظیات کے ساتھ نئے موضوعات لکھ رہے ہیں۔ جدید اردو غزل کے مطالعے کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کائنات کے رازوں اور فطرت کے حقائق کی تلاش کرتی ہے۔ اس دور کے غزل گو فطرت سے قریب تر ہونے کے لیے جو فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہیں اور پھر جس پرستارانہ عقیدت سے اس کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، اس کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ بہت عرصے تک انھیں فراق فطرت کے صدمے جھیلنے پڑے ہیں۔ جدید غزل قدیم کے مقابلے میں زیادہ خوشگوار، بشاش اور رجائی مستقبل ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ ابن انشا کا مشہور شعر ہے۔

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا

جدید اردو غزل کلاسیکی اردو غزل کے سرچشموں سے ہی سیرابی حاصل کرتی ہے۔ ناصر کاظمی، منیر نیازی، زیب غوری، احمد مشتاق، ظفر اقبال نے کلاسیکی غزل کے روابط سے جدید غزل کی آبیاری کی اور اسی لہجے اور آہنگ سے اپنی شاعری کے اسلوب کی انفرادیت قائم کی۔ ہماری کلاسیکی شعری روایت میں مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کی خاصی اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ شعر میں مضمون سے زیادہ شعر کی بندش، اس کی پیش کش، بیان میں ندرت، الفاظ کی نشست و برخاست، مصرعوں کے ربط اور کلام کا مربوط ہونا بھی اہم قرار دیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف شعرا اپنے شعر میں ادا کرتے ہیں بلکہ مضمون کو بہترین انداز میں ادا کرنے سے ہی شاعر کے اعلیٰ، اوسط، پست درجے کا تعین ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہماری شاعری میں صرف مضمون کو ہی اہم سمجھا جانے لگا تھا اور فن کی اہمیت کو نظر انداز کیا جانے لگا تھا۔ جدید شاعری نے فن کے انھی اصولوں کی پاسداری کی جس پر ہماری کلاسیکی شاعری کی بنیاد ہے۔ انھوں نے مختلف اسالیب ایجاد کیے، زبان کی ساخت کے ساتھ تجربے کیے اور اظہار کے نئے نئے رخ اختیار کیے۔ لیکن جدید شعرا کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری جو اپنی روایت کو فراموش کر چکی تھی اسے پھر اپنی روایت کی طرف متوجہ کیا اور اس طرح ہماری جدید شاعری نے کلاسیکی سرچشموں سے سیرابی حاصل کی۔ جدید غزل سے متعلق بحث کرتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں:

''احساس کی کیفیاتی تبدیلی جو نئے عہد کے تقاضوں کے لحاظ سے فطری ہے، جدت اور شخصی اپج، ایجاد کی خواہش اور کوشش جو ہر فن کار میں پائی جاتی ہے (کامیاب ہونے نہ ہونے کی بات اور ہے) غزلوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس کا مرکزی اور بنیادی نقطہ وہی رہتا ہے جو غزل کی روایت نے بنا لیا ہے اور ہر غزل گو آج بھی پلٹ پلٹ کر اس جگہ آجاتا ہے۔''

(جدید غزل چند اشارے از احتشام حسین، فنون غزل نمبر 1969، ص 25)

غزل کی ساخت اور اس کی ہیئت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن غزل کے روایتی موضوعات میں بدلاؤ بہت تیزی سے آیا۔ اکثر شعرا نے تغزل کے انتشار، معاشی بدحالی، تشدد فساد، بدامنی، گندی سیاست، غربت افلاس اور معاشی عدم توازن کو جگہ دی۔ اس طرح موضوعات قدیم شعرا کے یہاں کم ہی ملتے ہیں لیکن جدید شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتے ہیں۔ زمانہ جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے غزل نے بھی زندگی کے ہر تجربے کو غزلیہ بنالیا ہے۔

الغرض زندگی کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تغیر رونما ہوتا ہے۔ اردو غزل میں ولی، غالب سے لے کر فراق گورکھپوری اور جدید دور کے غزل گو ناصر کاظمی، ابن انشا، احمد فراز اور اسی دور میں چند سال بعد بشیر بدر اور ندا فاضلی کی غزلوں نے ثابت کردیا کہ زندگی کے مسائل سب جگہ ایک ہیں۔ پھر بھی زندگی مسلسل رواں دواں رہتی ہے۔ ہر دور میں شعرا نے غزل میں نئے رنگ وآہنگ اور نئے خیالات سے غزل کی دنیا بدل دی ہے۔ جدید شعرا نے غزل میں انگریزی کے سیکڑوں الفاظ شامل کر لیے کیوں کہ وہ بول چال کی زبان میں روانی سے استعمال کیے جارہے تھے۔ اردو نثر و نظم میں انگریزی کے الفاظ کو سرسید اور حالی نے رائج کیا تھا۔ اس کے بعد اکبر الہ آبادی نے اپنی طنزومزاحیہ نظموں میں انگریزی الفاظ استعمال کیے۔ قدیم اردو غزل کی طرح جدید غزل کو بھی اپنی ہیئت بدلنے یا اپنی بحروں اور اصولوں سے باہر آنے کی نہ اجازت تھی نہ ضرورت ہے لیکن (Change is the law of nature) تغیر قدرتی عمل ہے۔ غزل کی خصوصیت و امتیاز روانی اور شیرینی بھی چاہتی ہے اور اپنی ہیئت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

■

Ejaz Ahmad Shah
Research Scholar,
Central University of Kashmir
Gandarbal- 191201
Mob.:9622765525

سید عاصم سہیل

طلبہ تعلیمی تناؤ کے نرغے میں

> جس طرح تعلیم اپنی فلسفیانہ اور سماجی تعبیر سے دور ہوئی اس نے طلبہ کی زندگی کو بہت منفی طور پر متاثر کیا ہے۔ اس مقابلہ آرائی کے ماحول میں جن طلبہ کی تعمیر ہو رہی ہے ان کی بڑی تعداد جس نفسیاتی و ذہنی خلفشار میں بہت تیزی سے مبتلا ہو رہی ہے وہ 'اکیڈمک ڈسٹریس' ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں علم، تعلیم اور تعلیمی اداروں کی ایک فلسفیانہ اور سماجی تعبیر رہی ہے۔ لمبے عرصے تک ہندوستان میں تعلیم کو انسان کی تعمیر اور اس کی ترقی کا ذریعہ باور کیا جاتا رہا۔ مہاتما گاندھی نے آزادی سے قبل تعلیم کا جو نظریہ پیش کیا، جسے بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی، اس کے پیش نظر یہی تھا کہ انسان کی ترقی ہو کیونکہ انسان کی ترقی میں ہی سماج کی ترقی ہے۔ تعلیم کے اس تصور میں انسان کی ہمہ جہت ترقی کی بات کی گئی تھی، جس کا ووکیشنل ڈیولپمنٹ بھی ایک حصہ تھا۔ آزادی کے بعد ملک میں جو تعلیمی پالیسیاں بنیں، ان میں بھی اسی فلسفۂ تعلیم کو پیش نظر رکھا گیا۔ مثال کے طور پر سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن ہو یا کوٹھاری کمیشن دونوں جہاں ایک جانب بہتر شہری کی تعمیر اور سماج کی ترقی پر فوکس کرتے ہے وہیں ووکیشنل ایجوکیشن کے فروغ کی بھی وکالت کرتے ہیں۔

البتہ اس تصور میں بنیادی انقلاب اس وقت آیا جب 1991 میں Liberalisation کی پالیسی اختیار کی گئی، جس نے نج کاری کو تیزی سے فروغ دیا اور انسانی زندگی پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ بازار میں مقابلہ آرائی شروع ہوئی، بیرون ممالک سے کمپنیاں ہندوستان آئیں اور ہندوستان دنیا کے نقشے پر ایک ایسے ملک کے طور پر ابھرا جہاں بآسانی کم خدشات کے ساتھ Investment کیا جا سکتا تھا۔ اس پورے عمل نے تعلیمی نظام کو بری طرح متاثر کیا۔ نتیجتاً 'بازار کی تعلیم' (Education of Market) کے ساتھ ساتھ 'تعلیم کا بازار' (Market of Education) بھی وجود میں آیا۔ بڑی تعداد میں نجی تعلیمی ادارے شروع ہوئے اور بازار کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکل ڈیولپمنٹ کورسز اور پروفیشنل کورسز کی جانب رجحان بڑھا۔[1]

اس کا نتیجہ آج نئی تعلیمی پالیسی میں صاف طور پر نظر آرہا ہے، جہاں ووکیشنل ایجوکیشن کو اسکول ایجوکیشن سے جوڑنے کی بات کی جارہی ہے۔ اسکل انڈیا مشن (SIM) جیسے پروگرام چلائے جا رہے ہیں، جن کا واحد مقصد اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک کے طلبہ کو Industries کی ضروریات کے تحت ورک فورس میں تبدیل کر دینا ہے۔ بازار، پورے تعلیمی نظام کا مرکز بن گیا ہے جس کے پیش نظر طلبہ بھی ایسے کورسز کا انتخاب کر رہے ہیں جو روزگار سے جڑے ہوں۔ طلبہ کی کثیر تعداد پروفیشنل اور ووکیشنل کورسز کی جانب متوجہ نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کورسز میں دیگر میدانوں کے بالمقابل اندراج کی شرح بہت زیادہ ہے۔ ان کورسز میں اندراج کی بہتات کے باعث بے تحاشہ مسابقت پیدا ہوگئی ہے۔

ہمارا ماننا ہے کہ اس پورے عمل میں سب سے زیادہ نقصان طلبہ کا ہوا۔ جس طرح تعلیم اپنی فلسفیانہ اور سماجی تعبیر سے دور ہوئی، اس نے طلبہ کی زندگی کو بہت منفی طور پر متاثر کیا ہے۔ اس مقابلہ آرائی کے ماحول میں جن طلبہ کی تعمیر ہو رہی ہے ان کی بڑی تعداد جس نفسیاتی و ذہنی خلفشار میں بہت تیزی سے مبتلا ہو رہی ہے وہ 'اکیڈمک ڈسٹریس' ہے۔ مختلف مطالعات سے انکشاف ہوا ہے کہ اس مسئلے سے دوچار طلبہ کی کثیر تعداد ہائی اسکول، ٹیکنیکل کورسز اور مسابقتی امتحانات جیسے NEET اور JEE کے طلبہ کی ہے، بحیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ پروفیشنل اور ووکیشنل ایجوکیشن حاصل کر رہے طلبہ سب سے زیادہ تعلیمی تناؤ کا شکار ہوتے ہیں۔

مسئلے کی حساسیت

طلبہ کسی بھی ملک کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں، وہ کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے

ہیں۔ تشویشناک پہلو یہ ہے کہ پچھلے کافی وقت سے اس نہایت قیمتی اثاثے کو اکیڈمک ڈسٹریس کی دیمک کھوکھلا کر رہی ہے۔ جن طلبہ سے کسی خاندان کا، سماج اور ملک کا حال اور مستقبل وابستہ ہے وہ ذہنی و نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہیں۔ 2021 میں یونیسیف کے ذریعے انجام دیے گئے سروے کے مطابق، ہندوستان میں 15 سے 24 سال کے درمیان ہر سات میں سے ایک نوجوان کی مینٹل ہیلتھ متاثر پائی گئی ہے جن میں ڈپریشن، اضطراب یا عدم دلچسپی کے احساسات نمایاں طور پر نوٹ کیے گئے ہیں۔[2] حد تو یہ ہے کہ سال 2020 اور 21 میں طلبہ کی خودکشی کے حادثات کسانوں کی خودکشی کے اعداد و شمار سے بھی بڑھ گئے ہیں۔[3] نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کے مطابق 2020 میں، ہر 42 منٹ میں ایک طالب علم نے اپنی جان لی۔ یعنی ہر روز 34 سے زائد طلبہ خودکشی کر کے ہلاک ہوئے۔[4] عالمی سطح پر پچھلی کئی دہائیوں سے نفسیاتی مسائل میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے بالخصوص کووڈ-19 وبا کے بعد۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کی رپورٹ کے مطابق کووڈ-19 کی وجہ سے دنیا بھر میں اضطراب (Anxiety) اور ڈپریشن میں بالترتیب 26 فیصد اور 28 فیصد اضافہ ہوا ہے۔[5]

طلبہ میں تیزی سے بڑھتا خودکشی کا رجحان اکیڈمک ڈسٹریس کی انتہا ہے۔ ایمائل ڈرکھائم جو ایک فرانسیسی ماہر سماجیات ہیں، ان کے مطابق خودکشی میں حد سے زیادہ اضافہ سماج میں پائے جانے والے انتشار اور اجتماعی ضمیر کی کمزور ہوتی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ خودکشی کے تناسب میں حد درجہ تیزی ڈرکھائم کے مطابق ایک 'ایب نارمل' ہوتی صورت حال کا مظہر ہے۔[6] جو معاشرے کو کمزور اور کھوکھلا کرنے والی قوتوں کے متحرک و مضبوط بننے کی علامت ہے، یہ صورت حال ہمارے سماج کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

عموماً سماج اس وقت بیدار ہوتا ہے جب کسی مسئلے یا بحران کے سنگین نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان مراحل کو نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے جن سے گزر کر کسی مسئلے یا بحران کے سنگین نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ اکیڈمک ڈسٹریس کا سنگین انجام خودکشی ہے اس لیے اس پر شائع ہونے والی خبریں اور رپورٹس موضوع بحث بنتی ہیں۔ لیکن خودکشی سے پہلے کے وہ بہت سے مراحل جو کسی طالب علم کو ذہنی و نفسیاتی خلفشار میں مبتلا کرتے ہیں نیز وہ متعدد کیفیات جن سے ایک طالب علم دوچار رہتا ہے، سماج ان کا نوٹس تک نہیں لیتا چہ جائے کہ ان کے تدارک کی کوشش کی جائے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اکیڈمک ڈسٹریس کے باعث پیدا ہونے والے مسائل، دشواریوں اور کیفیات کا جائزہ لیا جائے، ڈسٹریس کی مختلف نوعیتوں کو سمجھا جائے اور اسی طرح ڈسٹریس کے اسباب و ذرائع کا نوٹس لیا جائے جو بظاہر معمولی ہی نظر آتے ہوں لیکن ایک طالب علم کی تعلیمی کارکردگی کو متاثر کرتے ہیں۔ اس مضمون میں فیلڈ اسٹڈی اور لٹریچر کے ذریعے سامنے آنے والے چند اہم نتائج و مباحث کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

طلبہ تعلیمی تناؤ کے زیر اثر

اس مسابقتی دنیا میں، طلبہ کو مختلف تعلیمی مسائل و رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کے لیے نفسیاتی الجھنوں کا سبب بنتے ہیں۔ جن میں امتحان کا تناؤ، ناکامی کے امکان کا خوف، کلاس میں شرکت کی عدم دلچسپی اور کسی مضمون کو نہ سمجھ پانا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تعلیمی تناؤ طلبہ کے اردگرد کے ماحول میں بہت سی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے: اسکول میں، گھر میں، ان کے دوستانہ تعلقات میں اور یہاں تک کہ ان کے پڑوس میں۔ اکیڈمک ڈسٹریس یا تعلیمی تناؤ میں وہ تمام متحرکات (Triggers) شامل ہیں جو طلبہ کے لیے کسی نہ کسی درجے میں ٹینشن کا سبب بنتے ہیں، ان محرکات کو 'Stressors' کہا جاتا ہے۔ یہ محرکات شخصی، غیر شخصی، سماجی، صحت، ماحول کسی سے بھی متعلق ہوسکتے ہیں جو تعلیمی اداروں میں کسی طالب علم کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ اگر اس بے لگام اکیڈمک ڈسٹریس پر قابو نہ پایا جائے تو پھر اس کے سنگین اثرات نفسیاتی، جذباتی اور جسمانی صحت پر مرتب ہوسکتے ہیں۔[7] مختصر الفاظ میں تعلیمی تناؤ سے مراد وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو کسی تعلیمی ماحول میں بیرونی طور پر یا خود مسلط کردہ تناؤ سے پیدا ہوتی ہے، جو ایک طالب علم کی تعلیمی کارکردگی میں تنزلی کا باعث بنتی ہے۔ تنزلی سے آگے بڑھ کر بعض ماہرین اکیڈمک اسٹریس کو Career stopper کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔[8]

تناؤ کی نفسیاتی تفہیم

جیسا کہ ہم جانتے ہیں Stress طبعیات کی معروف اصطلاح ہے۔ نفسیات میں باقاعدہ سب سے پہلے 1936 میں ہنس سیلیے نے اس اصطلاح کو متعارف کروایا تھا۔ ان کے مطابق ''تبدیلی کے کسی بھی مطالبے پر جسم کا غیر مخصوص ردعمل'' تناؤ کہلاتا ہے۔[9] ویسے ہم میں سے ہر ایک اپنی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تناؤ سے جوجھ رہا ہوتا ہے۔ درحقیقت تناؤ نفسیاتی یا اعصابی بوجھ یا بے چینی کا ایک احساس ہے جو طویل وقت کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور قلیل وقت کے لیے بھی۔

تناؤ قلیل وقت یا طویل وقت کے لیے محسوس ہوسکتا ہے۔ قلیل وقت کے لیے محسوس ہونے والا تناؤ Acute Stress کہلاتا ہے، جس پر فکرمندی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ ہماری کارکردگی میں اضافے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ جو عموماً سستی، کاہلی اور بے زاری سے جان چھڑوا کر ہمیں متحرک بنا سکتا ہے۔ اس مثبت تناؤ کے لیے 'Eustress' کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ مثبت تناؤ اس وقت رونما ہوتا ہے جب کوئی شخص تناؤ والے عناصر کو مثبت سمجھے۔ جب کہ طویل وقت کے لیے محسوس ہونے والے تناؤ کو Chronic Stress کہتے ہیں، جو جسمانی و نفسیاتی لحاظ سے مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔ اس منفی تناؤ کے لیے 'Distress' کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ ایسے میں جب ہم تعلیمی تناؤ کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد طویل مدتی تناؤ ہے، جو نوعیت کے لحاظ سے منفی ثابت ہوتا ہے۔

تعلیمی تناؤ سے مراد وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو کسی تعلیمی ماحول میں بیرونی طور پر یا خود مسلط کردہ تناؤ سے پیدا ہوتی ہے، جو ایک طالب علم کی تعلیمی کارکردگی میں تنزلی کا باعث بنتی ہے۔ تنزلی سے آگے بڑھ کر بعض ماہرین اکیڈمک اسٹریس کو Career stopper کے طور پر بھی پیش کرتے ہے۔

تناؤ کا سماجیاتی رُخ

جس طرح تناؤ کا ایک نفسیاتی پہلو ہے ویسے ہی اس کا سماجیاتی رخ بھی ہے، ہماری اس اسٹڈی میں اسی سماجیاتی رخ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سماجیاتی رخ دراصل اس بات کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح سماجی عوامل اور سماجی ڈھانچہ افراد اور برادریوں کے اندر تناؤ کے تجربے، مظاہر اور نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ذیل میں اس حوالے سے چند پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

* **تناؤ کے سماجی ڈٹرمینٹس:** سماجی نقطہ نظر اس بات پر زور دیتا ہے کہ تناؤ صرف ایک فرد کا داخلی تجربہ نہیں ہے بلکہ اس کی تشکیل Social Determinants سے ہوتی ہے۔ جس میں سماجی و اقتصادی حیثیت، جنس، نسل، پیشہ وغیرہ شامل ہیں۔ عدم مساوات، امتیازی سلوک اور سماجی محرومی پسماندہ گروہوں میں تناؤ کی سطح میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔[10]

* **سوشل اسٹریسرس:** سماجیاتی تحقیق افراد کے تناؤ کی سطح پر سوشل اسٹریسرس کے اثرات کو نمایاں کرتی ہے۔ ان اسٹریسرس میں بے روزگاری، غربت، غیر مستحکم رہائش، امتیازی سلوک، ارد گرد میں تشدد، خاندانی تنازعات اور سماجی اکیلا پن (Isolationsocial) شامل ہو سکتے ہے۔

* **سماجی معاونت:** تناؤ کے منفی اثرات کم کرنے میں سوشل سپورٹ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مضبوط سماجی سپورٹ سسٹم افراد کو تناؤ سے نمٹنے اور ابھرنے کی قوت (Resilience) بڑھانے میں مدد کر سکتا ہے۔

* **سماج کاری اور سماجی تعلیم:** سماجیاتی اپروچ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح افراد سماج کاری کے عمل کے ذریعے تناؤ کے ردعمل کو سیکھتے اور Internalize بناتے ہیں۔ خاندانوں، برادریوں، اور وسیع تر سماجی ڈھانچے کے اندر سماج کاری افراد کی تناؤ سے متعلق سمجھ اور اسے مؤثر طریقے سے مینیج کرنے کی صلاحیت پروان چڑھاتی ہے۔[11]

* **سماجی کردار اور توقعات:** بحیثیتِ والدین، بحیثیتِ کارکن، یا بحیثیتِ طالب علم جو بھی کردار ہم ادا کرتے ہیں ان کے ساتھ متعدد ذمے داریاں اور مطالبات بھی وابستہ ہوتے ہیں جو تناؤ کا باعث بن سکتے ہیں۔ صنفی کردار اور ثقافتی حد بندیاں بھی تناؤ کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔[12]

* **ساختی تناؤ:** سماجیاتی نقطۂ نظر اس بات کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ کس طرح سماجی ڈھانچے اور ادارے ساختی تناؤ میں حصہ ڈالتے ہیں۔ معاشی عدم مساوات، بے روزگاری کی شرح، ناکافی ہیلتھ کیئر سسٹم، اور تعلیمی تفاوت جیسے عوامل افراد اور طبقات کے لیے دائمی تناؤ (Chronic stress) پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ ساختی تناؤ اکثر فرد کے کنٹرول سے باہر ہوتے ہیں اور ان میں نظام کی تبدیلی کے لیے اجتماعی کارروائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔[13]

تعلیمی تناؤ کے ذرائع و عوامل

طلبہ کی تعلیمی کارکردگی پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو دو حصوں میں درجہ بند کیا جا سکتا ہے۔ ایک اندرونی عوامل اور دوسرے بیرونی عوامل۔

اندرونی عوامل: اندرونی عوامل کو ذاتی عوامل بھی کہا جاتا ہے اور ان عوامل کا تعلق فرد کے اندرون سے ہوتا ہے۔ ہماری فیلڈ اسٹڈی سے اکیڈمک ڈسٹریس کے 5 ذاتی عوامل سامنے آئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

”

عموماً انڈر گریجویٹس عمر کے لحاظ سے کم پختہ ہوتے ہیں اور نفسیاتی لحاظ سے حساس بھی، ایسے میں اس کچی عمر میں وہ بہ آسانی اکیڈمک ڈسٹریس کا سافٹ ٹارگیٹ بن جاتے ہیں۔ عموماً پختہ عمر میں تناؤ کو مینیج کرنے کی کچھ اہلیت پروان چڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے تناؤ تعلیمی عمل میں مثبت کردار بھی ادا کر سکتا ہے، یا اگر مثبت نہ صحیح تو کم از کم اس قدر منفی تو نہیں ثابت ہو سکتا ہے۔ فیلڈ اسٹڈی میں سامنے آیا ہے کہ اکیڈمک ڈسٹریس کی وجہ سے نصف سے زائد طلبہ کی ذہنی صحت، مزاج اور رویے میں تبدیلی، روز مرہ کے معمولات حتیٰ کہ ان کی جسمانی صحت تک منفی طور پر متاثر ہوتی ہے۔

“

(1) **ناکامی کا خوف:** امتحان سے متعلق خوف عموماً طلبہ میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر مختلف مسابقتی امتحانات کی تیاری کر رہے طلبہ میں یہ خوف بہت زیادہ ہوتا ہے، اس خوف کی بڑی وجہ مختلف خدشات ہوتے ہیں کہ اگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ کیے تو تیاری میں لگایا گیا طویل وقت، محنت اور سرمایہ سب کچھ ضائع ہو سکتا ہے۔

(2) **باہمی مشکلات:** طلبہ کو تعلیمی مصروفیات کے باعث دوسروں کے ساتھ تعامل اور تعلقات میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عموماً طلبہ کوچنگ کی مصروفیت کے باعث سماج سے isolate ہونے لگتے ہیں۔ امتحان کی تیاری کا پریشر اور وقت کے تقاضے خاندان، دوستوں، یا پڑوسیوں کے ساتھ اکثر محدود سماجی تعاملات اور کشیدہ تعلقات کا باعث بن جاتے ہیں وہ اس مصروفیت میں سوشلائز نہیں ہو پاتے۔

(3) **ٹائم مینجمنٹ کی کمی:** چونکہ عموماً ٹیکنیکل اور پروفیشنل کورسز میں سمسٹر پیٹرن ہوتا ہے، جس کی وجہ سے کم مدت ہی میں نصاب مکمل ہونے سے پہلے امتحان سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ عموماً طلبہ مشکل مضامین کے لیے کوچنگ جوائن کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ایسے میں ان پر ایک جانب نصاب کا دباؤ ہوتا ہے وہیں وہ اسکول یا کالج اور کوچنگ کے درمیان جوجھتے ہیں اور ذاتی مطالعے کے لیے وقت فارغ نہیں کر پاتے۔ اس میں مزید مصیبت موبائل اور سوشل میڈیا پیدا کر دیتا ہے، جس کے باعث طلبہ عدم توجہی کا شکار بن جاتے ہیں۔

(4) **ہائی اسٹڈی لوڈ:** طلبہ کو طویل نصاب اور امتحان کی مسابقتی نوعیت کی وجہ سے اکثر بہت زیادہ اسٹڈی لوڈ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نصاب وسیع ہوتا ہے، وقت ہوتا ہے، ایسے میں طلبہ تیاری اور مسلسل مشق کے لیے وقت فارغ نہیں کر پاتے اور پڑھائی کے لوڈ سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

(5) **تیاری کی کمی:** اس سے مراد امتحان کے لیے ناکافی تیاری یا ناکافی مطالعہ ہے۔ یہ مسئلہ اصل سبب نہیں ہے بلکہ یہ دوسرے عوامل سے پیدا ہونے والا مسئلہ ہے۔ ٹائم مینجمنٹ کی کمی، اسٹڈی کا معمول (Routine) بنانے میں کوتاہی، اسٹڈی کی غیر مؤثر تکنیک یا امتحان فارمیٹ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے تیاری متاثر ہو سکتی ہے۔ ناکافی تیاری کی وجہ سے اعتماد کی سطح کم ہوتی ہے جس کا راست اثر امتحان میں کارکردگی پر ہوتا ہے۔

ہماری فیلڈ اسٹڈی میں یہ بھی انکشاف ہوا کہ ان مسائل کی ایک بڑی وجہ مسلم طلبہ کا کریئر سے متعلق کمزور فیصلہ ہے۔ مسلم طلبہ میں کریئر کاؤنسلنگ کا رجحان شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ ان میں کریئر کے حوالے سے مقصدیت کا فقدان نظر آیا۔ بعض طلبہ خوابوں کی دنیا ہی سے باہر نہیں آ پاتے تو بعض بس سماج کی خدمت کا خیالی مقصد لے کر اس گھماسان میں اتر جاتے ہیں۔

عموماً انڈر گریجویٹس عمر کے لحاظ سے کم پختہ ہوتے ہیں اور نفسیاتی لحاظ سے حساس بھی، ایسے میں اس کچی عمر میں وہ بہ آسانی اکیڈمک ڈسٹریس کا سافٹ ٹارگیٹ بن جاتے ہیں۔ عموماً پختہ عمر میں تناؤ کو مینیج کرنے کی کچھ اہلیت پروان چڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے تناؤ تعلیمی عمل میں مثبت کردار بھی ادا کر سکتا ہے، یا اگر مثبت نہ صحیح تو کم از کم اس قدر منفی تو نہیں ثابت ہو سکتا ہے۔ فیلڈ اسٹڈی میں

سامنے آیا ہے کہ اکیڈمک ڈسٹریس کی وجہ سے نصف سے زائد طلبہ کی ذہنی صحت، مزاج اور رویے میں تبدیلی، روز مرہ کے معمولات حتی کہ ان کی جسمانی صحت تک منفی طور پر متاثر ہوئی ہے۔

عمر کے اس نازک و اہم موڑ پر طلبہ کو سماجی سپورٹ کی سخت ضرورت پیش آتی ہیں۔ مختلف طلبہ سے گفتگو کے دوران یہ بھی واضح ہوا کہ وہ ان مسائل کو والدین سے اس بنا پر شیئر نہیں کر پاتے کہ والدین ان جدید مسائل کی زیادہ سمجھ نہیں رکھتے اس لیے وہ ان معاملات میں کوئی تعاون نہیں کر پاتے ہیں۔ ایسے میں والدین کو بھی ایجوکیٹ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ان نفسیاتی مسائل میں اپنے بچوں کو کس طرح سپورٹ فراہم کریں۔

بیرونی عوامل: یہ عوامل فرد کی ذات سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ فرد کے اردگرد موجود ہوتے ہیں۔ ہماری فیلڈ اسٹڈی سے اکیڈمک ڈسٹریس کے 4 بیرونی عوامل سامنے آئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(1) والدین کی توقعات اور پریشر: والدین کی توقعات بچوں کے لیے ایک اہم محرک ثابت ہوتی ہیں۔ والدین کا اپنے بچوں سے امیدیں وابستہ کرنا کوئی غیر فطری عمل نہیں ہے چونکہ وہ ان کے بہتر مستقبل کے لیے فکر مند ہوتے ہیں اور اس مہنگی تعلیم کے دور میں اپنا قیمتی سرمایہ بھی خرچ کرتے ہیں اس لیے وہ بہتر نتائج کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن جب والدین حد سے زیادہ دخل اندازی (Overinvolvement) کرنے لگتے ہیں اور غیر حقیقی توقعات وابستہ کرنے لگتے ہیں تب بچوں کے لیے مصیبت کا باعث بنتے ہیں۔ بعض والدین جبراً اپنی خواہشات کو بچوں پر تھوپتے ہیں اور ان کی پسند اور دلچسپی کا لحاظ رکھے بغیر ان کے کریئر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے اپنی استعداد اور زمانے کی ضروریات کا خیال رکھے بغیر کریئر متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے میں والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اعتماد میں لے کر انہیں صحیح رہنمائی کریں۔ فیلڈ اسٹڈی سے معلوم ہوا کہ طلبہ کی اکثریت کے مطابق بیرونی عوامل میں سب سے زیادہ تعلیمی تناؤ کا سبب والدین کی توقعات اور پریشر ہے۔

(2) اسٹڈی کی ناکافی سہولت: کمزور معاشی پس منظر سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے مطابق دوسرا بڑا بیرونی عامل اسٹڈی کی ناکافی سہولیات ہے۔ یہ ناکافی سہولیات طلبہ کی پڑھائی میں رکاوٹ بنتی ہیں جس کے باعث ان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ ناکافی سہولیات جیسے اسٹڈی کے لیے معیاری مواد یا نصابی کتب کا فقدان، یا آن لائن وسائل تک رسائی کی کمی طلبہ کی بڑے پیمانے پر نصاب کا احاطہ کرنے کی صلاحیت کو محدود کر سکتی ہے۔ مزید برآں، اسٹڈی کے لیے مناسب و پرسکون ماحول کی دستیابی نہایت ضروری ہے۔ ان سہولیات کی عدم دستیابی کی وجہ سے طلبہ کو ارتکاز اور فوکس کا مسئلہ پیش آتا ہے۔

(3) پسندیدگی اور تعصب: عموماً پسندیدگی (Favouritism) کا مسئلہ اسکولی سطح پر زیادہ پیش آتا ہے۔ بعض اساتذہ امتحان میں نمبر دینے، حوصلہ افزائی کرنے اور مواقع فراہم کرنے میں جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دیگر طلبہ میں ناانصافی اور احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ جس کا راست اثر ان کی ذہنی صحت اور تعلیمی کارکردگی پر پڑتا ہے۔ اسی طرح تعصب یا امتیازی سلوک (Discrimination) ان اداروں یا کوچنگ سینٹرز پر پیش آسکتا ہے جہاں مختلف مذاہب یا ذاتوں کے طلبہ پڑھائی کرتے ہوں۔ امتیازی سلوک راست طور پر کریئر کے امکانات کو متاثر کرسکتا ہے۔ پسندیدگی اور امتیازی سلوک کی وجہ سے کلاس روم کا ماحول متاثر ہوتا ہے جہاں محروم طلبہ گھٹن اور خود کو خارج یا حاشیے پر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ جب طالب علم اور استاد کے درمیان تعلق آلودہ ہو جائیں تو نقصان کسی اور کا نہیں صرف طالب علم کا ہوتا ہے اور یوں اس کی ہمہ جہت تنزلی کا باعث بنتا ہیں۔

(4) حکومت کی ذمے داری: ہم دیکھتے ہیں کہ نولبرل ازم کے عروج نے نوجوانوں کو اپنے 'خوابوں کی نوکری یا کریئر' سے محرومی یا ناکامی کے لیے خود کو مورد الزام ٹھہرانے پر مجبور کیا ہے جبکہ اس معاملے میں ذاتی مسائل و کمزوریوں سے ہٹ کر ایک مرکزی وجہ ساختی نظام ہے۔ 14 حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ مواقع کی فراہمی کو یقینی بنائے۔ لیکن حکومت اس معاملے میں کوتاہ ثابت ہوئی ہے، اس حوالے سے صرف ایک مثال پیش ہے؛ اندراج کے لحاظ سے نیٹ ہندوستان کا سب سے بڑا مسابقتی امتحان بن چکا ہے۔ امسال 20 لاکھ 38 ہزار طلبہ نے نیٹ امتحان دیا تھا۔ جن میں سے 11 لاکھ 45 ہزار کولیفائے ہوئے۔ 15 پورے ہندوستان میں سرکاری و غیر سرکاری تمام میڈیکل کالجز میں صرف 1 لاکھ 70 ہزار Seats ہیں۔ 16 صرف سرسری نگاہ ہی سے دیکھا جائے تو یہ Seats کل کولیفائے کرنے والے طلبہ کا صرف 15 فیصد ہے۔ یعنی کل کولیفائے کرنے والے طلبہ میں سے صرف 15 فیصد ہی کے لیے حکومت Seat مہیا کرا سکتی ہے، کولیفائے کرنے والے بقیہ 9 لاکھ 75 ہزار طلبہ Repeat کرنے یا اخراج کرنے یا تعلیم چھوڑنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہوتا۔

ان کے علاوہ بھی کئی اور اندورنی و بیرونی عوامل ہو سکتے ہیں لیکن مطالعات سے سامنے آنے والے یہ چند نمایاں عوامل ہیں جو عموماً طلبہ کی بڑی تعداد کو متاثر کرتے ہیں اور ان میں اکیڈمک ڈسٹریس کے اہم عامل کے طور پر کردار ادا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1 مقال: مارکیٹائزیشن آف ہائر ایجوکیشن، الیکس پی جوسیف، جرنل آف ایمرجنگ ٹیکنالوجیز (jetir.org)، اگست 2018
2 رپورٹ: یونیسیف، دی اسٹیٹ آف دی ورلڈز چلڈرن، 2021
3 رپورٹ: این سی آر بی، ایکسیڈینٹل ڈیتھس اینڈ سوسائیڈز ان انڈیا، 2020-21، ص 203-04
4 رپورٹ: این سی آر بی، 2020-21
5 رپورٹ: مینٹل ہیلتھ اینڈ کووڈ 19، ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO)، مارچ 2022
6 کتاب: کلاسیکی سماجیاتی نظریات از ڈاکٹر سید میو
7 مقال: ریویو اکیڈمک اسٹریس امنگ فیکلٹی اینڈ اسٹوڈنٹس ان ہائر انسٹی ٹیوشن، جرنل آف ہیومینیٹیز اینڈ سوشل سائنسیز، اگست 2020، ص 1055-1064
8 مقال: اسٹریسرس آف اکیڈمک اسٹریس، انڈین جرنل آف سائنٹفک ریسرچ، 3(1)، 2012، ص 171 تا 175
9 کتاب Stress without Distress از ہنس سیلے (Hans Selye)، 1974، ص 27
10 مقال: اسٹریس امنگ سینئر سیکنڈری اسکول اسٹوڈنٹس اینڈ اٹس ڈٹرمینینٹس، انٹرنیشنل جرنل آف اپلائیڈ ریسرچ، 2021(7)، ص 401 تا 406
11 آنلائن پلیٹفارم: کورا (quora.com)، ڈینیلا پورٹ مین (Daniella Portman)، 26 اپریل 2023
12 مقال: دی سوشولوجیکل اسٹڈی آف اسٹریس، لیونارڈ ویئر لائن، جرنل آف ہیلتھ، ستمبر 1989، ص 241 تا 256
13 ایضاً
14 مضمون: اکیڈمک اسٹریس اینڈ اسٹوڈنٹس سوسائیڈز ان انڈیا، دی وائر، جون 2022
15 نیوز پورٹل 48 % Increase in qualifiers in NEET UG 2023، دی ٹائمس آف انڈیا، جون 2023
16 آنلائن پلیٹ فارم: ایم بی بی ایس سیٹس ان انڈیا، ویدانتو، جولائی 2023
17 ڈیسینٹ ورک فور یوتھ ان انڈیا، انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ilo.org)

■

Syed Aasim Suhail
Dept of Sociology,
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:9730407510

عہدِ میر کا گمنام شاعر
مرمت خاں مرمت

سیفی سرونجی

سرونج کے ادبی ماحول کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس وقت میرتقی میر کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا، انھیں دنوں سرونج میں مرمت خاں مرمت اپنی شاعری کا جادو جگا رہے تھے۔ یعنی سرونج صدیوں سے ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ مرمت خاں مرمت کا گھر تو آج بھی محلّہ کڑی میں ویران حالت میں موجود ہے۔ افسوس کہ عہدِ میر کے اس شاعر کا کلام شائع نہ ہونے کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکا اور جو کچھ دستیاب ہوا وہ کسی طرح نادم سیتاپوری پاکستان لے گئے۔ نادم سیتاپوری کے کئی مضامین مرمت خاں مرمت سے متعلق 'ہماری زبان'، 'جواز' اور پاکستان کے 'نقوش' میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر مختار شمیم نے بھی ان کی شاعری سے متعلق مضامین لکھے ہیں۔ مرمت خاں مرمت سے متعلق ہندوستان میں پروفیسر مختار شمیم اور ڈاکٹر شان فخری کے علاوہ کسی نے نہیں لکھا۔ البتہ نادم سیتاپوری نے پاکستان کے رسالوں کے علاوہ 'ہماری زبان'، 'جواز' وغیرہ میں ضرور ان کے مضامین آئے۔ بہر حال جتنا بھی ان کا کلام سامنے آیا وہ نادم سیتاپوری کے حوالے سے آیا ہے۔ یہاں ساری بحث کو چھوڑتے ہوئے مرمت خاں مرمت کے چند اشعار پیش ہیں۔

سخاوت سے نہ ہو کم دولت حسن کفِ خوباں
نہیں رہتا ہے خالی زر سے پنجہ مہرتاباں کا
نہ دیتے شاعر ایسی نسبت لعل لب خوباں
نہ ہوتا مرمت خوں جگر لعل بدخشاں کا

ڈاکٹر شان فخری لکھتے ہیں:

''مرمت خاں مرمت کے بارے میں سب سے پہلی تحقیق نادم سیتاپوری کی ہے جنھوں نے نہ صرف مرمت خاں مرمت کا دیوان ہی دریافت کیا بلکہ 1958 میں پہلی بار مرمت خاں مرمت پر ایک مقالہ سپردِ قلم کیا۔ مرمت خاں مرمت کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خالی نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مرمت خاں مرمت کا عہد شاعری وہی تھا جو میر تقی میر کا زمانہ ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ مرمت خاں مرمت کی شاعری کا آغاز اس دور میں ہوا جب علامہ غلام علی آزاد بلگرامی سرونج میں جاکر اقامت گزیں ہوئے کیونکہ دیوانِ مرمت کا کافی حصہ فارسی غزلیات پر مشتمل ہے جوان کا ابتدائی کلام معلوم ہوتا ہے۔ اس دیوان میں فارسی کے علاوہ ایک اچھا خاصا ذخیرہ اردو غزلیات اور ہندی کلام کا بھی ہے جس سے مرمت خاں کی کہنہ مشقی اور قادرالکلامی پر روشنی پڑتی ہے۔''

مرمت خاں مرمت کے بعد بھی سرونج میں اچھے شاعروں کی تعداد کم نہیں ہے مثلاً منشی واحد علی زار صاحبزادہ واحدی عطا اللہ مکرم رعنا، غلام شاہ خاں منظر، اعجاز مالوی، شہرت ناطق مالوی حکیم فخر احمد، جوش مالوی۔

محققین نے لکھا ہے کہ سرونج ان کا وطن تھا، اور سرونج میں ہی انھوں نے شاعری کی ابتدا کی یہیں سے ان کا دیوان بھوپال گیا، اور بھوپال سے کسی طرح پاکستان کے نادم سیتاپوری نے حاصل کیا، اور اس کو پاکستان لے جاکر انھوں نے کیا کیا یہ کسی کو نہیں معلوم، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ان کے کچھ مضامین میں اس دیوان کا ذکر ضرور کیا گیا ہے، خاص طور پر نومبر 1964 کے ماہ نامہ 'نقوش' میں ان کا ایک مضمون مرمت خاں مرمت 'عہدِ میر کا ایک گمنام شاعر' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس پر مالیگاؤں سے شائع ہونے والے سہ ماہی 'جواز' میں جس کے ایڈیٹر سلطان سجانی تھے، ایک تبصرہ مشہور شاعر، ادیب فضیل جعفری کا شائع ہوا تھا۔ اسی تبصرے کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر شان فخری نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ 'سرونج کی ادبی خدمات' میں شائع کیا ہے، ڈاکٹر مختار شمیم نے اپنی تحقیقی کتاب 'ریاست ٹونک اور اردو شاعری' میں نادم سیتاپوری کے حوالے سے مرمت خاں مرمت کا ذکر کیا ہے، نادم سیتاپوری کا یہ مضمون ماہنامہ 'نقوش' پاکستان کے علاوہ 'ہماری زبان' میں بھی شائع ہوا ہے، ڈاکٹر شان فخری نے ماہنامہ 'جواز' مالیگاؤں میں نادم سیتاپوری کے اس مضمون پر فضیل جعفری کے تبصرے کا ذکر کیا ہے، جس میں پاکستان سے شائع ہونے والے 'نقوش' نومبر 1964 کا حوالہ دیا ہے، جبکہ مختار شمیم نے ہماری زبان علی گڑھ 15 فروری 1958 کا حوالہ دیا ہے، اور دونوں حضرات نے نادم سیتاپوری کا ذکر ضرور کیا ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں یعنی 'سرونج کی ادبی خدمات' اور 'ریاست ٹونک اور اردو شاعری' میں مرمت خاں مرمت کے جو اشعار پیش کیے ہیں وہ الگ ہیں، اسی طرح میر عرفانی مرحوم نے 62-61 عیسوی کے سرکاری ہائر سکنڈری اسکول میگزین میں مرمت خاں مرمت کے جو اشعار لکھے ہیں، میں ان تینوں حضرات سے ہٹ کر مرمت خاں مرمت کے کچھ نئے اشعار پیش کر رہا ہوں، جو یقیناً اردو قارئین کے لیے نئے ہوں گے اور سرونج کی سرزمین سے عہدِ میر کے اس شاعر کی شاعری پڑھنے کے بعد اس عہد کی پوری تاریخی اور تہذیبی جھلکیاں دکھائی دیں گی۔

مرمت جن کو ہیں تیرے اشعار راحت افزا یہ
انھیں اشعار شیدا، صوفی و قیصر، سے کیا مطلب؟

ہے یہ غزل پسند مرمت منیر کو
کیونکہ اسے ہے شعرِ دھواں دھار سے غرض

جان کو ساتھ لے دل، دل کو کہاں پر ڈوبا
آپ تو ڈوبے تھے، پر اس کو بھی لے کر ڈوبا
ہاتھ دل، گریہ سے دھو بیٹھا مرمت میرا
مردم آبی بے چارہ کا جب گھر ڈوبا

گلہ میں کس سے کروں تیری بے وفائی کا
رکھے نہیں ہے جو تو پاس آشنائی کا

سج کے نکلا ہے وہ گھر سے 'نک پلک' دلدار آج
دیکھیے کس کا کرے گا قتل وہ خونخوار آج

سوز و غم اور آہ نالہ، داغ ہجراں سب کے سب
مجھ دلِ بزیاں پر آئے ہیں یہ مہماں سب کے سب
نرگس حیراں، سرو لرزاں، لالہ پر خوں رشک سے
سن کے اس کا حسن ہیں گے یہ پریشاں سب کے سب

نور تیرا دیکھ کر شمس و قمر
جھانکتے ہیں روز و شب گھر گھر ہنوز
جو عدم رفتہ ہوئے ہستی سے آہ
حیف وہ آئے نہیں پھر کر ہنوز

کرے ہے دشمنی سارا جہاں تو کیا غم ہے
ہزار شکر کہ رکھتا ہے دلربا اخلاص

رحمت کون کرتا ہے مرمت سونچ یو وسکو
نہ ہستی ہے نہ وحدت ہے ذرا ٹک دیکھیو وسکو
چھوڑ دو مت کچھ کہو رہنے دو بس تقدیر پر
میں ہوں یہ سینا میرا اور وہ ہے اوس کا تیر ہے

نہ دیکھوں صورت گل رو کی جب تلک یارو
تو در پر آئے مرے قاصد و قضا پھر جائے
مجازی عشق سے ہے عزم اب حقیقت کا
کہ رفتہ رفتہ اودھر کو بھی مرا دل پھر جائے

رقیب دشمنی ہوئے ہیں دلبر، ایدھر ہمارے اودھر تمہارے
ہزاروں شکوے کرے ہیں گھر گھر، ایدھر ہمارے اودھر تمہارے

مقرر خدا ہے مع الصابرین
کیا تم سے اس نے یہ اقرار ہے
ہے وہ بے گانہ جو یگانہ ہے
کیا زمانہ ہے، کیا زمانہ ہے

سنگ طفلاں سے خوش ہے دل میرا
کیا دیوانہ ہے کیا دیوانہ ہے
مجھ کو مارا کیا قضا کا نام
کیا بہانہ ہے کیا بہانہ ہے

یہ سیل اشک آنکھوں سے مری کب تک رہے جاری
برابر رات دن چشمے سے پانی کب تلک نکلے
جدا جب سے ہوا ہوں دوستوں اس شوخ ہمدم سے
نہ غم ہم سے 'کبھوٗ چھوٹا نہ چھوٹے ہم کبھو غم سے

چلا جو آیا وہ با چشم نیم جواب اٹھا
تو گویا لایا وہ، دو کاسۂ شراب اٹھا

مرمت خاں مرمت کے ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت میر تقی میر کی شاعری اپنے عروج پر تھی، سرونج کا ایک گمنام شاعر دلی سے سیکڑوں میل دور ایک ایسے قصبہ میں رہ رہا تھا جس کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ یہاں قیامت بھی آئے گی تو دس بیس سال بعد آئے گی، یہی وجہ ہے کہ مرمت خاں مرمت کی شاعری بھی سرونج تک محدود ہو کر رہ گئی، چھپنے چھپانے کے ذرائع نہ ہونے اور کچھ اہل سرونج کی بدنصیبی کہیے کہ اگر اتنے پیارے شاعر کا کلام شائع ہوا ہوتا تو آج میر تقی میر کے ساتھ سرونج کا نام بھی جڑ جاتا، لیکن افسوس ان کا سارا کلام ان کے گھر والوں کی نا اہلی کی وجہ سے ادھر ادھر بھٹکتا ہوا بھوپال پہنچا اور بھوپال سے نادم سیتا پوری کے ذریعے پاکستان چلا گیا، پاکستان میں ان کے دیوان کا کیا ہوا، اس بارے میں آج تک کسی کو پتہ نہیں چلا۔ وہ تو نادم سیتا پوری کا مرمت خاں مرمت سے متعلق مضمون پاکستان سے شائع ہونے والے 'نقوش' میں نہیں چھپا ہوتا تو اس بات کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ ان کا غیر مطبوعہ کلام پاکستان چلا گیا ہے۔

جس طرح ناطق مالوی کا کلام سرونج سے غائب ہے، اسی طرح مرمت خاں مرمت کا سارا کلام پاکستان میں جا کر کہاں غائب ہو گیا ہے یہ کسی کو خبر نہیں۔ ریاست ٹونک کے نہ جانے کتنے شاعر ہو گئے ہوں گے، جن کا کلام شائع نہ ہو سکا، اور وہ گمنامی کے پردے میں روپوش ہو گئے۔ یوں تو سرونج ریاست ٹونک کا ایک حصہ رہا ہے، لیکن ٹونک کے حکمرانوں کا رویہ سرونج کے لیے کوئی ہمدردانہ نہیں تھا۔ سرونج کی ویسے بھی یہ بدنصیبی ہے کہ یہاں بڑے بڑے قابل علما، ولی، صوفی، حفاظ، شاعر، ادیب، عالم، فاضل تو بڑی تعداد میں ہوئے ہیں لیکن شعر و ادب کی محفلیں سجانے کے علاوہ کوئی تعمیری کام ایسا نہیں ہو سکا جس سے کہ سرونج عالمی ادب کے حوالے سے کسی منظر میں آتا، اس کے برعکس ٹونک میں نثر نگاری کی اہمیت زیادہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے شاعروں کا تذکرہ تاریخ ادب میں نمایاں ہے۔ اگر سرونج میں بھی نثر نگار ہوتے تو آج مرمت خاں مرمت کا کلام بھی محفوظ رہتا اور ان کا تذکرہ بھی جگہ جگہ ہوتا اور آج سرونج کا نام ادبی دنیا میں کچھ دوسرا ہی ہوتا۔ یوں تو سرونج میں کئی اور بھی اچھے شاعر ہوئے ہیں، جن کا ذکر اکثر مضامین میں ہوتا رہتا ہے، لیکن میں تو صرف مرمت خاں مرمت پر ہی اظہار خیال کر رہا ہوں۔ سرونج کے شعر و ادب سے متعلق ڈاکٹر مختار شمیم اپنی کتاب 'ریاست ٹونک اور اردو شاعری' میں لکھتے ہیں:

''سرونج چونکہ قدیم تاریخی شہر تھا، اور امیر خاں کے قبضہ کے بعد بھی اپنی تہذیبی روایات کا حامل تھا اور اس وقت بھی شعر و سخن کا وہاں چرچا تھا، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ سرونج کی تہذیب کے اول اول اثرات ہی شہر ٹونک پہنچے ہوں اور یہیں سے امیر خاں کے ساتھی شعرا اس رنگِ شاعری کو اپنے ساتھ لے گئے جس میں سوز و گداز کا عنصر غالب تھا، درد تھا، زمانے کے تجربات کا نچوڑ شامل تھا، اور یہی رنگ آگے چل کر ریاست کے شعر و ادب کا خاصہ بنا یہ وہ زمانہ تھا، جب خدائے سخن میر تقی میر کا ڈنکا بج رہا تھا اور ان کی شاعری دور دور تک اپنا تسلط قائم کر رہی تھی سرونج میں اس وقت میر کی تقلید میں بھی شعر کہے جا رہے تھے، سرونج میں اسی زمانے کا گمنام شاعر مرمت خاں مرمت تھا۔''

ڈاکٹر مختار شمیم نے اپنی کتاب 'ریاست ٹونک اور اردو شاعری' میں اور ڈاکٹر شان فخری اپنے تحقیقی مقالہ 'سرونج کی ادبی خدمات' میں اور میر عرفانی مرحوم نے اسکول میگزین میں مرمت خاں مرمت کے جو اشعار پیش کیے ہیں، جن کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں۔ ڈاکٹر شان فخری اور مختار شمیم نے جن اشعار کو درج کیا ہے وہ صرف اردو کے ہیں جو اس زمانے میں رائج تھی، جبکہ فارسی شاعری کا غلبہ تھا لیکن مرمت خاں مرمت نے فارسی اور اردو میں ہی نہیں ہندی گیت کی ٹیکنک پر ہولی دیوالی اور دیگر موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے، یہاں چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہولی میں پاس یار نہیں کیا جتن کروں
یارو بجائے رنگ یہ جاری ہے چشم خوں
ہولی کا دور دورا ہے ہر دل میں ہے امنگ
پچکاریاں گلال ابیر اور پار سنگ
بن یار ایک میں ہوں کہ یوں رشک سے جلوں
ہولی میں پاس یار نہیں کیا جشن کروں
دیکھو جدھر تو رنگ سے کپڑے ہیں سب کے لال
چہرے پہ ہے گلال ہر ایک کہ ہیں لال گال
ایسے دنوں میں کیسے بن اس یار کے رہوں
ہولی میں پاس یار تو نہیں کیا جشن کروں
قانون ہیں دائرہ، موچنگ اور ستار
دف طبلہ اور ڈھولک مردنگ ہیں ہزار
سب ہیں پر ایک غم سے مرمت میں یوں مروں
ہولی میں یار پاس نہیں کیا جشن کروں

ملہار

اومنڈ گھمنڈ کے آئی بدریا برہن لاگو مہیرا
رین اندھیری بجری چمکے پیو بن ترسے جیورا
مجھ برہن کو پاپی پیو پیو کر کے جلاوت ہے
پیو مرمت دور بسے ہے جاسے لاگو نیرا

دوہرا

رن میں لڑنا سہج ہے جل جانا نہیں دور
بچن نبھانا کٹھن ہے جوں سولی چڑھے منصور
موتی بھٹ کر نا بنے اور دودھ پھٹے بنے گھیو
پریت رہے نہیں مرمت جب پھٹ جاوے جیو

■

Dr. Saifi Sironji
Quarterly 'Intesab Aalami',
Sironj-464228 (M.P)
Mob.:9425641777

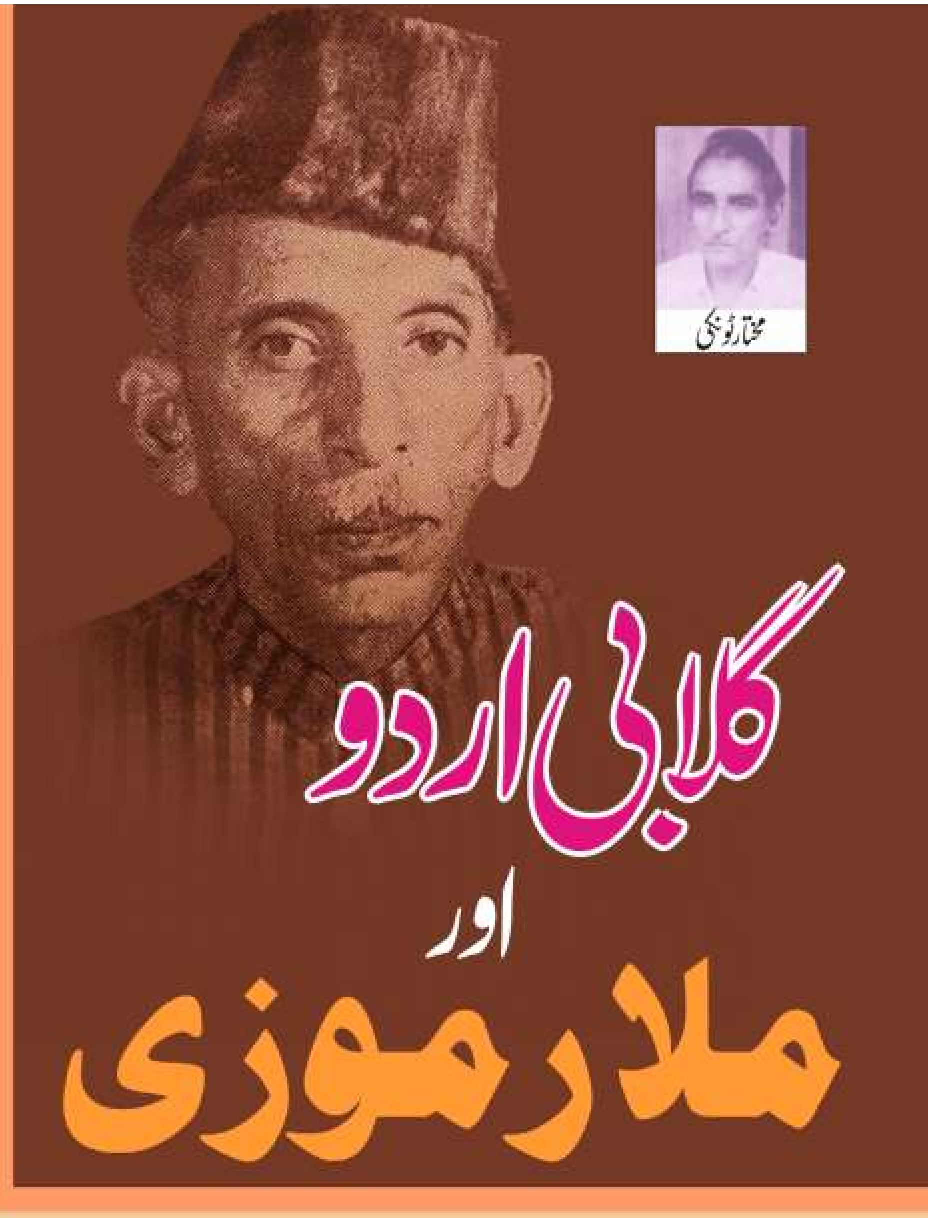

مختار ٹونکی

گلابی اردو اور ملا رموزی

بلاشبہ بھوپال حرم عظمت وجلال، مرکز ارباب فن و کمال اور گہوارۂ حسن و جمال رہا ہے مگر قابل قدر اور لائق فخر بات یہ بھی ہے کہ طنزیات ومضحکات کے اعتبار سے بھی یہ عدیم المثال کہا جاسکتا ہے، یہاں اعلیٰ درجے کے طنز ومزاح نگار بھی منصۂ شہود پر آئے اور اپنی شگفتہ نگارشات سے اردو دنیا میں دھوم مچائی۔ ویسے تو بھوپال کے شگفتہ نگاروں کی لمبی چوڑی فہرست ہے جن میں جوہر قریشی، عنبر چغتائی، مخلص بھوپالی، جہاں قدر چغتائی، شفیقہ فرحت، فضل جاوید، مصطفیٰ تاج، قیوم جاوید، خالد عابدی وغیرہ نے خوب ناموری پائی مگر بھوپال میں اردو طنز ومزاح کے باوا آدم ملا رموزی ہیں جنھوں نے اردو دنیا کو گلابی اردو سے سرفراز ونہال کیا۔ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی اپنی کتاب 'طنزیات ومضحکات' میں بہت پہلے لکھ گئے ہیں:

''گلابی اردو میں ملا رموزی صاحب نے مشہور فارسی وعربی ضرب الامثال، اشعار اور مقولوں کے اردو ترجمہ میں اپنے اجتہاد وتصرف سے جو ندرت وشگفتگی پیدا کی ہے وہ ادبیات اردو میں زعفران زار کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔'' (ص 150)

اور محمد احمد سبزواری نے اپنے مضمون 'بھوپال کی کہانی ایک پرانے بھوپالی کی زبانی' میں ان کے احوال اس طرح درج کیے ہیں:

''چھاؤنی (چھاؤنی ولاتیاں) میں ایک افغانی بزرگ محمد صالح کی رہائش تھی، ان کے تین بیٹے تھے۔ بڑے صدیق، دوسرے صادق اور تیسرے ساجد۔ بڑے صاحبزادے ابتدائی تعلیم کے بعد کانپور چلے گئے اور وہاں سے فاضل الٰہیات کی سند لے کر آئے اور ملا توحیدی کے نام سے اخباروں اور رسالوں میں لکھنا شروع کیا مگر کوئی خاص شہرت نہ پائی لیکن جب ملا رموزی کے نام سے گلابی اردو شروع کی تو طول وعرض میں مشہور ہوگئے۔ یہ دراصل علما کی اس قدیم اردو کا چربہ تھا جس میں وہ عربی اور بالخصوص قرآنی آیات کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ملا نے اس کو سیاسی مسائل پر تنقید وتبصرہ کے لیے ظریفانہ اور طنزیہ رنگ دے کر اپنی علمی قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ لوگ عش عش کرنے لگے.. بلا بسیار اور زود نویس تھے۔ ان کی کوئی دو تین درجن کے قریب کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ بے شمار مضامین رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے ہیں۔ ملا رموزی ان اولین لکھنے والوں میں شامل تھے جو اپنی تخلیقات کا معاوضہ پیشگی وصول کرلیا کرتے تھے۔''

(بحوالہ 'فکر وآگہی' بھوپال، نمبر ص 366)

دراصل 'اودھ پنچ' کے تتبع میں آزادی سے پہلے بہت سے رسالے والوں نے کالم نگاری شروع کردی تھی جن میں انگریز حکومت اور مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف طنز وتشنیع کے نشتر چھوڑے جاتے تھے۔ ملا رموزی کا کالم 'گلابی اردو' 1915 میں شروع ہوا جو ان کے اسلوب کے انوکھے پن اور سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے نہایت مقبول ہوا اور ان کے کالم برصغیر کے کئی اخباروں میں دھڑا دھڑ شائع ہونے لگے اور مقبولیت ان کے قدم چومنے لگی۔ ویسے ملا رموزی بڑے نستعلیق اور خلیق انسان تھے۔ ابراہیم یوسف ان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہم چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ہر اس شخص سے مرعوب رہا کرتے تھے جن کا نام اخباروں میں چھپتا تھا۔ ایک بزرگ دبلے پتلے کچھ نکلتا ہوا قد، بالوں دار ٹوپی، شیروانی، بھوپالی کٹ پاجامہ، سلیم شاہی جوتا پہنے اور سائیکل کو بطور واکنگ اسٹک استعمال کرتے تھے ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا کرتے تھے۔ کسی نے ہم سے کہہ دیا تھا کہ یہ بڑے مشہور مصنف ہیں۔ ان کا ہم پر رعب پڑنا ناگزیر تھا۔ ہم ان کو عقیدت سے دیکھتے، سلام تک کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ کبھی یہ بزرگ رک کر ہمارے والد صاحب سے گفتگو کرنے لگتے، کیا گفتگو ہوتی اس کا تو ہمیں علم نہ ہوتا لیکن دوران گفتگو میں کبھی وہ بزرگ قہقہے لگاتے اور ہمارے والد صاحب نہایت خلوص وسعادت مندی سے ان قہقہوں کو قبول کرتے، کبھی ہمارے والد قہقہے لگاتے اور وہ بزرگ بے حد مسکین صورت بنائے کھڑے رہتے۔ کچھ دیر قہقہوں کا یہ تبادلہ ہوتا رہتا کہ پھر وہ بزرگ اپنا راستہ لیتے اور ہمارے والد مسکراتے ہوئے گھر میں تشریف لے جاتے۔ ایک روز جمعہ کا دن تھا۔ ہم تیزی سے نماز جمعہ ادا کرنے جارہے تھے کہ وہی بزرگ سائیکل ٹیکتے نظر آئے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے سلام جھاڑا۔ رکے اور فرمانے لگے کہاں جارہے ہو؟ ہم نے عرض کیا نماز پڑھنے اور تم نے شیروانی نہیں پہنی۔ جی وہ مسجد قریب تھی، ہم نے سوچا، ہم ہکلائے۔ کبھی تم

آفاق حسین کے سامنے بھی بلا شیروانی پہنے جاتے ہو۔ جی وہ! جب تم آفاق حسین کے سامنے بلا شیروانی پہنے نہیں جاتے تو پھر خدا کے دربار میں بلا شیروانی پہنے کیوں جا رہے ہو۔ جاؤ شیروانی پہن کر آؤ اور ہم واپس گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ آفاق حسین صاحب مرحوم جہانگیر یہ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جن کو لڑکے بیڈ ماسٹر کہا کرتے تھے۔ (بحوالہ 'فکر و آگہی' بھوپال نمبر، ص 755)

اس تحریر پر تاثیر سے نہ صرف ملا رموزی کے عادات و اطوار اور خصائل و شمائل واضح ہو جاتے ہیں بلکہ بھوپال ریاست کی تہذیب و شائستگی کی جھلک بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

حضرت ملا رموزی کو عام طور پر 'گلابی اردو' کا موجد مانا جاتا ہے اور وہ خاتم بھی کہلانے کے مستحق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 'گلابی اردو' صرف ایک ذریعہ تھی ورنہ ملا صاحب کا فن گلابی اردو کے پردے میں سیاسی اور سماجی نشتر زنی کا متقاضی رہا ہے۔ وہ اس طرح نکتہ چینی کے حربے کو آزماتے تھے کہ طنزیہ تیروں کی بوچھار صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتی تھی۔ ہمارے بیشتر ناقدین نے 'گلابی اردو' کو ہی موضوعِ نقد بنا کر انھیں خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ حالانکہ ملا صاحب جب گلابی اردو سے قطع نظر کر کے صاف اور سلیس اردو میں خامہ فرسائی کرتے تھے تو اس میں غیر معمولی صفائی اور روانی در آتی تھی اور چونکہ قدرت نے ان کے مزاج میں مزاح کا عنصر رکھ دیا تھا، اس لیے عبارت اور بھی دو آتشہ ہو جاتی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گلابی کے علاوہ عام رنگ میں بھی ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ایک نفاست پسند شاعر کے بارے میں ان کی تحریر کا یہ نمونہ ملاحظہ کریں۔ شاعر صاحب تخلیقی کرب میں مبتلا ہیں بھلا کیسے؟

''قوت واہمہ کے برابر سائز کی ایک دلہن سے زیادہ رنگین کاپی اور سوئی سے پچھ موٹی پنسل سے غزل اس طرح فرماتے ہیں کہ دماغ سے دوسری ساری ذمہ داریاں کافور ہو جاتی ہیں اور رگ رگ پر غزل کہنے کا رعشہ محسوس ہوتا ہے۔ کیا مجال جواب بیوی بچے یار احباب گفتگو کر سکیں بلکہ ایک تارک الدنیا کی طرح باغ یا کسی ویرانے میں جانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ پھر کسی ویرانے میں مرے ہوئے شعراء کا ایک ڈیڑھ دیوان کھولے بیٹھے ہیں، کبھی گنگناتے ہیں، کبھی جھومتے ہیں، کبھی ویرانے میں ٹہلتے ہیں، مگر مصرع موزوں نہیں ہوتا، گھر آتے ہیں، ایک آراستہ کمرے میں نظر بند ہو کر عنبر اور لوبان روشن کرتے ہیں، عطر اور لونڈر بار بار سونگھتے ہیں تب کہیں ع

ہائے جانی تیر مارا دل نشانہ ہوگیا

کی قسم کے چند اشعار ہو جاتے ہیں۔''

مشاعرہ گاہ میں ان کی حاضری دیکھیں کہ ملا رموزی کس طرح جزئیات نگاری کا حق ادا کرتے تھے:

''مشاعرہ میں شرکت کے لیے کیا نکلتے ہیں گویا دولہا بن کر دلہن بیاہنے جا رہے ہیں مشاعرہ گاہ میں اس طرح لوچ اور لچک کے ساتھ داخل ہوتے ہیں گویا خانۂ خدا میں سجدہ کرنے والے ہیں۔ صدر مقام پر رونق افروز ہوتے ہیں۔ ہر آیند و روند کے آداب و تسلیمات کے لیے نصف سے زیادہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بے وجہ چھوٹا سا رومال منہ سے لگا کر کھانستے ہیں۔ کبھی تیور بنانے کی مشق کرتے ہیں، کبھی خفیہ طور پر داد کے جواب میں تسلیمات بجا لانے کا ڈھنگ وضع کرتے ہیں، غزل پڑھنے کے اصرار کو اپنی نزاکت تابی سے بڑھائے جاتے ہیں اور جب شروع فرماتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے گویا نفاست کلام نفاست جسم بن گئی ہے۔ گھر واپس آتے ہی تو خود کو ایک غزل کی تھکن سے بیمار محسوس کرتے ہیں۔''

(بحوالہ رسالہ 'فکر و آگہی' بھوپال، ص 756)

فی الحقیقت 'گلابی اردو' تو ان کے ابتدائی دور کی رندانہ مستی کی مانند تھی جو ان کے مذہبی شغف اور قرآن پاک کے ترجموں سے متاثر ہو کر عالم وجود میں آئی۔ پروفیسر سید اعجاز حسین نے ان کے بارے میں لکھا تھا:

''ملا رموزی کے یہاں عام طور پر سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں، وہ کبھی کبھی طنزیاتی انداز میں ان پر تبصرہ بھی کر جاتے ہیں۔ ان کے دل میں مذہب اور قوم کا درد ہے اور وہ مکمل اصلاح چاہتے ہیں۔ اسلامی ممالک کا تذکرہ کرتے وقت ایک جوش اور زور نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ اس میں کسی طرح کی اخلاقی، معاشی اور سیاسی کمزوری دیکھنا نہیں چاہتے۔'' مثلاً

''اے ہندو مسلمانوں میں فساد کرانے والو!

اور آگاہی ہے واسطے تمھارے کہ تحقیق قریب آگئی ہے، وہ گھڑی کہ شروع ہو جنگ بڑی یورپ کی، اور نقصان پہنچے تم کو یہ سبب عادتِ بد تمھاری کے اگرچہ نہ ہوگی اور البتہ تحقیق نہ ہوگی جنگ بڑی یورپ کی مثل جنگ 1914 کے پھیلی ہوئی، مگر چاہیے تم کو میل جول بڑھاؤ، آپس میں تا نہ شرمائیں تم کو قومیں ترقی یافتہ، پس تحقیق کہ جب تک نہ ہوں گے شاعر اردو کے ذی علم اور تجربہ کار، اس وقت تک ڈھلتی رہیں گی غزلیں غیر عقلی اور افسردہ، پس جب حصہ ادب اردو کو اور شعراء اردو کا ہوگا بیچ ہاتھوں تحقیق کے تو ترقی کرے گی غزل اردو کے موافق ترقی یافتہ عقل اس زمانہ ہذا کے۔'' (بحوالہ 'چنگاری' کالم نگاری، ص 74)

بہر کیف ان کی تحریریں اس زمانے میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں اور لوگ ان کے مضامین کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ اسی زمانے کے ادبی صحافت کے بارے میں ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔ 'زبان' کاٹھیاواڑ کے رسالے میں 'نکات' کالم میں انھوں نے لکھا تھا:

''صحافتِ اردو میں ابھی تک تو رسالوں کے خاص نمبروں کی گھوڑ دوڑ ہو رہی تھی۔ اب پنجاب کے اخباراتِ اردو نے سنڈے ایڈیشن کا مرض پھیلایا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ اتوار کے دن جو عیسائیوں کا مقدس دن ہے، یہ تمام اسلامی اخبارات اپنے اخباروں کو دونی ضخامت اور رنگین صفحات کے ساتھ شائع کرتے ہیں اور اسی کو سنڈے ایڈیشن کہتے ہیں اور یہ سنڈے ایڈیشن والے وہی پر جوش مسلمان ایڈیٹر ہیں جو آئے دن علی گڑھ والوں کو اس لیے برا کہتے ہیں کہ وہ 'مسلم یونیورسٹی' میں بجائے جمعہ کے اسلامی تعطیل کے اتوار کی عیسوی تعطیل مناتے ہیں۔ کیوں صاحب! یہ بجائے اتوار کے اگر تمام اسلامی اخبارات فرائی ڈے ایڈیشن شائع کریں تو کیا اس میں انگریزی اخبارات کی تقلید نہ رہے گی؟ اور کیا سنڈے کی طرح فرائیڈے انگریزی لفظ نہیں ہے، مگر وہ تو اپنی مسلمانوں کو لفظ سنڈے میں مزہ ملتا ہے۔ خدا ان سنڈوں مسنڈوں سے زبان اردو کو محفوظ رکھے، جو آئے دن ایسے الفاظ کو اردو کا جزو بنائے جا رہے ہیں۔''

پورا اقتباس حالانکہ طنزیہ ہے مگر ان کا درد بھی پوری طرح جھلکتا ہے۔ ملا رموزی بارہ چودہ سال تک 'گلابی اردو' یعنی صنفِ نثر میں گلہائے رنگا رنگ کھلاتے رہے، لیکن بعد میں شاعری کے میدان میں بھی گلابی رنگ کے ساتھ کود پڑے اور جہاں تک راقم الحروف کا خیال ہے، ان کی آخری تصنیف 'گلابی شاعری' ہے۔ اگر ہم ان کی 'گلابی اردو' اور اس میں پیش کردہ مسائل و موضوعات کو موجودہ حالات کی روشنی میں جانچنے پرکھنے کی سعی کریں تو یہ سعی لاحاصل ہوگی اور ان کے ساتھ ہرگز بھی انصاف نہ ہوگا اور ذی فہم لوگوں کو لازمی طور پر یہ کہنا پڑے گا کہ ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

پھر عصر حاضر میں ایسے پراگندہ طبع لوگ بھی کہاں ہیں جو 'گلابی اردو' میں ڈوب کر دور کی کوڑی لا سکیں۔ اب تو سے دفعہ کو اندوہ ربا کہنے والے بھی مشکل سے دستیاب ہوں گے۔

■

Mukhtar Tonki
Kali Pattan Road
Pul Mohd Khan
Tonk- 304001 (Rajasthan)
Mob.:9214826684

محقق
قاضی عبدالودود

عارف حسن وسطوی

قاضی عبدالودود اس عہد آفریں اور عبقری شخصیت کا نام ہے جس پر نازاں و فرحاں ہونا باعثِ افتخار ہے۔ علم و فضل، ذہانت و فطانت، عالمانہ شان و شوکت اور اعلیٰ علمی و ادبی کارناموں کی بدولت قاضی عبدالودود صف اوّل کے محققین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب کے طرزِ فکر اور طرزِ اظہار کا منطقی ربط معاصرین میں انھیں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ یوں تو کہنے کے لیے قاضی عبدالودود نے محمود شیرانی کی تحقیقی روایت کو تسلسل بخشا، شیرانی صاحب کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے تحقیق میں غیر جذباتی اندازِ نظر کو پیش نظر رکھا، نئے ماٰخذ کی تلاش اور اوّلین ماٰخذ کی اہمیت پر زور دیا، بہ الفاظ دیگر تحقیق کے معیار کو بلند کیا، اسی مناسبت سے وہ تحقیق کے معلم ثانی بھی کہلائے، یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر لیکن قاضی عبدالودود کا امتیاز و اختصاص اپنی جگہ پر۔ بقول رشید حسن خاں:

''روایت کو تسلسل حاصل نہ ہو تو وہ ایک وقفے کے بعد بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ تحقیق کی جو روایت شیرانی صاحب نے قائم کی تھی، اس کے تسلسل کے لیے یہ ضروری تھا کہ خبر اور نظر، دونوں کے اعتبار سے کوئی ایسا شخص ہو جو پچھلی روایت میں اضافے کر سکے اور جو معیار سامنے آچکا ہے، اس کو اور بلند کر سکے۔ اس کے بغیر روایت کو وہ توانائی حاصل نہیں ہو پاتی جس کے بل پر وہ اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کیا کرتی ہے اور اپنے عناصر کو تابناک رکھتی ہے۔ قاضی صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ ان کے اثر سے اس روایت کا تسلسل باقی رہا اور ان اہم اضافوں کے ساتھ جن کے بغیر توسیع نہیں ہو پاتی۔''

(رشید حسن خان، تدوین: تحقیق روایت، ص 6-205، ایس اے پبلی کیشنز، دہلی 1999)

قاضی عبدالودود کی تحقیق کا سب سے بڑا کارنامہ اس جمود کو توڑنا ہے جس میں اردو کے بڑے مصنفین، ناقدین اور محققین کی نگارشات کو ان کے یہاں پائی جانے والی کمزوریوں کے حوالے سے آشکار کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ قاضی عبدالودود کا ہی جگر تھا کہ انھوں نے اردو تحقیق و تنقید میں دلائل کے ساتھ ایسی جرح کو فروغ دیا جس کے نتیجے میں ایک صحت مند تنقیدی بصیرت پیدا ہوئی۔ یوسف حسین خاں کے الفاظ میں ''قاضی صاحب نے اردو میں تحقیق کو باضابطہ ایک شعبہ بنا دیا ہے اور اسے تنقید سے نہ صرف ممیز بلکہ ممتاز بھی کر دیا ہے۔'' اور عابد رضا بیدار کے لفظوں میں ''گھٹنوں کے بل چلنے والی اردو تحقیق کو قاضی صاحب نے پاؤں کے بل چلنا سکھایا ہے۔'' اور علی جواد زیدی تو اس نتیجے تک آپہنچے کہ یہ اردو کی خوش بختی ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں کے ساتھ کسی دوسری زبان یا دوسرے علوم کو فیض پہنچانے کے بجائے اردو تحقیق کا دامن تھام لیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ولایت سے بیرسٹری کی ڈگری اور مرض لائے۔ بیماری کی وجہ سے محنت ممنوع تھی۔ باہر سفر وغیرہ پر بھی نہ جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیرسٹری کی ڈگری صرف زیب افسانہ رہ گئی۔ لیکن کیمبرج کے علمی ماحول، فرانس کے علمی حلقوں سے تعارف اور گھر بیٹھے مطالعے کی سہولتوں نے انھیں کتابوں کے طلسم خانے میں لا کھڑا کیا۔ یہ اردو کی خوش قسمتی تھی کہ کسی اور طرف جھکنے کے بجائے یہ اردو کی طرف جھک پڑے۔'' (آج کل اردو تحقیق نمبر 1967 ص 24)

قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون 'اصول تحقیق' میں تحقیق کے لیے جو صفات مخصوص کی ہیں ان میں چند کا ذکر لازمی ہے۔

- ''بعض موضوعات ایسے ہیں کہ ان پر آزادی سے کچھ لکھنا ضرر رساں ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے لیے آمادہ نہیں تو ایسے موضوع پر قلم اٹھانا نامناسب ہے۔ کسی محقق کے لیے یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ اسے خوف راست گفتاری سے بغض رکھے۔''
- ''ہر بات یکساں اہمیت نہیں رکھتی، لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم، محقق کو حق تحقیق ادا کرنا چاہیے۔''
- ''محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے۔ اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے۔ آرائش گفتار کی غرض سے نہیں۔''

تحقیق میں قطعیت، دو ٹوک انداز بیان، غیر مصالحانہ رویہ، حق گوئی، راست گوئی، بے باکی، بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہونے والی کیفیت یہ وہ صفات ہیں جو ہمیشہ قاضی عبدالودود کی شخصیت پر غالب رہیں۔ قاضی صاحب نے تحقیق کو جو نیا آئین اور نیا ضابطہ دیا اس کی زد میں ایسے باکمال شعرا و ادبا اور محققین بھی آئے ہیں جنھیں ایک عام محقق و ناقد چھونے کی بھی جسارت نہیں کر سکتا۔ میر، غالب، شاد، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق وغیرہ یہ سب اس کی مثالیں ہیں۔ قاضی عبدالودود کا کمال یہ ہے کہ وہ شخصیت کو کبھی سامنے نہیں رکھتے۔ ان کی نگاہ میں بس نگارشات ہوتی ہیں۔ گویا ان کا تعلق متن سے ہے، متن کی کمزوری چاہے مصنف کی

طرف سے سامنے آئے یا مرتب کی جانب سے، قاضی عبدالودود کی نگاہ میں دونوں قابل گرفت ہوتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے قاضی صاحب اس کی تصحیح کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مثال تو بہت مشہور ہے کہ محمد حسین آزاد نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'آبِ حیات' میں ایک ہی شعر کو دو الگ الگ صفحات میں دو الگ الگ شاعروں کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس تحقیقی غلطی کی سب سے پہلے نشاندہی قاضی عبدالودود نے ہی کی تھی۔ 'آبِ حیات' کی دوسری تحقیقی غلطی کی بھی سب سے پہلے نشاندہی قاضی عبدالودود نے ہی کی جس میں یہ کہا گیا کہ میر ضاحک کے انتقال کے بعد ان کے فرزند میر حسن نے سودا سے یہ گزارش کی کہ میر ضاحک کے خلاف اپنی ہجویات چاک کرڈالیں۔ جبکہ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ میر ضاحک کا نتقال سودا کے انتقال (1195 ہجری) کے بعد ہوا۔

قاضی صاحب تحقیق میں چھوٹی اور بڑی چیزوں میں تفریق کے بالکل قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک اہمیت صداقت کی تھی۔ ان کا تصور تھا کہ تحقیق میں احتیاط کی چھلنی بار بار استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اور بیجنل تخلیقات کو سامنے رکھے بغیر محقق اپنا فرض منصبی ادا نہیں کرسکتا ہے۔ ماہر غالبیات مالک رام نے 'ذکرِ غالب' مرتب کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ 'مرزا غالب 8 رجب کو پیدا ہوئے۔'' قاضی عبدالودود چھوٹی باتوں کی بھی گرفت منطقی استدلال کے ساتھ یوں کرتے ہیں کہ'' 8 رجب کو مرزا غالب نہیں، ایک بچہ عزت النساء بیگم کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو تخلص ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آیا تھا۔ حالاتِ زندگی کا اس طرح شروع کرنا عہد حاضر کی روش نہیں ہے۔''

قاضی عبدالودود ایک بت شکن محقق تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے لوگوں کی فروگزاشتوں کو آشکار کرنے میں کبھی گریز نہیں کیا۔ انھوں نے تحقیق میں سست روی، سہل نگاری اور ڈھیلے پن پر روک لگائی اور یہ سکھایا کہ تحقیق ایک مشقت طلب کام ہے۔ یہ خونِ جگر چاہتا ہے۔ آنکھ بند کرکے یقین کرنے والی کیفیت جگہ جگہ ٹھوکریں کھانے کی دعوت دیتی ہے۔ بہت چھان پھٹک کر اور شواہد یکجا کرنے کے بعد ہی کوئی بات صفحۂ قرطاس پر منتقل کی جائے۔ ایک دوسری مشہور مثال مجنوں گورکھپوری کے حوالے سے ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے 'میر اور ہم' میں ایک شعر میر کے نام موسوم کیا۔ شعر ہے کہ

شکست وفتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تودلِ ناتواں نے خوب کیا

قاضی صاحب نے میر کے تمام دیوان چھان مارے اور یہ فیصلہ صادر کیا کہ'' یہ شعر کلیات میر میں کہیں نہیں ہے۔'' اتنا ہی نہیں قاضی صاحب نے بتایا کہ یہ شعر کسی قدر مختلف شکل میں ایک دوسرے غیر معروف شاعر نواب محمد یار خاں امیر کا ہے۔ اصل شعر اس طرح ہے۔

شکست وفتح میاں! اتفاق ہے، لیکن
مقابلہ تودلِ ناتواں نے خوب کیا

خواجہ احمد فاروقی نے اپنی تصنیف 'میر تقی میر: حیات اور شاعری' لکھتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ ہنوز میر پر ایسی مبسوط اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ قاضی صاحب نے خواجہ صاحب کی کتاب کا دوٹوک مطالعہ پیش کیا اور ان کی تحقیقی خامیوں کی نشاندہی کی۔ ایک مثال پیش ہے۔

خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب 'میر تقی میر: حیات اور شاعری' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''میر نے اپنے تذکرے میں 160 قلمی چہرے پیش کیے ہیں، لیکن ان رنگا رنگ صورتوں میں خود ان کے چہرے کی بھی اصلی جھلک موجود ہے۔ میر نے بعض صفات پر بہت زور دیا ہے اور ان کو اکثر شاعروں کی سیرت میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔''

(میر تقی میر: حیات اور شاعری، ص 635)

> قاضی عبدالودود ایک بت شکن محقق تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے لوگوں کی فروگزاشتوں کو آشکار کرنے میں کبھی گریز نہیں کیا۔ انھوں نے تحقیق میں سست روی، سہل نگاری اور ڈھیلے پن پر روک لگائی اور یہ سکھایا کہ تحقیق ایک مشقت طلب کام ہے۔ یہ خونِ جگر چاہتا ہے۔

اس پر قاضی صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'مصنف میر' کو یہ بھی معلوم نہیں کہ نکات الشعرا میں بالاستقلال کتنے شعرا کا ذکر ہے۔ ان کی تعداد 160 نہیں، 103 ہے اور ان میں بکثرت ایسے ہیں جن سے متعلق عبارت نثر ہے ہی نہیں، یا ہے تو برائے نام۔ ایسے شعرا جن کے قلمی چہرے پیش کیے ہیں، کم ہیں۔''

(عیارستان: قاضی عبدالودود، ص 26)

قاضی صاحب تحقیق میں حق پسندی کے قائل تھے۔ اردو تحقیق کی مبادیات، طریقۂ کار اور اصول وضوابط پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ قاضی عبدالودود نے تحقیق کے لیے لازمی اجزا کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے: موضوع کا انتخاب، مواد کی فراہمی، پیرایۂ اظہار، اخلاقیات۔ قاضی عبدالودود کا میدان تحقیق زیادہ وسیع اور متنوع ہے۔ آپ نے اردو اور فارسی دونوں ادبیات میں اپنے اشہبِ تحقیق کو دوڑایا۔ نئی منزلیں حاصل کیں اور تحقیق کے دریچے وا کیے۔ ان کے مطالعے کا میدان لسانیات، شاعری، نثر، لغات، تذکرہ، تاریخ اور سوانح بھی رہا ہے۔ قاضی عبدالودود نے ارزاں تحقیق کے راستے بند کیے اور معیاری تحقیق کو اعتبار بخشا۔ بقول پروفیسر آفتاب احمد آفاقی:

''اردو تحقیق میں قاضی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جہاں ایک طرف ادب کے عقائد وتصورات کے حصار کو توڑا وہیں یک طرفہ مطالعے اور مبالغے پر کاری ضرب لگائی۔ انھوں نے پہلی بار تحقیق کی ایسی تعریف متعین کی جو جدید، سائنٹفک اور مدلل تھی۔''

(بہار کا اردو ادب، ص 191)

پروفیسر محمد حسن نے اپنے ایک مضمون 'قاضی عبدالودود: ایک قاموسی شخصیت' میں قاضی عبدالودود کی تحقیق میں عرق ریزی، جانفشانی، لفظ کے تلفظ، اس کی ساخت اور اس کے صحیح استعمال پر استدلال کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ علی گڑھ اسٹیشن پر پٹنہ واپس آنے کے لیے قاضی صاحب کے سازوسامان ہاوڑا میل پر سوار کیے جاچکے تھے، گاڑی بھی چھوٹنے والی تھی اور قاضی صاحب پلیٹ فارم پر اس بحث وتکرار میں اُلجھے رہے کہ لفظ 'روماتوی' میں 'وٗ' اضافی ہے اور غلط استعمال ہے۔ رومانی ہونا چاہیے۔ بظاہر یہ واقعہ ایک تمسخر کی فضا بندی کرتا ہے لیکن اس کے باطن میں قاضی عبدالودود کی تحقیقی ریاضت کا جو عمل دخل ہے اور علم وادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے کا جو کرشمہ ہے وہ اب نایاب ہے۔

تحقیق کے لیے جو چیزیں درکار ہوتی ہیں وہ سب قاضی صاحب میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کے تحقیقی تبصرے ان کی علمیت اور کثرت مطالعہ کے گواہ ہیں۔ قاضی صاحب نے پہلی بار یہ احساس دلایا کہ بنیادی وسائل وذرائع مستند وقابلِ اعتبار ہونے چاہیے۔ 'آوارہ گرد اشعار'، 'جہانِ غالب' اور 'تعینِ زمانہ' ان کے طویل مضامین ہیں۔ 'آوارہ گرد اشعار' میں انھوں نے ایسے اشعار جمع کیے ہیں جن کے شاعر کا کچھ علم نہیں۔ ایسے مشہور اشعار پر انھوں نے مختلف مآخذ سے ضروری تفصیل لکھی ہے۔ 'جہانِ غالب' میں غالبیات سے متعلق ان کی تحقیقات ہیں۔ غالبیات پر یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ بہ قول رشید حسن خاں:

''قاضی صاحب نے بہت سے نئے مآخذ کا اس وقت پتہ دیا جب اس کا علم اکثر لوگوں کو نہیں تھا۔ ان کی تحریریں ان کے وسعتِ مطالعہ کی شاہد عادل ہیں۔ کم ایسے مآخذ ہوں گے جو ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں۔''

(رشید حسن خاں: تدوین تحقیق حکایت، ص 201)

قاضی صاحب کے مطالعے کا میدان نہایت وسیع تھا۔ انھوں نے کلاسیکی شعراء کے دواوین خاص طور پر میر، انشا، مصحفی، جرات اور سودا کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ اردو زبان و ادب کے علاوہ فارسی زبان و ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ قدرت نے انھیں حافظہ بھی غضب کا عطا کیا تھا۔ کوئی بات ایک دفعہ پڑھ لیتے وہ ان کے ذہن نشین ہو جاتی۔ بہ قول مختارالدین احمد آرزو:

''قاضی صاحب کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اردو فارسی کے غیر مشہور اشعار کے اگر چند لفظ ان کے سامنے پڑھ دیے جائیں تو وہ نہ صرف شعر سمجھ جائیں گے بلکہ یہ بتادیں گے کہ یہ شعر کس کا ہے، مطبوعہ دیوان میں موجود ہے یا کسی خاص قلمی نسخے میں ہے، کن کن بیاضوں اور تذکروں میں اس کا اندراج ہے۔ وہ یہ بھی بتادیں گے کہ یہ شعر صحیح یا غلط طور پر کن کن شعرا کی طرف سے منسوب ہے۔''

(مختارالدین احمد، (مضمون) قاضی عبدالودود، (مشمولہ) یادگار نامہ قاضی عبدالودود، ص 75-65، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2000)

تحقیق میں قاضی صاحب کی سخت گیری اور جارحانہ انداز کا شکوہ عام ہے۔ قاضی صاحب سے ناقدین کو یہ بھی شکایت رہی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کی بھی گرفت اس انداز میں کرتے ہیں کہ بعض اوقات یہ طبیعت پر گراں گزر جاتی ہے۔ کچھ حد تک ان باتوں کو تسلیم کرنے میں دشواری بھی نہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہی جارحانہ رخ اور سخت گیری ادبی تحقیق اور ادبی مطالعے کو اعتبار و وقار بھی بخشتی ہے۔ اور اپنے بعد کے محققین و ناقدین کو مزید چھان بین اور احتیاط کے ساتھ قلم اٹھانے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ قاضی صاحب کے اسی طرز تحریر Style کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''پچھلے چند برسوں میں بلا شبہ اردو تحقیق کا مذاق عام اور اس کا معیار زیادہ بلند ہوا ہے۔ اس کے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ میں بھی تبدیلی آئی ہے اور اس کی اہمیت کا احساس اور عرفان بھی پیدا ہوا ہے۔ اس تبدیلی کا سہرا بڑی حد تک قاضی عبدالودود کے تحقیقی مضامین کے سر ہے جن کی سخت گرفت اور تیز ابی لب و لہجے نے اچانک تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والوں میں نئی ذمے داری اور زیادہ سخت ڈسپلن کا احساس پیدا کیا۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مضامین میں صرف اعتراضات نہیں کیے بلکہ نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ غلط بیانیوں یا نیم صداقتوں کے مقابلے میں نہایت عرق ریزی اور دیدہ وری سے صحیح حقائق کو پیش کر کے تحقیقی کام کی ایک نئی سطح پیش کی۔ ان کا معیار بلند

قاضی صاحب کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اردو فارسی کے غیر مشہور اشعار کے اگر چند لفظ ان کے سامنے پڑھ دیے جائیں تو وہ نہ صرف شعر سمجھ جائیں گے بلکہ یہ بتادیں گے کہ یہ شعر کس کا ہے، مطبوعہ دیوان میں موجود ہے یا کسی خاص قلمی نسخے میں ہے، کن کن بیاضوں اور تذکروں میں اس کا اندراج ہے۔ وہ یہ بھی بتادیں گے کہ یہ شعر صحیح یا غلط طور پر کن کن شعرا کی طرف سے منسوب ہے۔

اور مطالبے سخت ہیں لیکن وہ ان مطالبوں اور معیاروں کو پہلے خود اپنے لیے اختیار کرتے ہیں، پھر ان کا تقاضا دوسروں سے کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ صحت مند تحقیقی رجحان کی شکل میں سامنے آیا۔''

(آج کل، اردو تحقیق نمبر 1967 ص 24)

قاضی عبدالودود کے تحقیقی موقف کی حمایت گیان چند جین نے بھی کی ہے۔ دراصل قاضی صاحب کی تحقیق میں جو کاری ضرب ہے اس کی اکثر ناقدین ادب نے دبے یا کھلے الفاظ میں مذمت کی ہے۔ ان پر یہ الزام بھی عائد ہے کہ وہ محض نقص نکالنا جانتے ہیں۔ معمولی لغزشوں کو بھی بڑی غلطیوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ گیان چند جین کا اعتراف ہے کہ قاضی صاحب کے یہاں پذیرائی بھی ہے۔ اس کی مثال انھوں نے قاضی صاحب کی تبصروں پر مشتمل سب سے اہم تصنیف 'عیارستان' کے حوالے سے دی ہے۔ 'عیارستان' تین مختلف کتابوں کے تجزیاتی مطالعے اور تبصرے پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں ہیں: دیوان فائز: مرتبہ۔ مسعود حسن رضوی، مرقع شعرا: مرتبہ رام بابو سکسینہ اور میر تقی میر: حیات اور شاعری۔ مرتبہ: خواجہ احمد فاروقی۔ پروفیسر گیان چند جین اپنے ایک مضمون 'بت شکن محقق' میں لکھتے ہیں:

''انھوں (قاضی عبدالودود) نے معاصرین کے تحقیقی کاموں پر جو تبصرے کیے ہیں ان میں غالباً سب سے پہلا سید مسعود حسن رضوی کا مرتب کردہ دیوان فائز کا جائزہ ہے۔ یہ جو خیال کیا جاتا ہے کہ قاضی صاحب ہمیشہ خامیوں پر ہی نظر رکھتے ہیں اس جائزے کو دیکھ کر غلط ہو جاتا ہے۔ تبصرے کی ابتدا میں ہی انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ''یہ بات بے خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں جو انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہیں ان میں بہت کم ایسی ہیں جن کے مرتبین نے اتنی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے... کتاب کی ترتیب میں جو جانفشانی انھوں نے کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔''

(معاصر پٹنہ۔ قاضی عبدالودود نمبر، مرتبہ کلیم الدین احمد ص 71)

قاضی صاحب کے بے مثل محقق بننے میں دو عوامل خاص طور پر اثر انداز رہے ہیں۔ مطالعے کی کثرت اور حافظے کی قوت۔ قاضی صاحب کی صحبتوں میں بیٹھنے والوں نے ان کے مطالعے کی کثرت اور خداداد حافظے کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ مختارالدین احمد اپنے ایک مضمون 'قاضی عبدالودود' میں ان کی ذہانت اور وسعت مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''ایک بار ایک مجلس میں جس میں متعدد ادیب و شاعر موجود تھے ذکر چھڑا کہ اردو کے ہزاروں شعر ایسے ہیں جو زبان زد ہیں لیکن عام طور پر معلوم نہیں کہ کس کے شعر ہیں۔ لوگوں نے یکے بعد دیگرے دس شعر پڑھے۔ قاضی صاحب نے فوراً بتادیا کہ یہ شعر کس کے ہیں۔ اب ان کی باری آئی۔ انھوں نے جو شعر پڑھے ہم لوگ کسی کا جواب نہ دے سکے۔ ان شعروں میں ایک یہ بھی تھا جو زبان زد خاص و عام ہے''۔

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

بعد میں انھوں نے یہ بتایا کہ یہ شعر وزیر لکھنوی شاگرد ناسخ کا ہے۔ گو بعض تذکروں میں خود ناسخ کے نام سے درج ہے۔

(معاصر پٹنہ، قاضی عبدالودود نمبر، مرتبہ کلیم الدین احمد ص 152)

قاضی صاحب تحقیق و تنقید کے ساتھ نثر سے متعلق بھی اپنی الگ رائے رکھتے ہیں۔ وہ نثر میں سادگی، منطقی ربط، صراحت اور وضاحت پر مکمل زور دیتے ہیں۔ نثر میں آرائشی پیرایۂ اظہار اور شاعرانہ اسلوب قاضی عبدالودود کے نزدیک معیوب ہے۔ اسی غیر مصالحانہ رخ اور نظریے کی وجہ سے محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر قاضی عبدالودود کے نزدیک مثالی قرار نہیں دی جاسکی۔ اس مخصوص نظریے کے تناظر میں خود قاضی عبدالودود کی نثر ناقدین ادب کے نزدیک 'خشک' اور 'غیر دلچسپ' قرار پائی، لیکن قاضی صاحب نے یہ کہتے ہوئے ان اعتراضات کو یکسر مسترد کر دیا کہ ''میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ہندو پاک کے گنے چنے دس افراد کے لیے ہیں۔'' اس جملے سے طنطنہ اور انانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے قطع نظر اس بات کا اقرار لازمی ہے کہ قاضی صاحب کے اعلیٰ علمی و تحقیقی کاموں نے یہ اصول ضرور وضع کیے کہ تحقیق و تنقید کوئی بچے کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل مشقت طلب طرز زندگی ہے، جس میں ڈھلنے سے پہلے خود احتسابی اور ڈھلنے کے بعد حقائق کے اظہار کے لیے بے باکی اور جرأت مندی اولین شرط ہے۔

■

Md. Arif Hasan
Central Bank of India
Cinema Road, Hajipur
Distt.: Vaishali- 844101 (Bihar)
Mob.:7654443036

محمد خوشتر

پروفیسر مظفر حنفی کی تحریروں میں ہندوستانی عناصر

> ہندوستان کے بے شمار اردو ادیبوں نے ہندوستانی عناصر جیسے تہذیب و تمدن، رہائش وزیبائش، زبان وبیان، زمان و مکان، تاریخ، عمارت، علاقے، تہوار، رسم و رواج اور معاشرے پر نثر و نظم میں گفتگو کی ہے اسی سلسلے کو پروفیسر مظفر حنفی نے مزید مستحکم کیا ہے، انھوں نے ایک کتاب ہی 'ہندوستان اردو میں' نام سے تحریر کی ہے جو اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ انھیں ہندوستانی تہذیب و عناصر سے قلبی لگاؤ تھا۔

ہمارا پیارا قدیم وعظیم ملک ہندوستان، مختلف مذاہب اور مختلف زبان بولنے والوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس میں کئی ریاستیں ہیں اور سیکڑوں زبانیں اور بولیاں بولنے والے کروڑوں افراد بھی۔ ہندوستان کے بے شمار اردو ادیبوں نے ہندوستانی عناصر جیسے تہذیب وتمدن، رہائش وزیبائش، زبان وبیان، زمان و مکان، تاریخ، عمارت، علاقے، تہوار، رسم و رواج اور معاشرے پر نثر ونظم میں گفتگو کی ہے اسی سلسلے کو پروفیسر مظفر حنفی نے مزید مستحکم کیا ہے۔ انھوں نے ایک کتاب ہی 'ہندوستان اردو میں' نام سے تحریر کی ہے جو اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ انھیں ہندوستانی تہذیب وعناصر سے قلبی لگاؤ تھا جس کا جابجا اظہار ان کی نثر ونظم میں ملتا ہے۔

'ہندوستان اردو میں' نامی کتاب میں حالات حاضرہ پر اگر بہترین مضامین ملتے ہیں تو اسی کے ساتھ اردو کے احوال، حالات، ضرورت اور دیگر معلومات کا بھی اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے۔ جمہوری اقدار وروایات اور سیکولرزم کو بھی بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو دیکھیے جس میں انھوں نے ہولی تہوار پر گفتگو کی ہے:

راوی: اس تیوہار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ راگ اور رنگ کے بغیر ہولی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عوام الناس کا تیوہار ہے۔ اس میں پوجا پاٹھ یا دوسرے مذہبی کاموں کی جگہ لوگوں سے ملنے جلنے، گانے بجانے، رنگ، گلال اور عبیر لگانے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یار دوست، اقربا اور رشتے دار مل جل کر کھاتے پیتے ہیں اور ہنسی مذاق کرتے ہیں۔

راوی: یہ شاید واحد تیوہار ہے جس میں اونچ نیچ کی تفریق بالکل مٹ جاتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا، بڑی سے بڑی شخصیت کو رنگ بھی سکتا ہے اور اس کے ساتھ بے تکلفانہ مذاق بھی کرسکتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہولی کا اصل مزہ بڑے شہروں سے زیادہ گاؤں میں آتا ہے۔ سلام سندیلوی نے ہولی مناتے ہوئے ایک گاؤں کا نقشہ بڑے دلکش اسلوب میں پیش کیا ہے۔

کورس:

ہولی آئی ہولی آئی، رنگ گلابی ساتھ میں لائی
بچے، بوڑھے، عورت، مرد، جوان سبھی پر لالی چھائی
پوری پکی، گوجیا تلی، بنے سموسے، چڑھی کڑھائی
ڈھول بجاتے، ہولی گاتے، لوگ پھر رہے گاؤں میں
لے کر اپنی اپنی ٹولی، آئی ہولی، آئی ہولی

(ہندوستان اردو میں، ص 69)

پروفیسر مظفر حنفی نے اس مضمون کے ذریعے ہولی کے کھیل اور اس کی رنگا رنگی کو بیان کیا ہے تو وہیں دوسری طرف اس کھیل اور ہولی تہوار میں پائے جانے والی محبت، وارفتگی کے جذبہ کو بیان کرتے ہوئے اسے سیکولر

تہذیب کی نشانی قرار دیا ہے۔ ذرا آنے والے مضمون کے اقتباس کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس مضمون میں مظفر حنفی اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اردو میں سب سے زیادہ ہندو مذہب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ بھگوت گیتا اور رامائن ہیں اور اس کے مرتب ومصنف اور مترجم ہندو کے شانہ بہ شانہ مسلم بھی ہیں:

''ہندو مذہب سے متعلق جو کتابیں اُردو میں سب سے زیادہ شائع ہوئی ہیں اُن میں بھگوت گیتا اور رامائن سر فہرست ہیں۔ ان دونوں مذہبی صحیفوں کے نثری اور منظوم ترجمے نیز ان کی ضمنی داستانوں پر مشتمل تصانیف کی ایک بڑی تعداد اُردو میں موجود ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنّفین و مترجمین میں ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمان بھی برابر کے شریک ہیں۔''

(ہندوستان اُردو میں، صفحہ 74-73)

پروفیسر مظفر حنفی نے اپنے اس مضمون میں یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اردو زبان وادب میں اگر اسلام اور اسلام کے ماننے والی کتابوں پر مضامین اور کتابیں تحریر کی گئی ہیں تو اسی طرح اردو زبان وادب میں ہندو مذاہب اور ہندو مذاہب کی مقدس کتابوں پر بھی مضامین اور کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ آنے والی گفتگو میں یہ بات صاف ہوجائے گی، مظفر حنفی کہتے ہیں:

''القصہ نظر انصاف سے دیکھا جائے تو اُردو نے کسی امتیاز کے بغیر اپنے دامن میں رامائن کو بھی اُسی احترام وعقیدت اور محبت کے ساتھ جگہ دی ہے جس طرح اسلام اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے موضوعات کو۔ اس گفتگو کو میں علامہ اقبال کے چند اشعار پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو ان کی نظم 'امام ہند' سے ماخوذ ہیں۔

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

(ہندوستان اُردو میں، صفحہ 79)

انھوں نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور اس ملک میں پیدا ہونے والی زبان اردو میں اگر اسلام کے بارے میں کتابیں اور مضامین پائے جاتے ہیں تو وہیں ہندو مذاہب پر بھی کتابیں اور مضامین رقم کیے گئے ہیں۔ برج نارائن چکبست اردو شاعری کا بڑا نام ہے انھوں نے اپنی شاعری میں حب الوطنی، پیام آزادی اور اخوت ومحبت اور بھائی چارگی کا درس دیا ہے ایک مضمون میں پروفیسر مظفر حنفی اسی تعلق سے رقمطراز ہیں:

''برج نارائن چکبست کی کم وبیش تمام شاعری اصلاح معاشرہ، پیامِ آزادی، ہندو مسلم اتحاد اور حب الوطنی کے محور پر گھومتی ہے اور اس دور کے سیاسی اسٹیج پر رونما ہونے والے تمام اہم واقعات وکردار اس منظرنامے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بلاشبہ اُردو شاعری کا دامن اوائل بیسویں صدی کے ہندوستان میں رونما ہونے والی سیاسی بیداری اور تحریکِ آزادی کے نشیب وفراز کی تصویروں سے خالی رہ جاتا اگر چکبست نے اپنے قلم کا رُخ اس میدان کی جانب نہ موڑ دیا ہوتا۔ چکبست کی چند نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں براہِ راست نہ وطن دوستی کا پیغام دیا گیا ہے نہ کسی سیاسی واقعے یا حادثے کی تصویر کشی کی گئی ہے پھر بھی ان کے پس پشت یہ جذبہ کارفرما ہے کہ اہلِ وطن ان نظموں کے پس منظر میں ہندوستان کے عظیم الشان ماضی اور جلیل القدر شخصیتوں کو دیکھ کر اپنی حالتِ زار اور ملک کی عام پسماندگی کو محسوس کریں اور بہتر مستقبل کی فکر کریں۔ ایسی نظموں میں بطورِ خاص 'رامائن کا ایک سین' ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ مصیبت کے وقت رام چندر جی کی مستقل مزاجی اور فرض شناسی کا جذبہ اس نظم کا مرکزی خیال ہے اور یہی وہ خصوصیات تھیں جنھیں چکبست اپنے عہد کے ہندوستانیوں میں عام کرنا چاہتے تھے۔ اس پر تاثیر نظم کا ایک بند بطور مثال پیش ہے۔

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے، یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں، زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

(ہندوستان اُردو میں، صفحہ 87-86)

160 صفحات کی اس کتاب میں کل مضامین 13 ہیں اور پہلا مضمون 'اُردو شاعری اور ہندوستانیت' ہے۔ یہ مضمون صفحہ ۱۱ سے شروع ہو کر 58 صفحات پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان موضوعات پر انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے ہولی اور اردو شاعری، رامائن اردو میں، چکبست کی قومی نظمیں، جمہوری معاشرہ اور اردو، علاقائی زبانوں سے ادبی ترجمے اور قومی یکجہتی، اردو ادب اور مذہبی رواداری، اندرا گاندھی اردو شاعری میں، عصری سماج میں تشدد کا رجحان اور ہمارے دانشور، اردو ادب میں ہندوستانی عناصر کی تلاش، تحریک آزادی میں اردو شاعری کا کردار، جنگل کے مناظر اردو شاعری میں، رام کی عظمت اور اردو شاعری۔ اس کتاب کے مضامین یہ باور کرانے کے لیے کافی ہیں کہ مظفر حنفی کو قلم پر عبور حاصل تھا اور وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان مضامین کے ذریعے ہندوستانی قومی یکجہتی، بھائی چارگی، گنگا جمنی تہذیب اور آپسی محبت و بھائی چارگی کو بیان کیا گیا ہے تو وہیں ہولی، رام، جنگل،

گزشتہ چالیس پینتالیس برسوں میں میں نے متعدد ایسے مضامین قلمبند کیے، جن میں اردو کے جمہوری مزاج، اس کے شعرا اور ادبا کی وسیع النظری، مذہبی رواداری اور بے تعصبی، اس زبان کے مختلف اصناف ادب میں قومی یکجہتی کے مظاہرے اور اس میں ہندوستانی عناصر اور گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کی جانب کہیں واضح اور مفصل نیز کہیں اجمالاً اور اشاریاتی انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے پیش نظر کتاب میں انہیں بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ ان کے یکمشت مطالعے سے اردو زبان وادب کے اس تابناک پہلو کا مستحکم اور گہرا نقش پڑھنے والوں کے ذہن ودل پر مرتسم ہوسکے۔

مظفر حنفی نے اردو ادب کی تقریباً بیشتر شعری و نثری اصناف میں اپنی تخلیقی و علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو ادب میں اہم اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ان کے مضامین اور شاعری میں بھی ہندوستانی عناصر کو ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن،کلچر وثقافت، علاقے، موسم، پھل اور پھول، تہوار اور شہروں کے ناموں کو بھی اپنی تحریروں میں جگہ دے کر ہندستانی عناصر کو مضبوطی دی ہے۔

پیڑ، درخت اور دیگر ہندوستانی اشیا کو بیان کرکے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو بتانے کی کوشش کی ہے اسی کے ساتھ سیکولرزم بھی زیر موضوع ہے۔ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں اس کتاب کی ضرورت واہمیت اوراس کی افادیت ہمیشہ باقی اور روز افزوں رہے گی۔عرض مصنف صرف آدھے صفحے کا ہے اور وہ اس طرح ہے:

”گزشتہ چالیس پینتالیس برسوں میں میں نے متعدد ایسے مضامین قلمبند کیے، جن میں اردو کے جمہوری مزاج، اس کے شعرا اور ادبا کی وسیع النظری، مذہبی رواداری اور بے تعصبی،اس زبان کے مختلف اصناف ادب میں قومی یکجہتی کے مظاہرے اور اس میں ہندستانی عناصر اور گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کی جانب کہیں واضح اور مفصل نیز کہیں اجمالاً اور اشاریاتی انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے پیش نظر کتاب میں انھیں بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کردیا گیا ہے تا کہ ان کے یکمشت مطالعے سے اردو زبان وادب کے اس تابناک پہلو کا مستحکم اور گہرا نقش پڑھنے والوں کے ذہن ودل پر مرتسم ہوسکے“۔ (ہندوستان اردو میں، صفحہ 9)

اس طرح سے یہ کتاب گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔اسی طرح سے ڈاکٹر مظفر حنفی نے نثر کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ہندوستانی کلچر وثقافت اور تہذیب

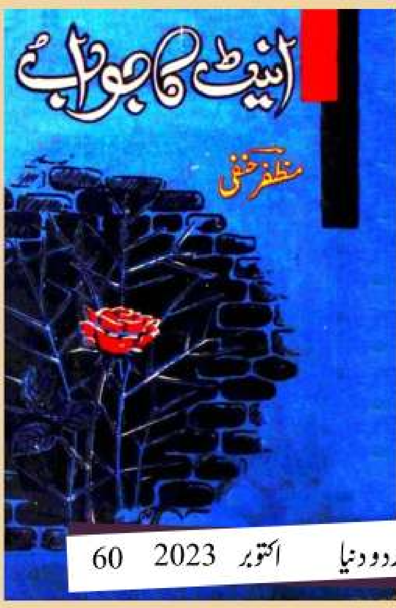

وتمدن اور ہندوستانی عناصر کو پیش کیا ہے۔انھوں نے کئی جامعات اور اسکول کے لیے ترانے بھی رقم کیے ہیں انھیں ترانوں میں سے ایک ترانہ پیش خدمت ہے۔یہ ترانہ سینٹرل یونیورسٹی کشمیر کے لیے تحریر کیا گیا تھا واضح ہو کہ حنفی نے نو ترانے سینٹرل یونیورسٹی کشمیر کے لیے ہی رقم کیے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب و ثقافت،رسم ورواج، تہوار، مقام جگہ کا تذکرہ پروفیسر مظفر حنفی کی شاعری میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔اب ان کی شاعری سے شہر، گاؤں، آسمان، زمین، جنگل، پیڑ پودے، پھل پھول، موسم، کھان، پکوان وغیرہ کے تعلق سے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بچپن میں آکاش کو چھوتا سا لگتا تھا
اس پیپل کی شاخیں اب کتنی نیچی ہیں
سادہ کاغذ کی کہانی کا پس منظر ہیں
دوج کا چاند، ہرے بانس چمکتا پانی
جھوم کر کیلے کے پودے نے بلایا تھا
وہ بھی نکلا کوئلے کی گرد میں لتھڑا ہوا
موسم نے کھیت کھیت اگائی ہے فصل زرد
سرسوں کے کھیت ہیں کہ جو پیلے نہیں رہے
ملہاریں گاتے ہیں مینڈک تال کنارے
آسمان پر بھورے بادل مٹک رہے ہیں
اس پیپل کی شاخیں اب کتنی نیچی ہیں
سادہ کاغذ کی کہانی کا پس منظر ہیں
جب گاؤں ترقی کے لیے شہر میں آیا
ناپید ہوئے پھول ٹھکانے لگے جگنو
اس نے اس انداز سے جھٹکا اپنے بالوں کو
میری آنکھوں میں در آیا پورا بجلی بن
مظفر کس لیے بھوپال یاد آنے لگا
کیا سمجھتے تھے کہ دلی میں نہ ہوگا آسماں

مظفر حنفی کی ایک نظم ہولی کے عنوان سے ہے اسی کا ایک بند ملاحظہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اس میں کس حد تک ہندوستانی تہذیب اور کلچر وثقافت کو بیان کیا ہے اور مشہور ومعرف تہوار ہولی کے بارے میں ان کا قلم کس طرح کا نقشہ کھینچتا ہے۔

گلشن پہ رنگ ونور کی بدلی سی چھائی ہے
پودوں کو ہے خمار، ہوا پی کے آئی ہے
پھولوں کو دیکھیے تو عجب دلربائی ہے
رنگینیوں سے آج مری آشنائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

مجملہ ایں کہ مظفر حنفی کی مجموعی خدمات کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اردو ادب کی تقریباً بیشتر شعری و نثری اصناف میں اپنی تخلیقی و علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو ادب میں اہم اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ان کے مضامین اور شاعری میں بھی ہندوستانی عناصر کو ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن، کلچر وثقافت، علاقے، موسم، پھل اور پھول، تہوار اور شہروں کے ناموں کو بھی اپنی تحریروں میں جگہ دے کر ہندستانی عناصر کو مضبوطی دی ہے۔انھوں نے ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں مثلاً ہندی، اڑیا، گجراتی بنگالی زبانوں کے افسانوں اور ناولوں کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو زبان وادب کو وسعت دی وہیں قارئین اردو کو ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے ادبیات کو بھی جاننے، پڑھنے سمجھنے، سیکھنے اور فائدہ اٹھانے کا حسین موقع فراہم کیا ہے۔ان کی ادب کے تئیں سچی محبت، گہری لگن وجستجو، محنت کا جذبہ اور جہد مسلسل کے ذریعے ادب میں انھوں نے خود اپنا ایک اہم اور نمایاں مقام بنایا ہے۔شاعر، ادیب، مترجم، محقق وناقد کی حیثیت سے ادب کے ہر میدان میں کامیابی سے گزرنے کی انھوں نے کوشش کی۔اسلوب کی طرح ان کی شخصیت کی بعض اہم خوبیاں ان کے ادب میں در آئیں مثلاً خلوص، محبت، ہمدردی اور اعتدال وتوازن جوان کی شخصیت کی اہم خصوصیات ہیں وہی ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں جا بجا ہندستانی عناصر کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔بحیثیت صحافی ہو یا مدرس یا پھر شاعر و ادیب اور محقق وناقد انھوں نے اپنی تحریروں میں اعتدال و توازن، خلوص ومحبت کے جذبات کو بروئے کار لا کر ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام بنایا ہے اور اسی انفرادیت کی وجہ سے ان کا شمار اردو کی نامور ادبی ہستیوں میں ہوتا ہے۔

■

Dr. Md Khushtar
Research Dept of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046 (Telangana)
Mob.: 8341116397

لذت کشِ آلام کا شاعر سید فضل المتین چشتی

نورین علی حق

اجمیر شریف آٹھ صدیوں سے نہ صرف مذہبی طور پر برصغیر ایشیا کا مرکز رہا ہے بلکہ معتدل و متوازن مذہبی افکار کا مرکز بھی رہا ہے اور وہاں کے خدام و سید زادگان نے ہمیشہ دانشوری کا بھی ثبوت دیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں اجمیر شریف کے خدام اور سید زادگان کی نمائندگی رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی ذاتی محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے بلکہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی نظر کرم بھی ہے کہ وہاں سے ہمیشہ علم و تعلم کا تعلق مضبوط و مستحکم رہا ہے۔ انھی با اثر، ذی علم اور دانشور حضرات میں ایک اہم نام حضرت مولانا سید فضل المتین چشتی کا بھی ہے، جن کی پیدائش اجمیر شریف میں 1939 میں ہوئی اور وفات بھی اجمیر شریف میں ہی 2023 میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ خادم خواجہ کی حیثیت سے پورے ملک میں شہرت رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ ایک شیخ طریقت کے طور پر بھی بخوبی جانے جاتے ہیں۔

سید فضل المتین چشتی اپنی سادگی، تواضع، انکساری اور اخلاق کی وجہ سے بھی عوام میں خاصے مقبول رہے ہیں، ان کے مریدین و متوسلین اور عقیدت مندوں کا حلقہ حیدرآباد دکن سے بنگال تک اور کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے حلقے میں بھی ان کی ایک منفرد اور ممتاز شناخت رہی ہے۔ سید فضل المتین چشتی کو اگر ہم علمی پیمانے پر پرکھنے اور ناپنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہمیں بحیثیت مدیر، بحیثیت شاعر، بحیثیت نثر نگار اور بحیثیت دانشور بہت نمایاں نظر آتے ہیں، بحیثیت مصنف بھی ان کا مقام اور مرتبہ مسلم ہے۔ ان کی متعدد کتابوں میں ایک شعری مجموعہ جس کا عنوان ہے کلام، 1973 میں راجستھان ساہتیہ اکادمی، ادے پور سے شائع ہوا، اس کے علاوہ انھوں نے اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی کہ برصغیر ہندو پاک کے اردو حلقے کو اجمیر شریف کے شعرا سے متعارف کرایا جائے، چنانچہ انھوں نے موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی، جو مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے علاوہ ہم سب جانتے ہیں کہ برصغیر ہندو پاک میں چشتی صوفیا نے ہم آہنگی، مساوات، یگانگت، اعتدال اور توازن کا جو درس دیا ہے، اس کے بانی مبانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں لہٰذا انہیں نہ صرف برصغیر ایشیا بلکہ پوری دنیا میں ایک عظیم صوفی کے طور پر شہرت حاصل ہے، ان کے علاوہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فریدالدین گنج شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے علمی و فکری، مذہبی اور صوفیانہ و خانقاہی خدمات سے بھی ہم سب آشنا ہیں۔ حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے مرید و خلیفہ حضرت علامہ کمال الدین چشتیؒ ہیں، جن کے بارے میں عمومی طور پر صوفی تذکرے اور صوفی تاریخ کی اہم کتابیں بھی خاموش ہیں لیکن سید فضل المتین چشتی نے حضرت علامہ کمال الدین چشتیؒ پر تحقیقی کارنامہ انجام دیا اور تذکرہ خواجگان چشت گجرات کے عنوان سے کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں نہ صرف علامہ کمال الدین چشتی اور ان کی اولاد و امجاد کی تفصیلات درج ہیں بلکہ ان کے اہم خلفا اور خلفا کے خلفا کی سوانح اور تذکرے بھی موجود ہیں، جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سید فضل المتین چشتی کا اشہب قلم اپنی جودت اور توانائی کا ثبوت دیتا ہے وہیں وہ بحیثیت خطیب بھی شہرت رکھتے ہیں۔ سید فضل المتین چشتی کے دو خطبوں کا مجموعہ 'متین میاں کی دو تقریریں' کے عنوان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ سید فضل المتین چشتی مصنف کے علاوہ اہم مدیر بھی ثابت ہوئے ہیں یہ حسن اتفاق ہے کہ راجستھان ساہتیہ اکادمی نے جب 1964 میں اپنا اردو ترجمان نخلستان، ادے پور شائع کرنا شروع کیا تو آپ اس رسالے کے پہلے مدیر نامزد کیے گئے اور اپنی صحافیانہ مدبرانہ، دانشورانہ اور مدیرانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ ان کے اداریے اختصار میں ایجاز کا بین ثبوت ہیں۔ سید فضل المتین چشتی دو بار رسالہ نخلستان، ادے پور کے مدیر رہے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ذاتی صرفے پر اجمیر شریف سے بارگاہ کے عنوان سے ایک ماہنامہ جاری کیا، اس رسالے میں انھوں نے جہاں ادبی مضامین، ادبی تحقیقات، ادبی تنقید اور شاعری کو شائع کرنے کا التزام کیا، وہیں اس بات کا بھی بھرپور خیال رکھا کہ صوفی ادب کو اس کی اپنی اصلی شناخت کے ساتھ پیش کیا جائے، صوفی ادب کو جس نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ انھوں نے پیش کیا وہ دیگر متصوفانہ رسائل شائع کرنے والے مدیران کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید فضل المتین چشتی جہاں مدیر، مصنف اور محقق کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہیں، وہیں ان کی شناخت بحیثیت شاعر بھی بہت توانا اور مستحکم ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کی دیگر علمی اور فکری خدمات سے زیادہ ان کی شاعری شہرت رکھتی ہے وہ نہ صرف غزل کے بہترین شاعر تھے بلکہ پرگو نظم نگار بھی تھے ان کے کلام بیسویں صدی کی ساتویں، آٹھویں اور نویں دہائیوں میں بکثرت شب خون، تحریک، نخلستان اور بارگاہ، اجمیر میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہندوستان کے معروف

رسالے استعارہ نے بھی انھیں خاصا مقام دیا اور ان کے کلام کو شائع کیا۔

ان کے شعری سرمایے میں تنہائی غالب عنصر کے طور پر سامنے آتی ہے ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں ہر جگہ تنہائی اور تنہائی کی رنگا رنگی، زندگی اور زندگی کی نیرنگیاں بکھری نظر آتی ہیں ایسا لگتا ہے کہ سید فضل المتین چشتی انسانی تاریخ کی تنہائی کے احساس کو اپنی روح میں شامل کر کے عوام کے سامنے پیش کر رہے ہیں، ہر دوسرے، تیسرے شعر میں تنہائی جا بجا اپنا رنگ دکھاتی رہتی ہے، تنہائی ان کے یہاں کسی ایک معنی میں نہیں آتی، کسی ایک رنگ میں نہیں آتی، تنہائی وہاں متنوع ہے، رنگا رنگ ہے۔ کہتے ہیں انسان کی روح اور اس کے دشت جسم میں تنہائی کا احساس ہر زمانے اور ہر عہد میں رہا ہے جس کا اظہار اپنے اپنے طریقے اور سلیقے سے انسان کرتا رہا ہے لیکن بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں سید فضل المتین چشتی جس طرح تنہائی کا اظہار اور تنہائی کے احساس کا اظہار کرتے ہیں وہ لائق دید وداد ہے۔ اتنی تنہائی اتنی اداسی اتنی مایوسی اتنی سیاہی جہاں کہیں ہمیں نظر آتی ہے ہم حیران وششدر رہ جاتے ہیں، ہم اس کے طلسم ہائے معانی پر غور کرنے لگتے ہیں لیکن ہم طلسم ہائے معانی پر بس غور ہی کر سکتے ہیں۔ شاعر جس احساس یا جس حسی پیکر کے ساتھ تنہائی کو پیش کرتا ہے اس کے تجربے سے گزرنا ہمارے لیے یا عام فہم لوگوں کے لیے یا کہنا چاہیے کہ غیر شاعر کے لیے آسان کام نہیں ہے۔

میں اجنبی نہیں ہوں تیرا ترجمان ہوں
خاموشیوں کے شہر کبھی دے صدا مجھے
میرا وجود بن گیا صحرا کی تشنگی
تیرے بدن کی چاہیے اب تو گھٹا مجھے
جن سے تھی پہچان وہ سب جا بسے ہیں دور دیس
میری بستی میں رہا میرا شناسا کون ہے
خون کے رشتے بھی جھوٹے ہو گئے ثابت متین
کس کو میں اپنا کہوں میرا شناسا کون ہے
تنہائیوں میں ہجر کی یاد آ گیا ہے کون
کھلنے لگے ہیں زخم مہکنے لگی ہے رات
زندگی تجھ سے کسی روز بچھڑ جاؤں گا
ایک پتے کی طرح شاخ سے جھڑ جاؤں گا
مت پوچھو کہ کیا ہم پہ گزرتی ہے تیرے بعد
بیٹھے ہیں جہاں صبح وہیں شام ہوئی ہے
مجھ کو تنہا جو پا رہی ہے رات
خوف سے سہمی جا رہی ہے رات
کتنے سنسان راستے ہیں متین
کتنی چپ چاپ جا رہی ہے رات

جانشیں کس کو کریں اپنا بنائیں کس کو
کوئی ہم راہ نہیں راہ دکھائیں کس کو
دشت تنہائی ہے اور درد کا لمبا رستہ
ہم سفر کوئی نہیں حال سنائیں کس کو

سید فضل المتین چشتی کے اشعار میں موجود تنہائی جس طرح اپنے بال و پر پھیلاتی ہے اور وسیع تر امکانات پر پھیل جاتی ہے تنہائی کا یہ احساس ان کے یہاں غیر شعوری طور پر نہیں آیا ہے. ان کی تنہائی کا اپنا ایک ذاتی تصور ہے اس کی ایک ذاتی تعبیر ہے، جس سے وہ سر مو انحراف کرنا گوارا نہیں کرتے، چونکہ ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا جو عہد اور زمانہ ہے، وہ جدیدیت کا زمانہ ہے اور جدیدیت کے زمانے میں تنہائی کو جو اہمیت حاصل تھی یا تنہائی کی جو افادیت تھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ہم سب اس افادیت اور اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ نہ صرف سید فضل المتین چشتی بلکہ خود شمس الرحمٰن فاروقی صاحب بھی تنہائی کی وکالت میں سرگرداں نظر آتے ہیں، سید فضل المتین چشتی تنہائی کے حوالے سے رسالہ تحریک دہلی، مئی 1977 کے شمارے میں مباحثے کے کالم کے تحت یوں گویا ہیں:

''تنہائی کا احساس انسان کا مقدر ہے، یہ المیہ اس کے جبلی احساس کا جز و لاینفک ہے۔ تنہائی کے احساس کا اگر سماجی نظاموں سے کوئی تعلق پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو وہ محض نسبتی اور وقتی تعلق ہوگا، وسیع کائنات میں انسان کی ذات از ازل تا ابد تنہا ہے۔ تنہائی کی تعریف آسان نہیں ہے، یہ مستقل اور مفصل بحث کا موضوع ہے۔''

چشتی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ تنہائیوں کی بات کرتے ہوئے صرف انسانوں کی عدم موجودگی یا ایسے انسانوں کی عدم موجودگی کا نوحہ نہیں پڑھتے، جس سے بات کی جا سکے بلکہ وہ تنہائیوں کی بات کرتے ہوئے طرح طرح سے تنہائیوں کے معانی اپنے اشعار میں پیدا کرتے ہیں اور ندرت و لطافت پیدا کرتے ہیں۔ کئی مقام پر طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے کہ اس طرح سے بھی تنہائی کو دور کرنے کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، جیسے مندرجہ بالا اشعار میں ایک شعر میں نے نقل کیا ہے۔

میں اجنبی نہیں ہوں تیرا ترجمان ہوں
خاموشیوں کے شہر کبھی دے صدا مجھے

بظاہر دیکھا جائے تو اس میں تنہائی کی تو بات ہو رہی ہے لیکن آپ غور کریں کہ مصرعہ ثانی میں وہ شہر خموشاں کو مخاطب کر رہے ہیں، اپنی تنہائیوں سے ایک انسان اس طرح مضطرب و مضمحل اور پریشان ہے کہ وہ جمادات کو مخاطب کر رہا ہے کہ تو مجھے آواز دے، یہ جو ندرت ہے، اس طرح کی ندرتیں سید فضل المتین چشتی کی شاعری کو حسی اور محسوساتی شاعری میں امتیازی مقام پر لا کھڑا کرتی ہیں. جمادات نباتات اس طرح کی اشیا کو مخاطب کرنے کا چلن ہمارے یہاں کم کم ہے لیکن جن شعرا، ادبا اور تخلیق کاروں کے یہاں یہ طرز اور یہ ادا پائی جاتی ہے ان کے ادب کا کینڈا ذرا مختلف اور منفرد نظر آنے لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ مقامات ہیں یا کہنا چاہیے کہ یہی وہ مجذوبانہ اور قلندرانہ اوصاف ہیں، جو سید فضل المتین چشتی کے مقام کو بحیثیت شاعر مسلم کرتے ہیں، ایک جگہ اور آپ دیکھیں کہ۔

مجھ کو تنہا جو پا رہی ہے رات
خوف سے سہمی جا رہی ہے رات

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں پھر وہ ایک کھیل کھیلتے ہیں جسے ہم تقلیب لفظ و معنی کا کھیل کہہ سکتے ہیں۔ رات علامت ہے خاموشی کی، رات تنہائی کا، اداسی کا سیاہی کا استعارہ ہے، جس سے انسان خوف کھاتا ہے، رات کے سناٹے میں انسان تنہا اور اکیلا کہیں جانا بھی پسند نہیں کرتا چونکہ اسے خوف آتا ہے، وہ اپنے ارد گرد آس پاس دیکھتا ہے خوف کے مارے، ڈر کے مارے، لیکن سید فضل المتین چشتی یہاں تقلیب لفظ و معنی کا کھیل کھیل رہے ہیں کہ یہاں اس شعر کے مصرعہ ثانی میں رات خوف سے سہمی جا رہی ہے، انسان خوف سے نہیں سہم رہا ہے، رات سے انسان ڈر نہیں رہا ہے، بلکہ رات خوف سے سہمی جا رہی ہے، انسان کی درندگی کا یہ چہرہ اردو شاعری میں شاذ و نادر ہی پیش کیا گیا ہے، جہاں رات، انسان کی تنہائی، اس کے باطن کی سیاہی، اجاڑ پن، تاریکی اور تنہائی کے خلاف اس کے خاموش مرثیے سے سہمی جا رہی ہے۔

بے جان اشیا کے منھ میں زبان رکھنے اور ان کی آنکھوں میں بصارت رکھ دینے کا عمل ان کے یہاں مسلسل جاری رہتا ہے، وہ کہیں ٹھہرتے نہیں، وہ ٹھہر کر یہ نہیں سوچتے کہ ہم بے جان اشیا سے کس طرح بات کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا انہیں دیکھنے کے لیے مخاطب کر سکتے ہیں یا ان سے دیکھنے کا تقاضا کر سکتے ہیں۔ قدرت کی تمام تخلیق کردہ اشیا ان کی شاعری کے دائرہ کار میں آتی ہیں وہ اشیا اور اجرام فلکی پر غور کرتے ہیں اور انھیں مخاطب کرتے ہیں تو کہیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ ہمیں دیکھ کر شرمندہ ہو رہے ہیں۔ عام فہم اذہان جن اشیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ وہاں بھی زبان اور آنکھیں رکھ دیتے ہیں پھر ان سے باتیں کرتے ہیں۔

مے لاؤ غزل گاؤ قریب آؤ شب ماہ
شرمندہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی ہے

شاعر یہاں اپنی تنہائی اور اداسی سے اکتا گیا ہے اور اکتا

کر چودھویں کی شب کے چاند سے شرمندہ ہو رہا ہے کہ اس پورے چاند کی رات میں بھی مجھ پر اداسی اور تنہائی کا احساس غالب ہے، یہ جو اداسی کا ماحول ہے اسے وہ ختم کرنا چاہتا ہے، اسی لیے کہتا ہے مے لاؤ غزل گاؤ قریب آؤ شب ماہ شرمندہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی ہے، اجرام فلکی کی طرف مخاطب ہو کر انھوں نے چاند کو مخاطب کیا ہے بلکہ چاند کے شرمندہ ہونے کی بات کی ہے۔

چشتی صاحب زندگی کرنے کے لیے بھی خاصی تگ و دو کرتے نظر آتے ہیں، زندگی کو مختلف چشموں سے وہ دیکھتے ہیں، زندگی کی رنگارنگی پر غور کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ زندگی کے تمام رنگوں کو وہ قریب سے دیکھ سکیں لیکن زندگی کو دیکھنے اور زندگی کو سمجھنے کی فکر میں چلتے چلتے وہ تھک بھی جاتے ہیں ٹوٹنے لگتے ہیں ٹوٹ کر بکھرنے لگتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں وجودی جھنجھلاہٹ در آئی ہے، زندگی کے حوالے سے ان کی شاعری میں طرح طرح کے اشعار آئے ہیں، کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ختم ہوتے ہوتے لو دے اٹھتی ہے تو کہیں چلتے چلتے تھک کر بکھر جانا چاہتی ہے، یہ زندگی کے آلام، مصائب غموم، اضطراب، اضمحلال اور مسائل کو جتنے ماہرانہ انداز میں پیش کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا رشتہ زندگی یا شاید زندگیوں سے کافی گہرا رہا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کی تفہیم کی فکر میں انھوں نے اپنی زندگی گزار دی ہو، جس طرح ان کی شاعری میں تنہائی اپنا رنگ چولا اور لباس بدل بدل کر آتی ہے، اسی طرح زندگی بھی اپنا رنگ و روغن اور اپنے چہرے بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔

کیسے بچائیں دامن احساس و آگہی
لو دے اٹھی ہے آج تو خاموشیِ حیات

زندگی تجھ سے کسی روز بچھڑ جاؤں گا
ایک پتے کی طرح شاخ سے جھڑ جاؤں گا

وہ زیست جو لذت کش آلام رہی ہے
وہ زیست ترے نام سے منسوب ہوئی ہے

لٹ گیا ساتھ ترے کچھ نہ رہا زاد سفر
زندگی اور ترا قرض چکائیں کیسے

مرنے کی ہوس ہے ہمیں دیوانے ہوئے ہیں
جینے کے اگر پاس ہوں آداب تو دیجے

نظم زندگی

زندگی/ اتہ بہ تہ دھند میں/ اپنا چہرہ لپیٹے ہوئے/ چاہتی ہے کہ چھپتی رہے/ کس میں ہمت ہے جو/ اس کو دیکھے! اسے جان لے/ اس کو پہچان لے!!!

زندگی اور اس کے مصائب، موت، خودکشی، گردش ایام، زخم تازہ کا مطالبہ اور جنونی شعری اظہار میرے خیال میں فلسفہ وجودیت کے عناصر اور خام مواد ہیں۔

یہ فرط فرداً یا اجتماعی طور پر اظہار کا وسیلہ بنیں، بہرحال فلسفہ وجودیت کی تشکیل کرتے ہیں اس طور پر دیکھا جائے تو سید فضل المتین چشتی کی شاعری وجودی بحثوں سے اٹی پڑی ہے، وہ کہتے ہیں۔

شعلہ صفت وہ آگ اگلتا دکھائی دے
میرا وجود مجھ کو پگھلتا دکھائی دے
ٹوٹ کر بکھرا ہے میرے ہاتھ سے میرا وجود
اس جہاں میں مجھ سا محروم تمنا کون ہے
اے گردش ایام کوئی زخم نیا اور
اک موڑ پہ اب عمر رواں ٹھہر گئی ہے
مدت سے کسی درد کا تحفہ نہیں آیا
یا گردش ایام ہمیں بھول گئی ہے
ہر طرف ہے سکوت غم طاری
داستاں کیا سنا رہی ہے رات
ہم سنگ گراں ہیں خس و خاشاک ہیں کیا ہیں
معلوم ہو پہلے کوئی سیلاب تو دیجے
اے گزرے ہوئے لمحو! کوئی نقش ابھارو
آئینہ تخیل پہ اب گرد جمی ہے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سید فضل المتین چشتی کی شاعری میں وجودیت کے تمام عناصر اور اقسام اکٹھا ہو گئے ہیں اور ہر طرح سے وہ اپنے شعر کو وجودی فلسفے سے جوڑتے نظر آتے ہیں، اس کی کئی وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ جب ان کی شاعری اپنی معراج کو پا رہی تھی تو وہ عہد جدیدیت کا عہد تھا اور دوسری طرف وہ خود ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، جس کا گہرا تعلق فلسفہ وحدۃ الوجود سے ہے، بالخصوص ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے صوفیوں نے اپنے اپنے طریقے پر فلسفہ وحدۃ الوجود کی تشریح و تعبیر کا کارنامہ انجام دیا ہے، ادیب ہونے کی حیثیت سے فلسفہ وجودیت اور چشتی صوفی ہونے کی حیثیت سے فلسفہ وحدۃ الوجود کا تعلق سید فضل المتین چشتی سے گہرا رہا ہے۔ انھوں نے دونوں فلسفیانہ نظریوں سے استفادہ کیا۔

سید فضل المتین چشتی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فلسفے کی ان دونوں قسموں کے سرچشموں سے سیراب ہوتے ہیں اور جب وہ اپنے شعری اظہار کا وسیلہ وجودیت کو بناتے ہیں تو ان کی وجودیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

ان کی نظموں کے موضوعات بھی عموماً زندگی کے مسائل، تنہائیاں، تاریکیاں اور دیگر وجودی مسائل سے لبریز ہیں، انھوں نے جہاں پوری مہارت کے ساتھ غزل گوئی کی، وہیں انھوں نے نظم پر بھی ایک مضبوط ہاتھ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس زمانے میں جب نظم کی ہیئت پر بہت سے سوالات اٹھ رہے تھے تو انھوں نے کہا تھا:

''موضوع اور ہیئت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، موضوع کے تقاضے ہیئت کو جنم دیتے ہیں اور جدید ادب کے نئے موضوعات کے سبب جو نئی ہیئتی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، وہ لازمی تھیں، یہ تبدیلیاں ادب کے سرمایے میں اضافے کا سبب ہوئی ہیں، کارآمد ہیں، مفید ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا ہے کے مصداق یہ تبدیلیاں اور بھی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہیں۔''

ان کی دونوں نظمیں دیکھیں اور ان نظموں میں زندگی سے ان کی دلچسپیوں کا اندازہ کریں۔

انجام

چمکتا ہوا گرم سورج پگھلنے لگا ہے/ جھکا آ رہا ہے/ زمیں رقص کرتی ہوئی دھنس رہی ہے/ ہٹی جا رہی ہے/ اب انجام اپنا نظر آ رہا ہے

ایک نظم

زوال آمادہ زندگی کو/ بشر کی فکر رسا کے ہاتھوں/ گرفت کر کے/ ازل ابد کے تمام رشتے/ تلاش کر لو/ کہ حاصل کائنات یہ ہے/ یہی ہے سود و زیاں آخرت کا/ صلے میں جس کے/ ملے گی/ اپنی وہ کھوئی جنت/ جہاں سے ہم نے سفر کیا تھا/ ہمیں سفر کی سزا ملی تھی

سید فضل المتین چشتی نرے شاعر کے طور پر سامنے نہیں آتے بلکہ وہ جہاں ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہیں تو وہ ایک دانشور کے طور پر بھی اردو حلقے میں معروف ہیں۔ ان کی کتابیں مختلف حلقوں میں تحسین کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ان کے اشعار اور ان کا شعری نظریہ نہ صرف جدیدیت پسندوں، بلکہ مابعد جدید عہد کے پرستاروں کے لیے بھی یکساں طور پر دلچسپی کا سامان ہے، ان کی مذہبی شاعری ہو یا ادبی شاعری غزلیہ شاعری ہو یا نظمیہ ہر جگہ شعور و آگہی کی ایک گہری لکیر نظر آتی ہے، جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے، چشتی صاحب نے جو شعری سرمایہ چھوڑا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، چونکہ اس شعری سرمایے میں نہ صرف عصری حسیت موجود ہے بلکہ مستقبل قریب کے ادبا اور شعرا کے لیے وہ شعری سرمایہ نشان راہ بھی ہے۔

■

Dr. Noorain Ali Haque
Near Adam Seva Bhawan
Gali No-5, Wazirabad Village
Delhi- 110084
Mob.: 7011529033, 9210284453

ساحر داؤد نگری

ناشاد اورنگ آبادی

اورنگ آباد ضلع سے کچھ دور تاریخی شہر داؤد نگر کے نزدیک قصبہ شمشیر نگر میں عین الحق خاں ناشاد اورنگ آبادی ابن محمد ہدایت اللہ خاں 15 جنوری 1935 کو پیدا ہوئے۔ اس قصبے کو مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے دور میں نواب شمشیر خاں نے آباد کیا تھا جو اس دور میں اس علاقے کے صوبے دار تھے۔ جس کا ذکر صوبہ بہار کے پہلے گورنر جناب آر آر دیواکر نے اپنی تاریخی کتاب 'بگلمس آف بہار' میں بھی کیا ہے۔ اسی قصبے سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہسپورہ ہائی اسکول سے میٹرک کیا پھر بی کام کرنے کے بعد وہ محکمہ ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ناشاد کو گھر سے دور کئی شہروں میں قیام کرنا پڑا، جہاں شعر و ادب کی محفلیں اکثر و بیشتر سجا کرتی تھیں۔ کئی اساتذہ اور مشاہیر شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع ان کو ملتے گئے جس کی وجہ سے ان کا شعری ذوق بڑھتا گیا اور شعری صلاحیت بھی نکھرتی گئی۔ اپنے ایک 'چو بولے' میں ناشاد اپنا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

مولد ہے شمشیر نگر نزد اورنگ آباد
خوش دل اور خوش ذوق ہیں عین الحق ناشاد
عین الحق ناشاد ہیں شعرا میں مشہور
بچپن ہی سے رہے گھر سے کوسوں دور
کبھی فرید آباد میں کبھی سمستی پور
ان کو بھول نہ پائے گا ہرگز گورکھپور

ناشاد اورنگ آبادی نے 1965 سے باضابطہ شاعری شروع کی، ان کے کئی شعری مجموعے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں پرواز سخن، لمحے لمحے کا سفر، رختِ سفر، ہم سفر غزلیں قابل ذکر ہیں تو ہندی میں میل کا پتھر، ہم سفر غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ ان مجموعوں میں ان کی نظمیں اور قطعات بھی ہیں، حمد و نعت بھی، غزلیں بھی۔ اس کے علاوہ ایک کتاب 'غزل کیسے لکھیں' دیوناگری میں شائع ہوئی جس میں غزل کے تعلق سے مضامین اور ہندی اردو شعرا کی غزلیں شامل ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ناشاد کو جتنی مقبولیت اردو حلقوں میں ملی ہے اتنی ہی مقبولیت انھیں ہندی میں بھی حاصل ہے۔ ناشاد اورنگ آبادی کی غزلیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں داؤد نگر کی مولانا حالی لائبریری کے ترجمان سہ ماہی 'حالی' میں شائع ہوتی رہی ہیں جس کی ادارت خاکسار کے ذمے تھی۔

ناشاد اورنگ آبادی نے گو کہ اردو کی بیشتر اصناف میں شاعری کی ہے لیکن ان کی اصل شناخت غزلیہ شاعری سے ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری خونِ دل سے لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناشاد کی غزل میں کلاسیکیت کا عنصر ہے لیکن انھوں نے جدیدیت سے بھی رشتہ قائم کیا ہے۔ وہ اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار بالعموم سلیس اور شائستہ انداز میں کرتے ہیں۔ انھیں الفاظ و محاورات کے مؤثر استعمال کا سلیقہ بھی ہے۔ انھوں نے جہاں اپنے درد کو بیان کیا ہے وہیں زمانے کے تبدیل ہوتے رنگ اور بدلتی قدروں کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

ناشاد اورنگ آبادی نے زندگی کے ہر چھوٹے بڑے تجربے کو نہایت عمدگی سے اپنے شعری قالب میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کیا۔

ناشاد اورنگ آبادی کے اشعار سہل، سادہ و شگفتہ ہیں، جنھیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناشاد صاحب کو زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ انھیں اپنی زبان دانی اور غزل گوئی پر ناز ہے۔

ناشاد اورنگ آبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، لیکن انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور ان کی ساری نظمیں پابند ہیں۔ ان کی ایک بہت ہی مشہور نظم ہے:

اردو زباں کو سیکڑوں لعل و گہر ملے
خسرو رضا و سید شاد و شرر ملے
فانی ولی و حق سلیمان کی طرح
سودا و ذوق و مومن و داغ و ظفر ملے
یکتائے فن امیر، حسن، درد، اور نسیم
وہ مصحفی و انشا و یاد و اثر ملے
دریائے علم شبلی و حالی سے عہد ساز
اقبال و میر، غالب و جوش و جگر ملے
ساحر، قتیل، حفیظ، خدا بخش سے سپوت
شاداں، شکیل و راسخ و برق و شجر ملے
بیدی و کرشن و پریم و جگن ناتھ و جاں نثار
اس کو ہر ایک دور میں لختِ جگر ملے
منٹو، سریر، وعصمت و حیدر سے اہل فن
عاکف، یگانہ اور عدم وقت پر ملے
نارنگ و جین کول و آنند اور سوز
اس کو رفیق وقت کئی باثر ملے

اعجاز و افتخار و فصا نادم و سرور
فاروقی و سیماب سے کچھ دیدہ ور ملے
مائل، تلوک، کام و آغاز و امتیاز
اوزان اور بحور سے سب باخبر ملے
کشمیری لال و صادق و جاوید اور خموش
اہل کمال و فن کئی اہل نظر ملے
کچھ لوگ اس پہ دل و جاں سے ہیں نثار
ان میں عقیل و حامد و غافل کنور ملے
ہندی کے ساتھ ساتھ جو اردو نواز ہیں
ان میں ترون و شرون و سورج امر ملے

ناشاد کی غزلوں میں دبستان دہلی بھی دیکھنے کو ملے گا اور دبستان لکھنؤ بھی لیکن وہ دبستان عظیم آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں جہاں اپنے ذاتی محسوسات اور مشاہدات کو پیش کیا وہیں وہ اپنے عہد کے مسائل سے بھی بے خبر نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر جس طرح کے مسائل کا موجودہ عہد کو سامنا ہے ان مسائل کی بہت ہی خوبصورت انداز میں انھوں نے اپنی شاعری میں عکاسی کی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے جن میں آپ کو آج کے عہد کا رنگ نظر آئے گا۔

کوئی روٹی کو پریشان تو روزی کو کوئی
خوش نہیں ہے کوئی انسان سنو یا نہ سنو
ہے کہیں شور، کہیں چیخ کہیں ہنگامہ
آنے ہی والا ہے طوفان سنو یا نہ سنو

اسی طرح یہ اشعار بھی دیکھیں۔

ہم جلاتے رہیں ہر روز وفاؤں کے چراغ
اور وہ جان کے وعدوں سے مکرتے جائیں

ان کی شاعری عام فہم الفاظ سے مزین ہے جو سامعین اور کم تر درجے کے لوگ بھی بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں کتنے سادہ اور سلیس ہیں:

سیکڑوں سنگ میل سے گزرا نہ ملا پیڑ سایہ دار مجھے
چاہتا ہوں کہ چاند کو چھولوں اپنی اوقات بھول جاتا ہوں

انھوں نے اردو کے مشاہیر شعرا کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے جس کا اثر ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کلام اقبال کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اگر یہ مطالعہ نہ ہوتا تو شاید اس رنگ میں وہ یہ اشعار نہ کہہ پاتے۔

جو ہوسکے تو حیاتِ دوام پیدا کر
''نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر''
بدل کے رکھ دیں زمانے کا جو نظام کہن
کچھ ایسے لوگ، کچھ ایسے عوام پیدا کر

ناشاد اورنگ آبادی ہندوستان گیر پیمانے پر ہی نہیں معروف تھے بلکہ اردو دنیا کے ہر مکتبہ فکر کے لوگ انھیں بخوبی جانتے اور ان کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ناشاد اورنگ آبادی کی غزلوں میں ان کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔ وہ اپنی غزلوں سے محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

ہم تو ہیں غزل گو ہمیں رغبت ہے غزل سے
غزلوں کا کسی بزم میں سودا نہیں کرتے
غزل کہنے سے پہلے میں غزل کو دیکھ لیتا ہوں
کسی تالاب میں کھلتے کنول کو دیکھ لیتا ہوں

ناشاد کی نظمیں حب الوطنی سے مملو ہیں۔ ان میں ان کے جذبے اور خلوص کو دیکھا جاسکتا ہے اور خواہ مخواہ کے نعرے لگانے والے یا کھوکھلے الفاظ کا استعمال کر نے والے شاعر نہیں بلکہ وہی صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں جو کچھ ایمانداری سے محسوس کرتے ہیں۔ ناشاد اورنگ آبادی کی چند نظمیں میرے سامنے ہیں قومی یکجہتی اور قومی ایکتا عنوان سے، ان دونوں نظموں میں انھوں نے اتحاد کے بارے میں بڑے اچھے انداز سے قوم کو مخاطب کیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ اگر ہم سب متحد ہو جائیں تو دنیا کا کوئی بھی ملک ہم سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح 'قومی ترانہ' میں ناشاد صاحب نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ نظم ایک تاریخ بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہولی، جان سے پیارا وطن، قومی ایکتا اور عید ملن بہت ہی پیاری نظمیں ہیں۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور بزرگوں کی خدمت میں بھی عقیدت کے پھول پیش کیے ہیں جس سے ان کی وسیع المشربی اور رواداری ظاہر ہوتی ہے۔ رمز کے لیے انھوں نے لکھا تھا۔

آج ناشاد بھی اے رمز عظیم آبادی
تیرا گرویدہ ہے اور مدح سرا بھی تیرا

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ انھوں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ شاعری میں وہ صرف کلاسیکی قدروں کے قائل نہیں بلکہ نئی روایات کو بھی برتا ہے۔

میرے اشعار میں جدت بھی روایات بھی ہیں
دل کی باتوں کو بہ انداز غزل کہتا ہوں

'پروازسخن' کی نظمیں ایک طرف مشترکہ قومی تہذیب اور مخلوط قومی معاشرے کی فوز و فلاح کے سلسلہ میں صالح اور صحت مند شعور کی غمازی کرتی ہیں تو دوسری طرف عصری حالات کی تلخیوں اور سختیوں کی حساس مصوری کرتی ہیں۔ ان نظموں میں انسانیت دوستی کا شفاف جذبہ بھی ہے اور قومیت پسندی حب الوطنی کا احساس بے پایاں بھی، کہیں پر نہ کوئی تکلف ہے نہ تصنع۔ 'پروازسخن' کی شاعری جدید ترین شعری سرمائے کا ایک دلکش تحفہ ہے۔

ناشاد اورنگ آبادی کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اشعار میں عربی فارسی کے ادق الفاظ نہیں ملتے بلکہ ان کے اشعار عام فہم، آسان اور روزمرہ کی زبان سے مزین ہوتے ہیں۔

ناشاد صاحب کے یہاں زبان کی سلاست کے ساتھ جمالیاتی حسن بھی ہے۔ سادگی، رعایت لفظی، اسلوبیاتی جدت نے ان کی غزلیہ شاعری کو ایک منفرد انداز عطا کیا ہے۔

ناشاد اورنگ آبادی ہندی حلقوں میں بھی بے حد مقبول تھے۔ کوی سمیلن اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں بھی یہ اچھا خاصا وقت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی کی کئی ادبی انجمنوں نے بھی انھیں انعام و اکرام سے نوازا ہے۔ ریلوے بورڈ نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ کل ہند کوی سمیلنوں اور مشاعروں میں انھوں نے کئی بار اپنے ڈویژن اور زون کی نمائندگی کی ان میں دہلی بنگلور، سکندر آباد (حیدر آباد) اور پونے میں حاصل ہونے والے ایوارڈس قابل ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سولبھ انٹرنیشنل ہندی اکادمی ایوارڈ نئی دہلی، ملینیم انٹرنیشنل ایوارڈ نئی دہلی، خاموش سرحدی ایوارڈ فرید آباد، ہریانہ بھارتیہ ساہتیہ کار سنسد سمستی پور کا ڈاکٹر ترون ایوارڈ اور بہار ساہتیہ سمیلن ایوارڈ پٹنہ وغیرہ بھی انھیں پیش کیے گئے۔

ناشاد اورنگ آبادی نے 17 جون 2023 بمقام رلجہ بازار، پٹنہ میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔

■

Sahir Daudnagri
6/275, Lalita Park, Laxmi Nagar
Delhi-110092
Mob.:8800489404

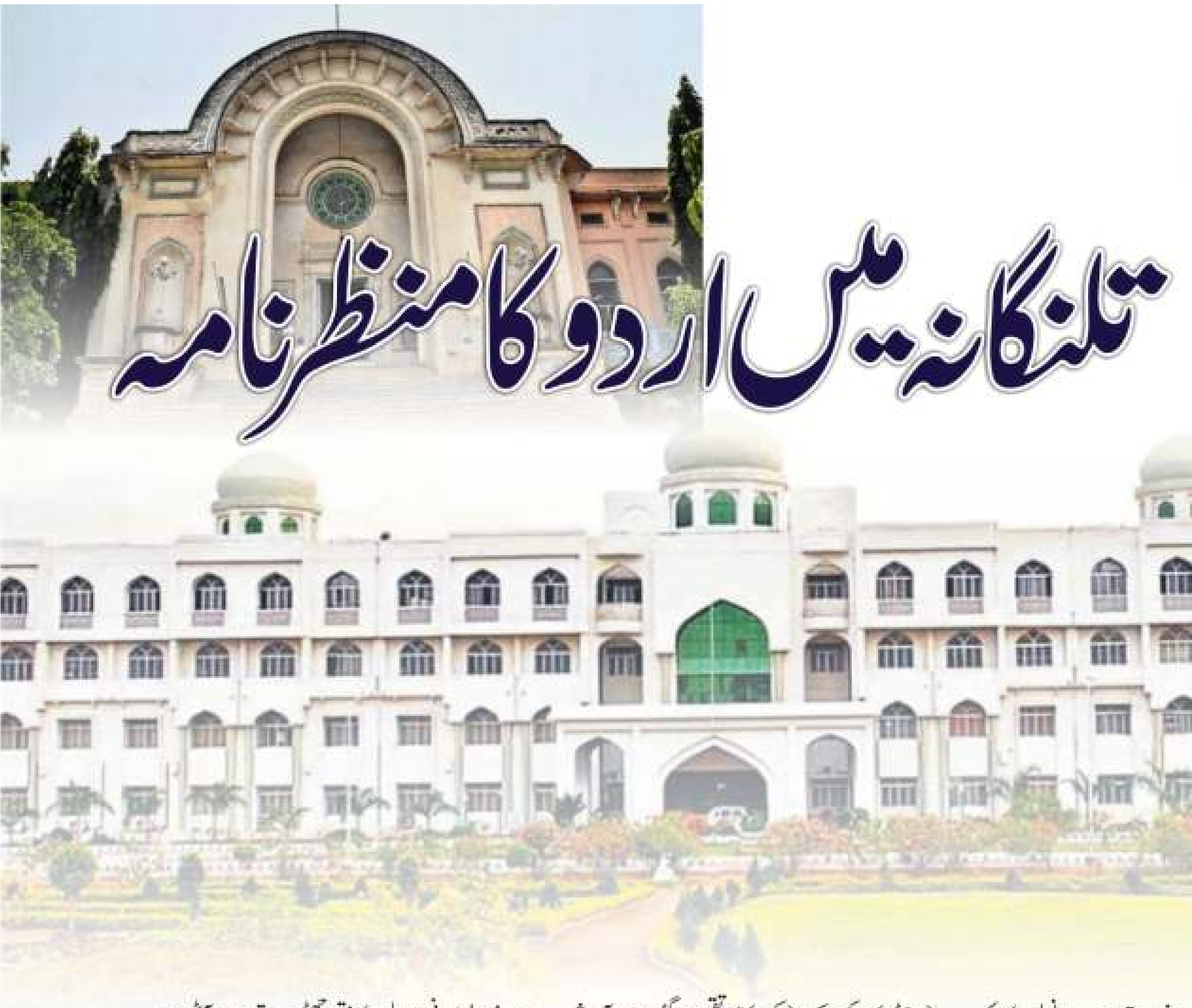

تلنگانہ میں اردو کا منظرنامہ

شمس الہدی دریابادی

ہندوستان متعدد زبانوں، تہذیبوں اور نسلوں کا ملک ہے۔ کثرت میں وحدت یہاں کی بڑی خوبی ہے۔ ظاہر ہے کہ کثیر لسانی ملک میں لنگوا فرینکا کے طور پر رابطے کے لیے کسی زبان کا ہونا ضروری ہے۔ آزادی سے قبل وہ زبان اردو تھی جو شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ انتظامیہ اور عدلیہ میں بھی رائج تھی۔ 1947 میں ہندوستان آزاد ہوا مگر تقسیم کے ساتھ، پاکستان وجود میں آیا اُس نے اردو کو اپنا لیا۔ ہندوستان نے ہندی کو دفتری اور قومی زبان کا درجہ دیا۔ اس کے مکمل نفاذ کو ممکن بنانے تک آئندہ پندرہ برسوں کے لیے انگریزی کا سہارا لیا گیا۔ 1948 میں سقوط حیدرآباد کے بعد یہاں بھی اردو ترک کر کے انگریزی کو اپنایا گیا گرچہ ڈیڑھ دو سال تک جامعہ عثمانیہ نے ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو کو برقرار رکھا مگر تعلیمی سال 1951 سے اردو ذریعہ تعلیم کو ختم کر دیا گیا۔ 1949 کو دارالترجمہ میں آگ لگ جانے یا لگائے جانے سے اردو زبان کا بیشتر سرمایہ جل کر ختم ہو گیا اور دارالترجمہ کا کام بھی بند ہو گیا۔ رہی سہی کسر 1956 میں تمام ہوئی جب ریاستوں کی تنظیم جدید لسانی بنیادوں پر ہوئی۔ ریاست (حیدرآباد) تین مختلف لسانی ریاستوں آندھراپردیش (تلگو) مہاراشٹرا (مرہٹی) اور کرناٹک (کنڑ) میں تقسیم ہو گئی۔ حیدرآباد شہر اور اس سے ملحق تلنگانہ آندھراپردیش میں شامل ہوا۔ اس تلگو ریاست کا صدر مقام شہر حیدرآباد قرار پایا۔ سقوط حیدرآباد اور تین ریاستوں میں اس کے انضمام کے بعد اردو زبان کا تیزی سے زوال شروع ہوا، معاش سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اردو میں کام کرنے والے ملازمین کو برطرف کر دیا گیا یا انھیں انگریزی میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ سرکاری ملازمین کو تلگو سیکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ انتظامی اور عدالتی امور کے لیے انگریزی کے ساتھ ہندی اور تلگو کا استعمال شروع ہوا۔ تعلیمی اداروں سے اردو غائب ہونے لگی اور اردو ذریعہ تعلیم کے ادارے کسمپرسی کا شکار ہو کر بند ہونے لگے۔ حکومت کی توجہ اور سرپرستی سے اردو محروم ہونے لگی، نئے حکمرانوں کی اکثریت اردو جانتی نہ تھی اور جو اردو جانتے تھے وہ اردو کو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار سمجھ کر اردو مخالف تھے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اسے ملک کی تقسیم کا ذمے دار قرار دیا جانے لگا، اردو کو بدیسی زبان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی نیز اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کے لیے تحریکیں اٹھیں۔

مایوسی کا دور

ہندوستان کی آزادی اور سقوط حیدرآباد کے بعد ہونے والی لسانی تبدیلیوں کا نتیجہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں دہائیوں کے دوران اس صورت میں سامنے آیا کہ عوام میں اردو کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی، اب اردو کی وہ وقعت نہ رہی جو پہلے تھی۔ یہ ایک ماضی کی یادگار بن کر رہ گئی اردو کے حق میں یہ زمانہ بڑا ہی مایوس کن رہا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اردو زبان چند برسوں کی مہمان ہے۔ اردو میں تعلیم حاصل کرنا تو در کنار اسے بحیثیت ایک زبان سیکھنے میں بھی لوگوں کو پس و پیش تھا۔ روزگار کے لیے انگریزی، ہندی اور تلگو سیکھنا ضروری ہو گیا تین زبانوں کے بعد چوتھی زبان سیکھنے کی کہاں سکت رہتی ہے مزید برآں یہ کہ اردو سیکھنے کا فائدہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے اپنی مادری زبان کہنے والے بھی اردو لکھنے پڑھنے سے کترانے لگے۔ غیر محسوس طور پر احساس ندامت اور احساس کمتری داخل ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو نہ جاننا فخر کی بات سمجھی جانے لگی۔ غلط اردو بولنا اور اردو زبان میں بے تحاشا انگریزی الفاظ کا استعمال فیشن بن گیا۔ اردو کا چلن آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا چنانچہ اب ایسی نسل پروان چڑھنے لگی جو اردو سے نابلد تھی۔ اس پرآشوب دور سے قبل کہ اردو کا خاتمہ بالشر ہو جائے محبان اردو اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے اپنے طور پر اس کی بقا کی کوششیں شروع کر دیں، ارباب اقتدار کو

متوجہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ اردو اپنی شیرینی، لطافت اور شعری سرمایے کی بنیاد پر جاں کنی سے باہر نکل آئی۔

اردو کی بقا کی کوششیں

بیسویں صدی کے اواخر میں محبانِ اردو کی کوششیں اور اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ اردو کی تہذیب اور علمی ورثے کا احساس بھی اجاگر ہونے لگا۔ کسی حد تک احساس کمتری دور ہونے لگی۔ ارباب اقتدار بھی مطالبات پر متوجہ ہوئے اور ایک مرتبہ پھر حیدرآباد اور تلنگانہ میں اردو کی ترقی و ترویج کے امکانات روشن ہونے لگے۔ چنانچہ مایوسی کا دور ختم ہو کر امید کی فضا قائم ہوگئی۔

ذرائع ابلاغ

ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم، اخبارات، رسائل اور سوشل میڈیا کسی بھی زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد سے ہر دن کم از کم دو تا تین گھنٹے اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں ریڈیو پروگرام انتہائی مقبول ہوا کرتے تھے مگر عصر حاضر میں ٹیلی ویژن اور اب تو سوشل میڈیا نے ریڈیو کی مقبولیت کو متاثر کیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ٹیلی ویژن سیریل دیکھنے کے لیے سڑکیں سنسان ہو جاتی تھیں اور ایک با رونق شہر، شہر خموشاں میں بدل جاتا تھا۔ ہندوستانی سنیما (جسے اب ہندی فلمیں کہا جاتا ہے) کی مقبولیت کا راز اردو مکالمے اور نغمے ہی ہیں۔ بہر حال ٹیلی ویژن اور فلموں کے ذریعے نہ صرف تلنگانہ بلکہ پورے ملک کے کروڑوں لوگوں تک اردو پہنچ رہی ہے۔

جہاں تک پرنٹ میڈیا کا تعلق ہے 1860 سے لے کر 1947 تک حیدرآباد سے جملہ 78 چھوٹے بڑے اخبارات شائع ہوئے جن میں پہلا اخبار 'آفتاب ہند' (ایڈیٹر: قاضی محمد قطب) اور آخری اخبار 'امن' (ایڈیٹر: سوامی واسدیو شاستری) تھا (بحوالہ، حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات: محمد اعجاز الدین حامد)

اس وقت حیدرآباد سے روزنامے منصف، سیاست، اعتماد، راشٹریہ سہارا اور ہفتہ واری اخبار گواہ شائع ہوتے ہیں۔ یہ اخبارات عموماً بارہ تا بیس صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اتوار اور دوسرے مخصوص موقعوں پر صفحات کی تعداد تیس سے تجاوز کر جاتی ہے۔ ان اخبارات میں ہر دن کم از کم چار صفحات کا ضمیمہ یا میگزین شامل رہتا ہے۔ مگر کووڈ نے بچت کی کئی صورتیں پیدا کر دیں، اس کے اثرات اخبارات پر بھی پڑے لہذا ضمیمے اور کئی خصوصی شماروں کو ای ایڈیشن تک محدود کر دیا گیا۔ خبروں کی پیش کش اور مضامین کے معیار کے اعتبار سے یہ اخبارات تلگو یا ہندی اخبارات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے ان اخبارات کی مجموعی تعداد اشاعت ایک لاکھ سے متجاوز ہے۔ ایک سروے کے مطابق ایک اردو اخبار کو آٹھ تا دس لوگ پڑھتے ہیں۔ اس طرح ہر دن آٹھ تا دس لاکھ لوگ اردو اخباروں سے مستفید ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کے برعکس یہاں ایک بڑا طبقہ انگریزی اخبار کے ساتھ اردو اخبار بھی خریدتا اور پڑھتا ہے لہذا اردو زبان کی ترویج اور اس کے رسم الخط کے تحفظ میں یہ اخبارات بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

حیدرآباد سے دو ماہنامے ایسے ہیں جو زائد از نصف صدی سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہونے والا ماہانہ ادبی رسالہ ''سب رس'' جسے آزادی سے قبل جنوری 1938 میں مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جاری کیا تھا، دوسرا زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان 'شگوفہ'۔ یہ رسالہ نومبر 1967 میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے جاری کیا تھا، یہ دونوں رسالے آج تک پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی حیدرآباد سے چند رسائل شائع ہوتے ہیں جیسے شاداب، خوشبو کا سفر اور قومی زبان وغیرہ۔

مشاعرے، ادبی اجلاس اور سمینار

مشاعرے کی حیثیت کسی ادارے سے کم نہیں، مشاعرے باذوق سامعین کی شعری طمانیت کا باعث بننے کے ساتھ نئے لوگوں کو اردو سے روشناس کراتے ہیں۔ حیدرآباد میں ہر سال متعدد مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ، شنکر جی، صنعتی نمائش اور زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعرے پابندی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اردو سے محبت اور شعری ذوق کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہاں کی عوام ہزاروں کی تعداد میں ٹکٹ خرید کر مشاعرہ سنتے ہیں۔ ملک و بیرون ملک سے شعرا کو مدعو کیا جاتا ہے۔ گورنر، وزرا، سرکاری عہدہ داران اور عمائدین شہر ان مشاعروں میں بہ طور خاص شرکت کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں علمی و ادبی اجلاس اور سمینار و سمپوزیم منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ یوم محمد قلی قطب شاہ، یوم زور، یوم زندہ دلان حیدرآباد اور انجمن ترقی پسند مصنفین نیز محفل اقبال شناسی اس کی مثال ہیں۔ حالیہ چند برسوں سے تاریخی باغ عامہ (Public Garden) میں ہر ماہ کی پہلی اتوار کو مختلف امراض کے ماہر ڈاکٹر اردو میں طبی معلوماتی لکچر دیتے ہیں جنھیں سننے کے لیے بڑی تعداد میں عوام خصوصاً بزرگ حضرات شہر کے مختلف گوشوں سے پہنچتے ہیں۔

اردو والوں کو مل بیٹھنے اور اردو کی محفلیں منعقد کرنے کے لیے شہر میں اردو کے نام سے کئی مراکز قائم ہیں مثلاً اردو گھر، اردو ہال، اردو مسکن اور ایوان اردو وغیرہ جہاں ڈیڑھ تا دو سو لوگ جمع ہو سکتے ہیں ان میں اردو کی مجلسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں اور کسی نہ کسی عنوان سے پرگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

ادارے، تعلیم اور ذریعۂ تعلیم

حیدرآباد کی تین یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو موجود ہے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فعال ہیں جہاں سمینار اور سمپوزیم وغیرہ منعقد ہوتے رہتے ہیں البتہ جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ اردو تعطل کا شکار ہے کیونکہ تمام اساتذہ سبکدوش ہو چکے ہیں۔ چند عارضی اساتذہ سے وہاں کا شعبۂ اردو لشٹم پشٹم

> سقوط حیدر آباد اور تین ریاستوں میں اس کے انضمام کے بعد اردو زبان کا تیزی سے زوال شروع ہوا۔ معاش سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اردو میں کام کرنے والے ملازمین کو برطرف کر دیا گیا یا انہیں انگریزی میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ سرکاری ملازمین کو تلگو سیکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ انتظامی اور عدالتی امور کے لیے انگریزی کے ساتھ ہندی اور تلگو کا استعمال شروع ہوا۔ تعلیمی اداروں سے اردو غائب ہونے لگی اور اردو ذریعۂ تعلیم کے ادارے کسمپرسی کا شکار ہو کر بند ہونے لگے۔

چل رہا ہے۔ ریاست تلنگانہ کی دو یونیورسٹیوں، کریم نگر کی ساتواہنا یونیورسٹی اور نظام آباد کی تلنگانہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو موجود ہے۔ یہاں پر نوجوان فعال اساتذہ ہیں جو قومی و بین الاقوامی سمینار اور دیگر ادبی اجلاس منعقد کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں حیدر آباد و دیگر شہروں میں کئی جونیر کالج و ڈگری کالج ایسے ہیں جہاں شعبۂ اردو اپنی کارکردگی کے ذریعے موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

2014 میں تلگو ریاست آندھرا پردیش سے علیحدہ ایک دیگر تلگو ریاست تلنگانہ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں آزادی سے قبل حیدر آباد کے نظام برسر اقتدار تھے ظاہر ہے یہاں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جن کی مادری زبان اردو ہے ان میں سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کائستھ برادری کے لوگ بھی شامل ہیں۔ تلنگانہ میں جن کی مادری زبان تلگو ہے وہ بھی اردو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ بہر حال تلنگانہ کی تشکیل کے بعد حکومت تلنگانہ نے اقلیتوں کی تعلیم کے لیے فوری ایک مستحسن قدم یہ اٹھایا کہ 2015 میں Telangana Minorities Residential Educational Institutions Society (TMREIS) قائم کیا۔ دراصل یہ نودویادویالیہ کے طرز پر اقلیتوں کے لیے رہائشی اسکول ہیں۔ ہر اسمبلی حلقے میں

> برصغیر ہند و پاک میں دینی علوم کے مدارس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ہزاروں مدارس اردو زبان کی ترویج اور رسم الخط کے تحفظ میں جو کردار ادا کر رہے ہیں اُس سے چشم پوشی ممکن نہیں۔

ایک اسکول کی منظوری دی گئی یہ تمام اسکول ریاستی وزارت اقلیتی بہبود کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کے علیحدہ اسکول ہیں، ہر طالب علم پر حکومت تلنگانہ سالانہ 80 ہزار روپے خرچ کرتی ہے جہاں غذائیت سے بھرپور کھانا، کتابیں، یونیفارم، اسٹیشنری اور دوائیں وغیرہ مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ اچھی اور معیاری تعلیم کے لیے تجربہ کار اساتذہ ہمہ وقت موجود رہتے ہیں، خاص بات یہ ہے کہ مسلمان بچے اور بچیوں کے لیے مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور اردو زبان و ادب کی تعلیم بھی داخل نصاب ہے نیز اردو کا لٹریری کلب بھی ہر اسکول میں رہتا ہے۔

تلنگانہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول اور کالج بھی موجود ہیں، جن میں سرکاری اور نجی دونوں طرح کے ہیں۔ ہندوستان کی واحد اردو ذریعۂ تعلیم کی یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد میں ہے۔ پیشہ ورانہ کورسز، ملک بھر میں بی ایڈ اور پالی ٹیکنیک کالج طلبا کے Placement اور اردو کو سائنس، تکنیک و علوم کی زبان کا درجہ دینے والی اس روایتی اور فاصلاتی طرز تعلیم کی دانش گاہ نے قلیل مدت میں اپنی شناخت بنا لی ہے۔ حکومت ہند نے شاید مرحوم جامعہ عثمانیہ کے متبادل کے طور پر حیدر آباد کو اردو یونیورسٹی کی شکل میں یہ تحفہ عطا کیا جو اردو والوں کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ انتہائی محروم و دیہی علاقوں کے اردو پس منظر والے طلبا کے لیے اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کے جو مواقع یہاں ہیں شاید ہی کسی یونیورسٹی میں میسر ہوں۔ چنانچہ بڑی تعداد میں خصوصاً مدارس کے فارغین اردو یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پورے ملک کے ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے 281 مدارس کی اسناد کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے تسلیم کیا ہے جس کی بنیاد پر ان مدارس کے فارغین یہاں داخلہ لے سکتے ہیں۔ مدارس کی فہرست، شرائط، شعبہ جات، فیس اور ہوسٹل وغیرہ کی تفصیلات یونیورسٹی ویب سائٹ پر موجود تفصیل نصاب (Prospectus) میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں طرز تعلیم کی ہے، فاصلاتی تعلیم کے لیے ملک بھر میں اس کے ریجنل سینٹر اور اسٹڈی سینٹر ہیں۔ اس یونیورسٹی کا آغاز ہی فاصلاتی تعلیم سے ہوا تھا۔ سنہ 2004 میں ریگولر کورسز کا آغاز ہوا جن میں شعبۂ اردو بھی شامل ہے۔ یہاں کے شعبۂ اردو میں جموں و کشمیر، یوپی، بہار، تلنگانہ، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک اور کیرالا غرض کہ ملک کے طول و عرض سے طلبا آتے ہیں۔ حیدر آباد کے علاوہ لکھنؤ اور سری نگر کیمپس میں بھی شعبۂ اردو موجود ہے۔ ان دونوں کیمپس کے ریسرچ اسکالرس کے داخلے، تحقیقی مقالوں کے Pre-Submission اور Viva وغیرہ حیدر آباد کے شعبۂ اردو کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے تحت تین ماڈل اسکول بھی ہیں جہاں پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ یہ ماڈل اسکول حیدر آباد، دربھنگہ اور نوح میں واقع ہیں۔

حیدر آباد میں فاصلاتی طرز تعلیم کی ریاستی امبیڈکر اوپن یونیورسٹی ہے جہاں سے انگریزی، اردو اور تلگو میڈیم میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں بی اے اور بی ایس سی کی تعلیم کے لیے اردو میڈیم کی سہولت موجود ہے۔ چنانچہ اپنے مقام پر رہتے ہوئے اردو کے ذریعے بی اے اور بی ایس سی کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں علاوہ ازیں حیدر آباد میں اردو آرٹس کالج، اسلامیہ گرلز کالج، کالج آف لینگویجز اور انوار العلوم کالج وغیرہ ایسے کالج ہیں جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں دینی علوم کے مدارس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ہزاروں مدارس اردو زبان کی ترویج اور رسم الخط کے تحفظ میں جو کردار ادا کر رہے ہیں اُس سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ میں ذاتی طور پر افریقہ، یورپ اور امریکہ کے کئی مدارس کو جانتا ہوں جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ اردو شعرا و ادبا کی ایک طویل فہرست ہے جو ان مدارس کی پیداوار ہیں۔ جنھیں ہم نہیں جانتے ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جن سے ہم واقف ہیں۔ بہر حال تلنگانہ میں بھی درجنوں دینی مدارس ہیں جو اردو کی بقا اور تحفظ میں سرگرم عمل ہیں۔

اردو کتب خانے

حیدر آباد میں ایسے مشہور و معروف کتب خانے موجود ہیں جہاں اردو کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ سالار جنگ میوزیم، ادارہ ادبیات اردو، کتب خانہ آصفیہ (سینٹرل لائبریری)، ابوالکلام آزاد ریسرچ سینٹر، آرکیولوجیکل میوزیم لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، سٹی کالج کا کتب خانہ، سعیدیہ لائبریری وغیرہ یہاں کے مشہور کتب خانے ہیں جہاں اردو کتابوں، رسالوں اور مخطوطات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ سالار جنگ میوزیم مرکزی حکومت کی تحویل میں ہے جہاں نادر و نایاب اشیا کے ساتھ بیش قیمت مخطوطات اور کتابوں پر مشتمل کتب خانہ بھی ہے۔ یہاں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال نہ صرف سیاح آتے ہیں بلکہ تحقیق کرنے والے اسکالرز بھی رجوع ہوتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو مشہور محقق محی الدین قادری زور کا قائم کردہ کتب خانہ ہے، رسالہ ''سب رس'' یہاں سے شائع ہوتا ہے۔ حیدر آباد میں متعدد ایسے علم دوست گھرانے بھی ہیں جو اپنے ذاتی کتب خانوں میں اردو کتابیں اور رسائل سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں مگر اب اردو کتابوں سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے نیز وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کتابوں کی حفاظت کا بھی بڑا مسئلہ ہے۔

فن خطاطی اور اردو کتابوں کی اشاعت و نکاسی

اردو رسم الخط اور اُس کو تبدیل کرنے پر عموماً بحث ہوتی

> ریاست تلنگانہ کی دوسری سرکاری زبان اردو ہے۔ اس ریاست کی تشکیل کے بعدھر ضلع کلکٹریٹ میں ایک اردو مترجم کا تقرر عمل میں لایا گیا تاکہ حکومت کے منصوبے، پروجیکٹ، اعلانات، اقدامات اور دستاویزات کو اردو میں منتقل کیا جاسکے اور اردو داں طبقہ ان سے نہ صرف واقف ہو بلکہ مستفید بھی ہو سکے۔تلگو اور انگریزی اخبارات کے ساتھ ساتھ سرکاری اشتہارات اردو اخبارات کو بھی دیے جاتے ہیں۔ ہورڈنگ اور سائن بورڈ اردو میں دکھائی دیتے ہیں۔ شمس آباد بین الاقوامی ہوائی اڈہ اور میٹرو ٹرین میں ہدایات اور اعلانات اردو میں لکھے اور بولے جاتے ہیں۔اردو ذریعہ تعلیم کے سرکاری اسکولوں کے معیار میں بہتری لائی گئی ہے۔

رہتی ہے۔اردو والوں کی اکثریت رسم الخط کی تبدیلی کی مخالف ہے۔چنانچہ اس کی حفاظت کے لیے نوجوانوں کو خطاطی کا فن سیکھنے پر آمادہ کیا جا تا ہے۔حیدر آباد میں کئی ایسے ادارے ہیں جہاں نوجوانوں کو خطاطی کا فن سکھایا جاتا ہے۔جس میں ایک ادارہ، ادارہ ادبیات اردو بھی ہے۔

حیدر آباد اردو کتابوں کی اشاعت کا ایک بڑا مرکز ہے جہاں سے بڑی تعداد میں اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ان کتابوں کی زیادہ تر دوکانیں چار مینار کے اطراف واقع ہیں۔علاوہ ازیں شہر کے دوسرے مقامات پر بھی دینی کتابوں کے ساتھ ساتھ شعروادب کی کتابوں کی دوکانیں ہیں۔انجمن ترقی اردو اور ادارہ ادبیات اردو نے فروخت کے مراکز قائم کیے ہیں۔حیدر آباد میں ہر سال منعقد ہونے والی صنعتی نمائش میں اردو کتابوں کے اسٹال لگائے جاتے ہیں، یہ اسٹال بھی اردو کتابوں کی نکاسی کے ذرائع ہیں۔

حکومتی اقدامات

ریاست تلنگانہ کی دوسری سرکاری زبان اردو ہے۔ اس ریاست کی تشکیل کے بعد ہر ضلع کلکٹریٹ میں ایک اردو مترجم کا تقرر عمل میں لایا گیا تا کہ حکومت کے منصوبے، پروجیکٹ، اعلانات، اقدامات اور دستاویزات کو اردو میں منتقل کیا جاسکے اور اردو داں طبقہ ان سے نہ صرف واقف ہو بلکہ مستفید بھی ہو سکے۔تلگو اور انگریزی اخبارات کے ساتھ ساتھ سرکاری اشتہارات اردو اخبارات کو بھی دیے جاتے ہیں۔ ہورڈنگ اور سائن بورڈ اردو میں دکھائی دیتے ہیں۔شمس آباد بین الاقوامی ہوائی اڈہ اور میٹرو ٹرین میں ہدایات اور اعلانات اردو میں لکھے اور بولے جاتے ہیں۔اردو ذریعہ تعلیم کے سرکاری اسکولوں کے معیار میں بہتری لائی گئی ہے۔TMREIS اسکولوں کا قیام (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) بھی ایک مستحسن قدم ہے جہاں اردو پڑھنے کا انتظام ہے نیز اردو لیٹریری کلب بھی قائم کیا گیا ہے۔

حکومت تلنگانہ نے اردو اکیڈمی قائم کی ہے جس کے توسط سے اردو کی ترقی و ترویج کے بہت سارے کام انجام پا رہے ہیں۔ اردو کتابیں شائع کرنے کے لیے مصنفین کو جزوی مالی امداد دی جاتی ہے۔ اردو کتابوں، ادیبوں، شاعروں اور اساتذہ کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اردو کی درسی کتابیں شائع کرنے میں اردو اکیڈمی تعاون کرتی ہے، مشاعرے اور ادبی اجلاس منعقد کراتی ہے۔ اکیڈمی کی جانب سے ایک ماہانہ رسالہ 'قومی زبان' بھی شائع ہوتا ہے۔

نئی نسل اور اردو

کسی زبان کے فروغ یا کم ازکم باقی رہنے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ کیا وہ ذریعہ تعلیم کی زبان ہے یا آیا نئی نسل اردو کو بحیثیت ایک زبان پڑھ رہی ہے۔تلنگانہ کی دوسری سرکاری زبان اردو ہے۔اردو والوں کی یہ ذمے داری ہے کے نئی نسل کو اردو سکھائیں چنانچہ اس کے لیے کیا کیا طریقہ کار ہو سکتے ہیں ان تمام کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں۔ یہ واضح رہے کہ شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے تحت اردو سرٹیفکیٹ کورس، تحسین غزل اور ڈپلوما ان فنکشنل اردو کے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ اور ادارادبیات اردو کی جانب سے بھی اردو سکھانے کا باضابطہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ موسم گرما کی تعطیلات میں مختصر مدتی اردو درس و تدریس کی سہولیات فراہم کی جاتی ہے۔ مقررہ نصاب کی تکمیل کے بعد اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشا کے امتحانات سال میں دو مرتبہ منعقد کیے جاتے ہیں اور کامیاب طلبا کو اسناد دی جاتی ہیں نیز شہر کے کئی مقامات پر اردو کوچنگ کلاسس چلائی جاتی ہیں ان میں بڑی عمر کے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں اور ہاں !ہر چھوٹے بڑے دینی مدارس میں تو اردو داخل نصاب رہتی ہے ساتھ ہی مساجد میں جز وقتی صبح وشام کے دینی مکاتب ہوتے ہیں جہاں بچوں کو اردو سیکھنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

چند تجاویز

- اردو رسم الخط کی حفاظت اپنے اوپر لازمی سمجھیں۔
- دوکان، مکان، دفاتر اور عوامی مقامات پر اردو میں بھی بورڈ آویزاں کریں۔
- اردو اخبارات ورسائل کے خریدار بنیں ورنہ اس کی اشاعت متاثر ہوگی پھر یہ کہ بہت سی اطلاعات اور خبریں ایسی ہوتی ہیں جو اردو اخبارات کے ذریعے ہی ہم تک پہنچتی ہیں اور شعروادب کے عصری منظر نامہ سے واقفیت کے لیے اردو رسائل کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔
- خطوط تو اب ماضی کی یادگار بن کر رہ گئے ہیں، دستی تحریر کا زمانہ نہ رہا اردو والوں کی اکثریت واٹس ایپ، فیس بک، ٹویٹر اور انسٹاگرام وغیرہ پر لکھنے کے لیے رومن رسم الخط کا استعمال کرتی ہے جبکہ اردو رسم الخط کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اردو والے رومن کے بجائے اردو کو اردو رسم الخط میں لکھیں۔
- شہروں کی کالونیوں اور گاؤں کے محلوں میں اجتماعی کوششوں سے اردو لائبریریوں کا انتظام کیا جائے، جن شہروں یا محلوں میں پہلے سے اردو لائبریریاں موجود ہیں انھیں مزید فعال اور بہتر کرنے کی کوشش کی جائے۔
- اردو کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت اپنائیں تاکہ مصنفین اور ناشرین کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔
- اگر کوئی اردو سیکھنا چاہے تو اس میں دلچسپی لیں، خود سکھائیں یا رہنمائی اور رہبری کریں۔
- سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو والے اغراض کے بجائے اخلاص والے راستے پر چلیں۔

بہر حال تلنگانہ میں اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اردو کا مستقبل روشن ہے مگر اردو والوں کو فعال اور فکر مند ہونے کی ضرورت ہے۔

■

Prof. Shamsul Hoda Daryabadi
Head،Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:9032520784
Email.: drhodamanuu@gmail.com

ماحولیاتی تحفظ
اور پائیدار ترقی کے لیے طرزِ حیات میں تبدیلی

آفتاب عالم

پائیدار طرز زندگی سے مراد زندگی گزارنے کے ایسے طریقے ہیں جو ماحول، معاشرے اور آنے والی نسلوں پر منفی اثرات کو کم کرتے ہیں، جبکہ دوسری طرف افراد اور قوموں کی فلاح و بہبود اور معیاری زندگی کو فروغ دیتے ہیں۔

ماحولیاتی انحطاط اور موسمیاتی تبدیلی عالمی مظاہر ہیں جہاں دنیا کے ایک حصے میں ہونے والے اقدامات پوری دنیا کے ماحولیاتی نظام اور آبادی کو متاثر کرتے ہیں۔ اندازے بتاتے ہیں کہ اگر بدلتے ہوئے ماحول کے خلاف ضروری کارروائی نہ کی گئی تو دنیا بھر میں تقریباً تین بلین لوگ پانی کی دائمی قلت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے عالمی معیشت 2050 تک اپنی جی ڈی پی کا اٹھارہ فیصد تک کھو سکتی ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں کے دوران ماحولیاتی انحطاط اور موسمیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے عالمی سطح پر متعدد اقدامات کیے گئے اور پالیسیاں نافذ کی گئی ہیں جن میں پالیسی اصلاحات، اقتصادی ترغیبات اور اصول وضوابط شامل ہیں۔ لیکن ان تمام کے باوجود، افراد، سماج اور اداروں کی سطح پر ضروری اقدامات پر محدود توجہ دی گئی ہے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ صرف انفرادی اور اجتماعی رویے کو تبدیل کرنے سے ماحولیاتی اور آب و ہوا کے بحرانوں میں اہم کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام (UNEP) کے مطابق، اگر آٹھ ارب کی عالمی آبادی میں سے ایک ارب لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ماحول دوست رویے اپناتے ہیں، تو پھر عالمی کاربن کے اخراج میں تقریباً 20 فیصد تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔

ماحولیاتی تحریک کے لیے طرز زندگی (LiFE) کی مہم

ماحول کے لیے طرز زندگی (LiFE) کا تصور ملک کے وزیر اعظم نریندر مودی نے یکم نومبر 2021 کو گلاسگو میں COP26 میں متعارف کرایا تھا، جس نے افراد اور اداروں کی عالمی برادری سے LiFE کو ایک بین الاقوامی عوامی تحریک "بے فکری اور تباہ کن استعمال کے بجائے محتاط اور دیدہ دانستہ استعمال" کے طور پر آگے بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا۔ LiFE ہر ایک پر انفرادی اور اجتماعی فرض عائد کرتا ہے کہ وہ ایسی زندگی گزارے جو کرہ ارض کی فطرت کے مطابق ہو اور اسے نقصان نہ پہنچائے۔ LiFE کے تحت ایسے طرز زندگی پر عمل کرنے والوں کو اس سرزمین کے حامی لوگ کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔

تاہم، انسانی طرز زندگی کو تبدیل کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ عادات روزمرہ کی زندگی میں گہرائی سے جڑی ہوتی ہیں اور ماحول کے کئی عناصر کے ذریعے مسلسل تقویت پاتی ہیں۔ ماحول کے تحفظ کے لیے کچھ اچھا کرنے کے ہمارے ارادے کا اظہار کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا لیکن یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ ایک وقت میں ایک اقدام کرنے اور روزانہ ایک تبدیلی کرنے سے، فرد اپنے طرز زندگی کو تبدیل کر سکتا ہے اور طویل مدتی ماحول دوست عادات کو جنم دے سکتا ہے۔ مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ کم از کم 21 دن تک کسی عمل کی مشق کرنے سے اسے عادت بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ماحولیاتی تحریک کے لیے طرز زندگی (LiFE) کی مہم ہندوستان کی زیر قیادت ایک اہم عالمی عوامی تحریک ہے جس کا مقصد دنیا بھر میں افراد، سماج اور عوام کو متحرک کرنا ہے تاکہ وہ ماحول کے تحفظ کے لیے فعال اقدامات کریں۔ چونکہ دنیا بڑھتے ہوئے ماحولیاتی چیلنجوں اور مسائل سے نبرد آزما ہے، یہ تحریک امید کی ایک کرن بن کر ابھری ہے جو کہ آنے والی نسلوں کے لیے کرہ ارض کو محفوظ رکھنے میں انفرادی اعمال اور پائیدار طرز زندگی کے انتخاب کے اہم کردار پر زور دیتی ہے۔

ماحولیاتی تحریک کے لیے طرز زندگی (Life) کی مہم ماحولیاتی تحفظ کی فوری ضرورت کے لیے عالمی بیداری کی نمائندگی کرتی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی عمل کو جھنجوڑ کر یہ تحریک پائیدار طرز زندگی کے انتخاب کو متاثر کرتی ہے جو اس سیارے کی صحت کو نمایاں طور پر متاثر کر سکتے ہیں۔ تعلیم اور آگاہی پائیدار استعمال، توانائی کا تحفظ، فضلہ کا انتظام، جنگلات، وکالت اور سماج کی شمولیت ایسے ستون ہیں جو تحریک کے عزم کو تقویت دیتے ہیں۔

پائیدار طرز زندگی

پائیدار طرز زندگی سے مراد زندگی گزارنے کے ایسے طریقے ہیں جو ماحول، معاشرے اور آنے والی نسلوں پر منفی اثرات کو کم کرتے ہیں، جبکہ دوسری طرف افراد اور قوموں کی فلاح و بہبود اور معیاری زندگی کو فروغ دیتے ہیں۔ پائیدار طرز زندگی کو اپنانے میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں جیسے کہ صرفہ کا طرز، توانائی کا استعمال، نقل وحمل، فضلہ کا انتظام اور خوراک کے انتخاب میں شعوری انتخاب اور تبدیلیاں وغیرہ شامل ہیں۔

ایک پائیدار طرز زندگی کو اپنانا ایک سفر کے مانند ہے اور جب اجتماعی طور پر مشق کی جائے تو چھوٹی تبدیلیاں سماج اور دنیا پر اہم اثر ڈال سکتی ہیں۔ اقوام متحدہ مختلف

اقدامات اور فریم ورک کے ذریعے پائیدار طرز زندگی کو فروغ دیتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے تیار کردہ کلیدی فریم ورکس میں سے ایک پائیدار ترقیاتی اہداف (SDGs) ہیں جو دنیا میں سب کے لیے پائیدار مستقبل کے حصول کے لیے روڈ میپ فراہم کرتے ہیں۔

اقوام متحدہ دنیا بھر میں پائیدار ترقی کو فروغ دینے اور پائیدار طرز زندگی کی حوصلہ افزائی کے لیے بیداری بڑھانے، تعاون کو آسان بنانے اور حکومتوں، تنظیموں اور افراد کو رہنمائی فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

پائیدار طرز زندگی کو اپنانا نہ صرف ایک اخلاقی ذمے داری ہے بلکہ آنے والی نسلوں کی خاطر کرہ ارض کی حفاظت کے لیے بھی ایک ضروری اور اہم قدم ہے۔

طرز حیات میں تبدیلی

موجودہ دور ماحولیات اور پائیدار ترقی کی فوری ضرورت پر لوگوں کی تشویش میں اضافے کا شاہد ہے۔ طرز زندگی کا انتخاب ماحول پر افراد کے اثرات کا تعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ ماحول دوست عادات کو اپنانے اور طرز زندگی میں شعوری تبدیلیاں لانے اور پائیدار ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں، ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کی فوری ضرورت کو شدت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ ہمارے موجودہ طرز زندگی، استعمال کے طریقے اور صرفہ کے نمونے کرہ ارض پر ایک غیر پائیدار بوجھ ڈال رہے ہیں جو موسمیاتی تبدیلی، حیاتیاتی تنوع میں کمی اور قدرتی وسائل کی قلت کا باعث ہے۔

مذکورہ ماحولیاتی چیلنجوں سے نمٹنے کی غرض سے افراد کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی طرز زندگی میں اہم تبدیلیاں لائیں جن سے ماحولیاتی پائیداری کو فروغ حاصل ہو سکے۔ جس طرح سے ہم زندگی بسر کرتے ہیں، وسائل استعمال کرتے ہیں اور دیگر مختلف سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں اس سے ماحول اور زمینی سیارے کی بقا کی صلاحیت پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ طرز زندگی میں تبدیلیاں ماحولیاتی چیلنجوں کو کم کرنے اور پائیدار ترقی کے حصول میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

پائیدار نقل و حمل

ایک ایسا شعبہ جہاں افراد کافی اثر ڈال سکتے ہیں جیسے وہ پائیدار نقل و حمل کے انتخاب کے ذریعے پرائیویٹ گاڑیوں پر اپنا انحصار کم کر کے اور پائیدار نقل و حمل کے متبادل کو اپنا کر اپنے کاربن فوٹ پرنٹ کو نمایاں طور پر کم کر سکتے ہیں۔ پیدل چلنا، سائیکل چلانا، اور جب بھی ممکن ہو سرکاری اور عام ذرائع نقل و حمل کا استعمال نہ صرف اخراج کو کم کرتا ہے بلکہ صحت مند طرز زندگی کو بھی فروغ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، Buehler and Pucher (2017) کی طرف سے کی گئی ایک تحقیق سے پتا چلا ہے کہ سائیکل چلانا اور مختصر سفر کے لیے پیدل چلنا گرین ہاؤس گیس کے اخراج میں کمی اور ہوا کے معیار کو بہتر بنانے کا باعث بن سکتا ہے۔ لہٰذا، نقل و حمل کے پائیدار طریقوں کی طرف منتقل ہونا پائیدار ترقی میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

توانائی کا تحفظ

پائیدار زندگی کا ایک اور اہم پہلو توانائی کا تحفظ ہے۔ محض تبدیلیاں جیسے کہ توانائی کی بچت کرنے والے آلات کا استعمال، LED لائٹ بلب کی ترجیح اور استعمال میں نہ ہونے پر الیکٹرانک آلات کی بجلی سپلائی بند کر دینا توانائی کی کھپت کو کم کرنے میں مدد کر سکتا ہے۔ مزید برآں، قابل تجدید توانائی کے ذرائع، جیسے سولر پینلز یا ونڈ ٹربائنز کا استعمال، پائیدار توانائی کے نظام میں منتقلی کو مزید بڑھا سکتا ہے۔ توانائی کی بچت کے یہ طریقے اجتماعی طور پر گرین ہاؤس گیس کے اخراج کو کم کرتے ہیں اور ماحولیاتی تحفظ کو فروغ دیتے ہیں۔

ذمہ دار استعمال

ذمے دارانہ استعمال کے نمونوں کو اپنانا اور موثر فضلہ کے انتظام کی مشق پائیدار ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ طرز زندگی میں تبدیلی کے ایک اہم پہلو میں کھپت کے نمونوں کو تبدیل کرنا شامل ہے۔ اکثر ان کے ماحولیاتی اثرات پر غور کیے بغیر جدید دنیا کے شہریوں کے طور پر، ہمیں مصنوعات خریدنے اور استعمال کرنے کے لیے مسلسل ترغیب دی جاتی ہے۔ زیادہ پائیدار کھپت کی عادات کی طرف تبدیلی، جیسے ماحول دوست مصنوعات کا انتخاب، ایک بار استعمال ہونے والے پلاسٹک کو کم کرنا اور مقامی اور پائیدار کاروباروں کی حمایت کرنا کافی فرق لا سکتا ہے۔

فضلہ کا انتظام

کم سے کم پیکیجنگ والی مصنوعات کا انتخاب کر کے، ری سائیکل شدہ مواد سے بنی اشیا خرید کر اور کھانے کے فضلے کو کم کر کے، افراد اپنے ماحولیاتی اثرات کو کم سے کم کر سکتے ہیں۔ ری سائیکلنگ، کمپوسٹنگ، اور خطرناک فضلے کو مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانا ماحولیاتی انحطاط کو روکنے کے لیے ضروری اقدامات ہیں۔ ان طریقوں کو روزمرہ کی زندگی میں شامل کر کے افراد وسائل کے تحفظ اور پائیدار ترقی میں اپنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قابل غور ہے کہ ماحولیاتی تحفظ کے لیے مناسب فضلے کا انتظام بہت ضروری ہے۔ ری سائیکلنگ، کمپوسٹنگ اور مجموعی فضلے کی پیداوار کو کم کرنے جیسے طریقوں کو اپنانے سے زمین اور قدرتی ماحولیاتی نظام پر بوجھ کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، حمایتی پالیسیاں جو مدوّر معاش کو فروغ دیتی ہیں اور پلاسٹک کی پیکیجنگ کو کم کرتی ہیں اور عالمی کچرے کے بحران سے نمٹنے میں مدد کرتی ہیں۔

پائیدار کاروبار

کاروبار میں صارفین کا کردار بہت اہم ہوتا ہے اور ان کے انتخاب سے مارکیٹ میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ پائیداری کو ترجیح دینے والے کاروباروں کی حمایت کر کے مزید کمپنیوں کو ماحول دوست طرز عمل اپنانے کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔ مصنوعات کی خریداری کرتے وقت فیئر ٹریڈ (Fair Trade) یا نامیاتی لیبل جیسے تصدیق اسناد کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ مقامی کاروباروں کی حمایت کرنے پر غور کیا جانا چاہیے جس سے پائیدار خرید و فروخت، صنعتکاری اور پیکیجنگ کو ترجیح ملتی ہے۔

ماحولیاتی وکالت

صرف انفرادی اقدامات ضروری تبدیلی کے پیمانے کو حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتے ہیں۔ ماحولیاتی وکالت میں مشغول ہونا اس کے اثرات کو بڑھا سکتا ہے اور نظام میں تبدیلی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس میں مقامی ماحولیاتی اقدامات میں معاونت یا حصہ لینا، درخواستوں پر دستخط کرنا اور پالیسی سازوں کو ضروری خدشات کا اظہار کرنا شامل ہو سکتا ہے۔ پائیدار طریقوں کی وکالت کرتے ہوئے فیصلہ سازی کے عمل کو متاثر کیا جا سکتا ہے اور ایک سرسبز مستقبل کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

پائیدار خوراک اور زراعت

زراعت اور خوراک کا نظام ماحولیاتی انحطاط اور تحفظ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک پائیدار خوراک کی طرف منتقل ہونا اور پائیدار زراعت کے طریقوں کی حمایت کرنا ان منفی اثرات کو بہت حد تک کم کر سکتا ہے۔ پودوں پر مبنی غذا کا استعمال، گوشت کی کھپت کو کم کرنا، اور مقامی، نامیاتی کاشتکاری کے طریقوں کی حمایت کرنا گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو کم کرتا ہے، حیاتیاتی تنوع کو محفوظ رکھتا ہے اور پانی کے وسائل کو بچاتا ہے۔

مزید برآں، پائیدار زرعی طریقوں، جیسے نامیاتی کاشتکاری اور دوبارہ تخلیقی زراعت، مٹی کی صحت کو فروغ

دیتی ہے، حیاتیاتی تنوع کو بڑھاتی ہے اور کیمیائی آدانوں کو کم کرتی ہے۔ نیز یہ غذائی اور زرعی تبدیلیاں پائیدار ترقی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ زرعی طریقوں سے لے کر کھانے کی نقل وحمل اور پیکیجنگ تک غذائی صنعت وحرفت کا ماحولیاتی اثر بہت زیادہ ہے۔ ایک پائیدار غذا کو اپنانا جس کی خصوصیت پودوں پر مبنی کھانے کی زیادہ مقدار اور گوشت اور دودھ کی کم کھپت سے ہوتی ہے غذائی انتخاب سے وابستہ کاربن کے اثرات کو نمایاں طور پر کم کرسکتی ہے۔

پانی کا تحفظ

دنیا بھر کے اکثر ممالک اور بہت سے خطوں میں پانی کی کمی اور بحران ایک بڑھتی ہوئی تشویش ہے۔ مختصر پانی کے استعمال کے ذریعے پانی کو محفوظ کرنا، شگاف اور سوراخ کو ٹھیک کرنا، بارش کے پانی کو جمع کرنا اور پانی کی

> **موجودہ عالمی منظر نامے میں ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کے ساتھ منسلک طرز زندگی میں تبدیلیوں کو اپنانا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پائیدار نقل و حمل کے انتخاب، توانائی کی بچت، ذمہ دارانہ کھپت، فضلہ کا انتظام اور پائیدار خوراک اور زراعت وہ کلیدی شعبے ہیں جہاں افراد نمایاں اثر ڈال سکتے ہیں۔**

بچت کرنے والے آلات استعمال کرنے کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مزید برآں، پانی سے بھرپور مصنوعات جیسے گوشت اور دودھ کی کھپت کو کم کرنا بالواسطہ طور پر ان کی پیداوار میں استعمال ہونے والے پانی کی نمایاں مقدار کو بچا سکتا ہے۔

حیاتیاتی تنوع کا تحفظ

طرز زندگی میں ایسی تبدیلیاں جو حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کو فروغ دیتی ہیں پائیدار ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ سرسبز جگہیں بنانا، جنگلی حیات کے موافق باغبانی کے طریقوں کی حمایت کرنا اور نقصان دہ کیڑے مار ادویات اور کیمیکل کے استعمال سے اجتناب حیاتیاتی تنوع کے تحفظ میں معاون ہے۔ ایسی تبدیلیاں صحت منداور متنوع قدرتی ماحول فراہم کرکے زندگی کے معیار کو بھی بہتر کرتی ہیں۔

پائیدار فیشن کی حمایت

فیشن انڈسٹری اپنے ماحولیاتی اثرات کے لیے بدنام ہے۔ پائیدار مواد سے بنائے گئے اور اخلاقی طور پر تیار کردہ لباس کا انتخاب نیز استعمال شدہ اور معتمد فیشن کو سپورٹ کرنا تیز فیشن کے ایسے مطالبے کو کم کرتا ہے جس کا تعلق حد سے زیادہ فضلہ اور آلودگی سے ہے۔ فیشن کے بارے میں زیادہ باشعور نقطہ نظر کو اپنانے سے پائیدار ترقی میں فرد اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

ماحولیاتی تعلیم اور وکالت

ایک پائیدار مستقبل بنانے کے لیے خود کو تعلیم دینا اور ماحولیاتی مسائل کے بارے میں بیداری پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ باخبر رہنے سے لوگ باخبر انتخاب کر سکتے ہیں اور ماحولیاتی تحفظ کو فروغ دینے والی پالیسیوں اور اقدامات کی فعال طور پر حمایت کرسکتے ہیں۔ مقامی ماحولیاتی تنظیموں میں حصہ لینا اور پائیدار طریقوں کی وکالت کرنا سماجی سطح کی تبدیلی پر نمایاں اثر ڈال سکتا ہے۔

پائیدار سماج کی تعمیر

پائیدار طریقوں کو نافذ کرنے کے لیے پڑوسیوں اور مقامی لوگوں کے ساتھ تعاون اجتماعی ذمے داری کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ سماجی باغات، وسائل کا اشتراک اور ری سائیکلنگ مہم کو منظم کرنے جیسے اقدامات نچلی سطح پر پائیدار ترقی کو فروغ دیتے ہیں۔

قابل تجدید توانائی کے ذرائع

قابل تجدید توانائی کے ذرائع جیسے شمسی، ہوا اور جیوتھرمل پاور میں منتقلی پائیدار مستقبل کی جانب ایک ضروری قدم ہے۔ گھر پر سولر پینلز کی تنصیب یا سماج کے قابل تجدید توانائی کے منصوبوں کی حمایت کرنے سے غیر قابل تجدید توانائی کے ذرائع پر انحصار کم کرنے اور صاف توانائی کی پیداوار کو فروغ دینے میں مدد مل سکتی ہے۔

باشعور صارفیت

ایک باشعور صارف ہونے کا مطلب ہے کہ فرد جو مصنوعات خریدتا ہے ان کے بارے میں باخبر انتخاب کرنا۔ مصنوعات کے لائف سائیکل کے ماحولیاتی اثرات بشمول پیداوار، پیکیجنگ، نقل وحمل اور تصرف پر غور کرنا۔ معاون کمپنیاں جو پائیداری، اخلاقی طریقوں اور سماجی ذمے داری کو ترجیح دیتی ہیں۔

خاتمہ

موجودہ عالمی منظر نامے میں ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کے ساتھ منسلک طرز زندگی میں تبدیلیوں کو اپنانا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پائیدار نقل وحمل کے انتخاب، توانائی کی بچت، ذمہ دارانہ کھپت، فضلہ کا انتظام اور پائیدار خوراک اور زراعت وہ کلیدی شعبے ہیں جہاں افراد نمایاں اثر ڈال سکتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کو روزمرہ کی زندگی میں ضم کرکے، افراد موسمیاتی تبدیلیوں کو کم کرنے، ماحولیاتی نظام کے تحفظ اور آنے والی نسلوں کے لیے پائیدار مستقبل کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں کیونکہ طرز زندگی میں تبدیلیاں ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کے حصول میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اپنے استعمال کے طریقے، توانائی کے استعمال، نقل وحمل کے انتخاب، فضلے کے انتظام کے طریقوں، غذائی عادات، اور حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کے طریقوں کو تبدیل کرکے، افراد اجتماعی طور پر ایک سرسبز اور زیادہ پائیدار مستقبل میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔

افراد، سماج اور حکومتوں کو مذکورہ مثبت تبدیلیوں کو قبول کرنے اور ماحولیاتی شعور کی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے تعاون کرنا چاہیے۔ صرف ٹھوس کوششوں کے ذریعے ہی افراد اپنے سیارے کے قدرتی وسائل کی حفاظت کرسکتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک خوشحال اور پائیدار مستقبل کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ ماحولیاتی استحکام اور پائیدار ترقی کو فروغ دینے کے لیے طرز زندگی میں تبدیلیاں ضروری ہیں۔ توانائی کی کھپت کو کم کرنے، پائیدار نقل وحمل کو اپنانے، پائیدار خوراک کو اپنانے اور موثر فضلے کے انتظام کی مشق کرنے جیسے اقدامات کو نافذ کرنے سے، افراد سبز اور زیادہ پائیدار مستقبل میں اپنا اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

حوالہ جات

1 آفتاب عالم وسونور جک (2022)۔ ماحول کی آلودگی اور اس کا تحفظ: وقت حاضر کے ناگزیر مسائل۔ قومی زبان، تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی، حیدرآباد۔

2 ابظاہر خان وشاہد امین (2016)۔ 'اسلامی نقطہ نظر سے ماحولیاتی نظام کی پائیدار ترقی: ایک تحقیقی مطالعہ۔ برجس 3

3 ڈاکٹر ایم صلاح الدین 'ماحولیات کا تحفظ دنیا کے لیے بڑا چیلنج، دعوت'، نئی دہلی، 11 جون 2021۔

4 ماحولیات، جنگلات اور موسمیاتی تبدیلی کی وزارت "پائیدار ترقی کے اہداف کے حصول کے لیے پالیسیاں" پی آئی بی، دہلی، 21 جولائی 2022۔

5 ڈاکٹر محمد افروز عالم (2022)۔ عالمی یوم ماحولیات اور انسانی صحت، خواتین دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

Aftab Alam
Assistant Professor, (MANUU), College of Teacher Education, Darbhanga
Ilyas Ashraf Nagar, Chndanpatti, Laheria Sarai
Darbhanga, Bihar-846002
Mob.: 8285835517
Email: aftabalameflu@gmail.com

خصوصی گفتگو

خیال اثر

’کچھ بھی ہو جہدِ مسلسل کی نہ دیوار گرے‘

—صالح بن تابش

صالح ابن تابش نام ہے روایتوں کے پاسدار اور محبت مروت وفا خلوص کے پیکر کا۔ روایتوں کی معتبر و محترم وادیوں کی سیاحت نے موصوف کو اردو شاعری کا اس قدر والہ و شیدا بنا دیا تھا کہ آج نصف صدی گزرنے کے بعد بھی جب کہ ان کے جسمانی اعضا جواب دیتے ہوئے مضمحل ہوتے جارہے ہیں لیکن اول دن کی طرح ان کا تخلیقی سفر ہے کہ کامیابی اور بلند پروازی کے ہمراہ جاری ہے۔ ادیب مسلم سہیل و اختر نصیر و ناصر کے ہم عصر شعرا کے بعد صالح ابن تابش کا نام غنیمت ہے۔ مذکورہ تمام شعرا کے بعد کی نسلوں میں بلند پایہ مقام پر فائز ہیں۔

خیال اثر: آپ کو شاعری کا شوق کب اور کیونکر ہوا؟

صالح ابن تابش: والد محترم مرحوم و مغفور قاری تابش ایک اچھے اور مترنم شاعر تھے۔ گھر کا ماحول بھی شعرو ادب سے خاصا شغف رکھتا تھا نیز مالیگاؤں شہر میں منعقدہ کل ہند مشاعروں میں جب کبھی عارف عباسی بلیاوی تشریف فرما ہوتے تو والد محترم کی موتی تالاب میں واقع کرانہ دکان پر بلا تکان گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔ دونوں کی گفتگو کا محور و مرکز ہمیشہ شعرو شاعری ہی رہا کرتا تھا۔ میں بھی اس وقت سن بلوغت تک جا پہنچا تھا اس لیے میرا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اسی طرح پرائمری تعلیم کے دوران مدرس کی حیثیت سے مرحوم ریاض ابو البرکات المعروف ریاض احمد ریاض جو خود بھی روایتوں کے پاسدار اور بہترین مترنم شاعر تھے۔ کلاس کے دوران جب بھی ہمیں اپنی غزل ترنم ریز جھنکاروں میں سنایا کرتے تھے تو ہم ان کی سحر آفرینی میں کھو جاتے تھے، چونکہ میرا حافظہ مضبوط و قوی تھا اس لیے میں ان کی غزلوں کو ذہن میں بٹھا لیا کرتا تھا اور بعد میں اسی مترنم لہجے میں ساتھی طلبا کو سنایا کرتا تھا۔

ناگاہ ایک دن ریاض صاحب نے اپنی ہی کلاس میں مجھے اپنی پڑھی گئی غزل اسی ترنم ریز جھنکار میں سننے کے بعد میری حوصلہ افزائی کی کہ اپنے اس شوق پر مستقل مزاجی اور استقلال سے قائم رہو ایک دن سارے ہندوستان میں تمہاری شہرت کا ڈنکا بجے گا اور تمھیں سر آنکھوں پر بٹھالیا جائے گا۔ ریاض صاحب کی حوصلہ افزائی کی بدولت دوسروں کی غزلیں پڑھنے کی بجائے خود ہی طبع آزمائی کی کوشش کی اور قدیم ترین ادبی انجمن بزم عزیزی کی شعری نشست میں شہر کے تمام استادانِ فن کی حاضری میں غزل سرا ہوا تو سب چونک پڑے کہ یہ کیا ہے۔ والد محترم چونکہ علامہ وقار حیدری کے شاگرد تھے اس لیے میں بھی اپنے پیش رووں کی رائے مقدم جانتے ہوئے انھیں کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اس طرح جب تک وہ حیات رہے میرا شعری و ادبی سفر ان کے زیر سرپرستی جاری رہا۔

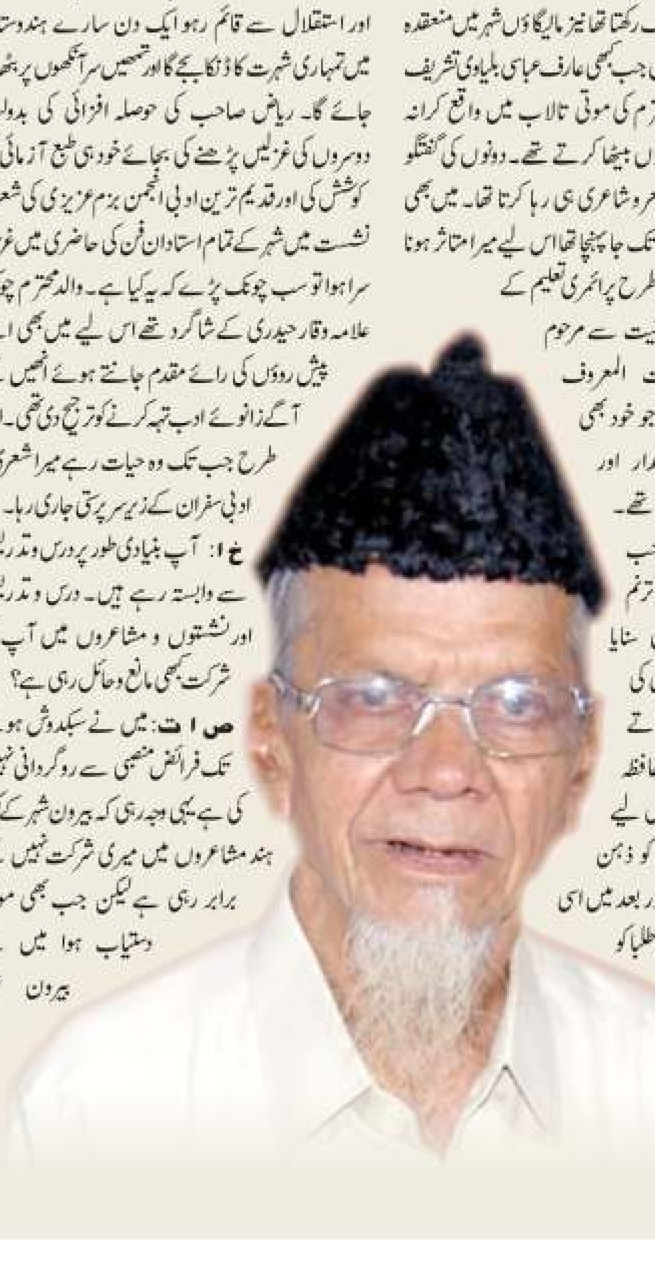

خ ا: آپ بنیادی طور پر درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ درس و تدریس اور نشستوں و مشاعروں میں آپ کی شرکت کبھی مانع و حائل رہی ہے؟

ص ا ت: میں نے سبکدوش ہونے تک فرائض منصبی سے روگردانی نہیں کی ہے یہی وجہ رہی کہ بیرون شہر کے کل ہند مشاعروں میں میری شرکت نہیں کے برابر رہی ہے لیکن جب بھی موقع دستیاب ہوا میں نے بیرون شہر کے کل ہند مشاعروں میں نہ صرف اپنی شرکت درج کی ہے بلکہ شاعری اور ترنم ریزی کی بدولت اپنے ساتھ ساتھ اپنے استاد محترم اور مالیگاؤں شہر کا نام بلند کیا ہے۔

خ ا: آپ نے کن کن شہروں کے کل ہند مشاعروں میں شرکت کی ہے؟ جواب: ’’ہائے وہ بھی کیا دن تھے جب اردو مشاعروں میں نامور شعرا حضرات اپنے کلام بلاغت نظام سے سامعین کے دلوں میں گھر کر جاتے تھے۔ قرب وجوار کی تمام ریاستوں کے شہروں میں منعقدہ کل مشاعروں میں شرکت کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ دو مشاعرے میری نواح جاں پر کچھ اس طرح رقم ہیں کہ میں انھیں بھولنا بھی چاہوں تو نہ بھول پاؤں۔ اول مقام پر بہار کے پٹنہ شہر میں منعقدہ انڈو پاک مشاعرہ جو کہ مرحوم حفیظ جالندھری کی صدارت اور نابغۂ روزگار شاعر و ناظم مرحوم زبیر رضوی کی قیادت میں انتہائی کامیاب ثابت ہوا تھا۔ مذکورہ انڈو پاک مشاعرہ مجھے مرحوم منصور فریدی اور اپنے وقت کی نامور مترنم شاعرہ مینا قاضی کے توسط سے دستیاب ہوا تھا بلکہ مینا قاضی نے مجھ سے گزارش کی تھی کہ وہ قریبی ریلوے جنکشن منماڑ تک آجائیں اور پٹنہ تک کا سفر ساتھ ساتھ ہی طے کریں گے۔ 1976 میں پٹنہ کے گاندھی میدان میں منعقدہ انڈو پاک مشاعرے نے میری شعری زندگی پر وہ انمٹ نقوش درج کیے تھے کہ میں بھولنا بھی چاہوں تو نہ بھول پاؤں کیونکہ جب میں اپنی غزل کا مطلع۔

’’برقِ غم ٹوٹے کہ دل پر کوئی کہسار گرے
کچھ بھی ہو جہد مسلسل کی نہ دیوار گرے‘‘

زبردست داد و تحسین کے ہمراہ جب مذکورہ غزل کے مقطع تک پہنچنے کے بعد اپنی مسند پر پہنچنا ہی چاہتا تھا کہ صدر

مشاعرہ مرحوم حفیظ جالندھری مسند صدارت سے یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے برق لہرا گئی ہو اور مجھے گلے سے بھینچتے ہوئے اس طرح پیٹھ تھپتھپائی کہ تمام مدعو شعرا حیران و پریشان ہو کر رہ گئے۔ صدر موصوف کی تعریف و توصیف نصف صدی کے بعد بھی میرے لیے عظیم سرمایہ ہے۔

خ ا: آپ کی پسندیدہ اور مشہور و معروف کسی غزل کے اشعار سنائیں؟

ص ا ت:

اب تو چبھتی ہی نہیں دل کو چمن کی خوشبو
کتنی محبوب ہے محبوب کے تن کی خوشبو
طاق میں مقید ہے روشنی کتابوں کی

کے علاوہ بیشتر غزلوں کو شائقین مشاعرہ اور احباب نقد و نظر نے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔

خ ا: ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات و امکانات کے آئینہ خانے میں آپ کی شاعری کس قدر تغیر و تبدل کا شکار ہوئی ہے یا پھر آپ نے بدلتے ادوار اور مغربی اطوار و انداز پر تازیانے کی صورت کیسی موشگافیاں کی ہیں؟

ص ا ت: اف یہ گرتی ہوئی تہذیب کا عالم توبہ

بستر مرگ پہ جیسے کوئی بیمار گرے

ح آپ نے مکتبی تعلیم کے علاوہ زیر تعلیم طلبا کو اور کن کن اسرار و رموز سے آشنا کیا ہے؟

ص ا ت: میرا تبادلہ جن جن اسکولوں میں کیا گیا وہاں زیر تعلیم طلبا کو میں نے اپنے ساتھی اساتذہ اور آر جے ایم میوزک کے روح رواں رفیق مقادم کے اتصال سے درسی کتب میں شامل بیشتر نظموں کو طلبا ہی کی آوازوں اور ہارمونیم ستار اور ڈھول و ڈھولک سے آشنا کرتے ہوئے یوں موسیقی ریز کیا تھا کہ آج بیشتر طلبا خود ہی اچھے اور خوب صورت مغنی کی صورت اپنا اور اپنے شہر کا نام روشن کر رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب ایسی ہی ترنم ریز نظموں پر مبنی آڈیو کیسٹ کی دھوم اور طلب سارے مہاراشٹر میں حد سے تجاوز کر گئی تھی۔

خ ا: مشہور ہے کہ ادب کی عدالت میں سارے فیصلے کاغذ پر ہوا کرتے ہیں نہ کہ مشاعروں کے اسٹیج اور مائک پر۔ ادبی رسائل و جرائد میں آپ کی غزلیں نظمیں اگر شائع ہوئی ہوں تو بتائیں؟

ص ا ت: اپنی تدریسی خدمات کے طفیل اگر میں مشاعروں میں شرکت سے محروم رہا تو ساتھ ہی چھپنے چھپانے کا قائل بھی کبھی نہ رہا تھا لیکن کبھی کبھار اردو اخبارات کے ذریعے میری نظمیں غزلیں شائع ہو جایا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی مرحوم سید عارف کے زیر ادارت شائع ہونے والے شہرہ آفاق عالمی ماہنامہ جواز میں بھی میری غزلیں شائع ہوئی ہیں۔

خ ا: آپ کے مراسم و تعلقات کن کن شعرا و ادبا سے رہے ہیں؟

ص ا ت: سلیم رومانی، نجمی ابن جاوید، انیس نیر، مقیم اثر بیاولی، شبیر ہاشمی، سلیم شہزاد، سلطان اختر اور شبیر آصف، ارشد نظر ہارون اکسیر کے علاوہ استادان فن حضرت وقار حیدری ادیب مالیگانوی، اختر منشی، ناصر مالیگانوی، منشی نصیر کے علاوہ مالیگاؤں کی انتہائی نستعلیق شخصیت مدیر توازن عتیق احمد عتیق و سلطان ادب سلطان سبحانی، ہزار انجم کے خالق محمد صدیق مسلم اوج، حضرت حسن دانش سے میرے قریبی روابط رہے ہیں۔

خ ا: سماج و معاشرہ کے حق میں ناسور بنتی ہوئی سیاست کی کبھی آپ نے گوشمالی کرتے ہوئے شعر کہہ ہیں جن میں کسی سیاسی پارٹی یا لیڈر کا نام لیے بغیر آپ نے ان پر انگشت نمائی ہو؟

ص ا ت: بے شک میں نے بیشتر غزلوں میں اس پر خامہ فرسائی کی ہے جس کے لیے یہ دو شعر کافی ہیں۔

جانے کیا سیاست ہے جانے کیسی سازش ہے
آئینوں کی بستی میں پتھروں کی بارش ہے
اک دہکتے صحرا سے آرزوئے شادابی
زندگی کے دشمن سے زندگی کی خواہش ہے

خ ا: آپ نے غزلوں کے علاوہ اور کن اصناف میں طبع آزمائی کی ہے؟

ص ا ت: ’’فنون لطیفہ کی حسین و جمیل شاخ فن شاعری ایسی امر بیل ہے جو کبھی بھی خزاں رسیدگی کا شکار نہ ہوگی اور یہی وجہ رہی کہ میں نے شاعری کی تمام اصناف میں نہ صرف کامیاب شمولیت کی ہے بلکہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوایا ہے، کیونکہ میں نے اگر روایتی غزلیں کہی ہیں تو قدیم و جدید کے خوب صورت امتزاج سے جدید شاعری کو بھی اپنے اشعار میں بروئے کار لانے کی کامیاب کوشش ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مکاتب و مدارس کے نہ صرف ترانے تخلیق کیے ہیں بلکہ وہاں زیر تعلیم طلبا کو ترنم ریزی بھی عطا کی ہے کہ مذکورہ ترانے کو کیسے اور کس طرح پڑھنا چاہیے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر تہنیتی نظمیں (سہرے) کے علاوہ رخصتی یعنی بے شمار وداعی گیت بھی اس طرح تخلیق کیے ہیں کہ تہنیتی نظمیں سننے والے اگر عش عش کر اٹھتے تھے تو وداعی گیت سنتے ہی کیا خواتین کیا مرد سب کی آنکھیں نمناک ہو کر ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔

خ ا: کیا آپ کا کوئی مجموعہ کلام طباعت و اشاعت کے مراحل سے گزرا ہے؟

ص ا ت: گذشتہ برس ہی میرا ضخیم ترین شعری مجموعہ ’اندر کا موسم‘ منظر عام پر آ کر داد و تحسین کا موجب قرار پایا تھا۔ مذکورہ مجموعے میں میں نے اپنی تمام اصناف میں کہی گئی شاعری کو شامل کر رکھا ہے تا کہ کوئی بھی گوشہ چھوٹ نہ جائے۔ مجھے نعت گوئی کے تعلق سے تشنگی کا احساس جب ہوا تو حرف آخر کے طور پر نعتوں کی جانب مبذول ہوا ’’میری تقدس میں ڈوبی ہوئی نعتوں کا ایک عالم دیوانہ رہا ہے۔ خاص طور پر ایک ایسی نعت جسے بار بار سامعین فرمائش کرتے ہوئے سنانے کی گزارش کرتے رہے ہیں‘‘ نعت کے اشعار کیا ہیں عظمت مصطفیٰ کا وہ جیتا جاگتا نمونہ ہیں

فنون لطیفہ کی حسین و جمیل شاخ فن شاعری ایسی امر بیل ہے جو کبھی بھی خزاں رسیدگی کا شکار نہ ہوگی اور یہی وجہ رہی کہ میں نے شاعری کی تمام اصناف میں نہ صرف کامیاب شمولیت کی ہے بلکہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوایا ہے،کیونکہ میں نے اگر روایتی غزلیں کہی ہیں تو قدیم و جدید کے خوب صورت امتزاج سے جدید شاعری کو بھی اپنے اشعار میں بروئے کار لانے کی کامیاب کوشش ہے۔

جو بارگاہ نبوت اور خداوند قدوس کی نظروں میں سرخروئی کا باعث اور اہمیت و افادیت عطا کرتے ہوئے مجھے اس بلند و بالا مقام پر فائز کر جائے گا جہاں تک پہنچنے کی تاب و تواں کسی انسان میں نہ ہوگی۔ نعت کے چند اشعار جو انھوں نے پیش کیے وہ تاریخ نے کچھ اس طرح درج کیے کہ کہیں تنگیِ داماں یا تشنگی کا احساس باقی نہ رہے۔

سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اذہان و قلوب میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ ’’زمانہ کیسی کیسی زندہ آوازوں سے روشن ہے‘‘ اور بے ساختہ زباں پر یہ شعر در آیا کہ۔

عصر نو مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

■

Khayal Asar
Plot No.: 153, Mominpura
Near Ramazani Masjid
Malegaon - 423203 (M.H)

عمار شاہد

اردو میں تاریخی ناول نگاری

ناول افسانوی نثر کی ایک مقبول صنف ہے جس کا براہ راست تعلق حقیقی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس میں پیش کردہ واقعات و کردار انسانوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ پروفیسر بیکر کے بقول:

''ناول نثری قصے کے ذریعے انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے''

(بحوالہ اردو ناول تعریف، تاریخ اور تجزیہ، پروفیسر صغیر افراہیم، ص19)

انسانی زندگی کی جتنی بہتر اور واضح ترجمانی ناول کر سکتا ہے اردو ادب کی دیگر اصناف میں وہ وسعت نہیں ہے کہ وہ مکمل زندگی کا احاطہ کر سکیں۔ کیونکہ زندگی بیکراں ہے اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے، اس کے مختلف شعبہ جات ہیں، جس میں فرد سے لے کر افراد بھی ہیں معاشرہ، سماج، مذہب، سیاست، سائنس اور تاریخ وغیرہ بھی یہ وہ شعبہ جات ہیں جن سے انسانی زندگی عبارت ہے، ناول انہیں شعبہ جات کو موضوع بناتا ہے اور تخیل کے ذریعے انھیں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری کو اس کے معائب و محاسن کا علم بحسن وخوبی ہو جاتا ہے۔

ناول میں موضوعات کا تنوع ہوتا ہے۔ اس میں تمام موضوعات کو پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ متنوع موضوعات کی پیشکش کی وجہ سے ناول کی مختلف قسمیں وجود میں آئیں، جب ناول میں انسانی معاشرت کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا تو معاشرتی ناول کہلایا، سیاسی ماحول کا احاطہ کیا تو سیاسی، سائنس کو بیان کیا تو سائنسی اور تاریخ کو جب اپنے دامن میں سمیٹا تو تاریخی ناول کی قسم وجود میں آئی اور یہ قسم ناول کی موجودہ تمام قسموں میں سب سے اہم ہے۔ اس سے متعلق 'ناول کیا ہے؟' کے مصنفین تحریر کرتے ہیں:

''مواد یا موضوع کے لحاظ سے ناول کی سیکڑوں قسمیں ہو سکتی ہیں ہر ناول نگار کا ایک خاص تجربہ ہوتا ہے اور اس کی بنا پر اس کا ناول فن میں خاص اضافہ کرتا ہے، پھر بھی دس بارہ اقسام ایسے ملتے ہیں جو خاص طور پر نمایاں ہیں... تاریخی ناول شاید ناول کی نمایاں ترین قسم ہے۔ یورپ میں سر والٹر اسکاٹ نے اس کو کمال تک پہنچایا اور اس کی پیروی میں ڈوما اور ہیوگو نے اس کمال کو قائم رکھا۔ اس قسم کے ناول کا کمال یہ ہے کہ کسی پرانے دور کا نقشہ اس حسن خوبی سے کھینچا جائے کہ وہ بالکل جیتا جاگتا ہمارے سامنے آجائے۔''

(ناول کیا ہے، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ص96)

ناول کی تمام قسموں میں تاریخی ناول کی نمایاں اہمیت ہے۔ اس طرز کے ناول ماضی سے متعلق ہوتے ہیں اور ماضی کی دریافت تاریخ سے ہوتی ہے۔ چونکہ تاریخ، عہد گزشتہ کے نمایاں انسانوں، ان کے کارناموں اور واقعات و حادثات کو قطعیت اور صداقت کے ساتھ بیان کرتی ہے جس میں ایک طرح کی خشکی ہوتی ہے۔ واقعات کے دوٹوک بیان کی وجہ سے تاریخ میں دلچسپی کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔ تاریخی ناول میں انھیں واقعات کو تخیل کی بنیاد پر اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عہد زندہ اور تابندہ نظر آنے لگتا ہے، اور اس کے ذریعے قارئین دلچسپی کے ساتھ تاریخ سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ تاریخی ناول کے اسی کمال کی وجہ سے عالمی ادب میں اسے نمایاں مقام عطا کیا گیا اور کثرت سے تاریخی ناول تحریر کیے گئے۔ یورپ میں تاریخی ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز سر والٹر اسکاٹ نے کیا جس کا پہلا ناول 'دے ورلی' ہے جو 1814 میں شائع ہوا۔ ہندوستان میں تاریخ کو بنیاد بنا کر ناول تخلیق کرنے کا سلسلہ بنگالی زبان سے شروع ہوا۔ بنکم چند چٹر جی نے پہلا تاریخی ناول 'درگیش نندنی' تحریر کیا جس کا سنہ اشاعت 1865 ہے۔ اردو ادب میں تاریخ کو بنیاد بنا کر ناول تحریر کرنے والوں میں اولیت عبدالحلیم شرر کو حاصل ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں اس طرز کے ناول تحریر کرنے کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا تاریخی ناول 'ملک العزیز ورجینا' جو 1888 میں شائع ہوا۔

عبدالحلیم شرر سے قبل ڈپٹی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار نے کئی ناول تخلیق کیے، جس میں نذیر احمد کا ناول توبۃ النصوح اور ابن الوقت کافی مقبول ہوا۔ رتن ناتھ سرشار کا ناول 'فسانہ آزاد' نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ ان کے ناول موضوعاتی طور پر اصلاحی اور معاشرتی بیان پر مشتمل ہیں ابتدا میں عبدالحلیم شرر نے بھی روایتی انداز کے ناول تحریر کیے جن میں پہلا ناول 'دلچسپ' ہے جو 1886 میں شائع ہوا اور یوں ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اس کے علاوہ 'دلکش' بدرالنساء کی مصیبت، آغا صادق کی شادی، طاہرہ، غیب داں دلہن اور 'اسرار دربار حرام پور' وغیرہ۔ یہ

تمام ناول معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان ناولوں پر نذیر احمد اور سرشار کے اثرات مرتب ہیں جن کو قبول کرتے ہوئے شرر نے ناول نگاری کی ابتدا کی۔ گوکہ شرر کے یہ معاشرتی ناول اپنے عہد میں کامیاب ہوئے لیکن شرر نے اپنے نوک قلم کو موڑا اور تاریخ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔تاریخ کو بنیاد بنا کر متعدد تاریخی ناول تحریر کیے جن کی کل تعداد چونتیس ہے۔ جس میں بنکم چند چٹرجی کا ناول 'درگیش نندنی' کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ان کے مشہور تاریخی ناول حسب ذیل ہیں درگیش نندنی، ملک العزیز ورجینا، حسن انجلینا، منصور موہنا، فلورا فلورنڈا، ایام عرب، فردوس بریں، مقدس نازنین، فتح اندلس، قیس ولبنیٰ، زوال بغداد، رومۃ الکبریٰ، الفانسو، فاتح مفتوح، جویائے حق، عزیزہ مصر، مینا بازار، شہزادہ حبش وغیرہ۔

شرر کے تاریخی ناول نگاری کی طرف مائل ہونے کے پس پشت خود ان کے عہد کا ماحول اور مسلمانوں کی زبوں حالی، مایوسی اور کسم پرسی تھی جس سے باہر نکالنے کے لیے اس عہد کے دانشوران ادب نت نئی کوششیں کر رہے تھے جس میں سرسید اور ان کے رفقا پیش پیش تھے اور شرر کے ذہن کو جلا بخشنے اور انھیں مکمل طور پر تاریخی ناول کی طرف آمادہ کرنے میں سر والٹر اسکاٹ کا مشہور ناول 'طلسمان' کا اہم کردار رہا ہے۔اسکاٹ نے اپنے اس ناول میں مسلمانوں کی شبیہ مسخ کی تھی اور ہلال وصلیب کے مقابلے میں مسلمانوں کو مجبور ومغلوب دکھایا تھا۔ شرر نے اس ناول کے ردعمل میں اپنا پہلا ناول 'ملک العزیز ورجینا' تحریر کیا اور خود اس ناول کے تحریر کرنے کے وجوہات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میں نے والٹر اسکاٹ کا ناول طلسمان پڑھا تیسری صلیبی لڑائی کو پیش نظر رکھ کر تصنیف کیا گیا تھا اس میں مسلمانوں کی اہانت دیکھ کر مجھے ایسا جوش آیا کہ اس عنوان پر ایک ناول میں بھی لکھوں۔ چنانچہ یہی جوش نکالنے کے لیے میں نے ملک العزیز ورجینا شائع کرنا شروع کر دیا جو دلگداز کا پہلا ناول ہے۔''

(بحوالہ عبدالحلیم شرر بحیثیت تاریخی ناول نگار، علی احمد فاطمی، ص 261)

اس امر کا ذکر ملحوظ رہے کہ شرر نے 1887 میں اپنا ایک ماہنامہ رسالہ 'دلگداز' جاری کیا جس میں انھوں نے تاریخی ناولوں کو قسط وار شائع کیا ہے جس میں ملک العزیز ورجینا بھی ہے جو پہلے قسط وار دلگداز میں شائع ہوا اور پھر کتابی صورت میں 1888 میں شائع ہوا۔ شرر نے اپنے اس ناول میں سلطان صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ شیر دل کو موضوع بنا کر بیت المقدس کے حصول کے لیے ہونے والے ان کے مابین معرکوں کو پیش کیا ہے اور انھیں واقعات کو تاریخی شواہد کے مطابق بیان کیا ہے۔

عبدالحلیم شرر کا یہ تاریخی ناول اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا، جس کی وجہ سے اس عہد میں کافی مقبول ہوا۔ اس ناول کی مقبولیت نے شرر کو متعدد تاریخی ناول لکھنے پر مجبور کیا اور انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی اہم تاریخی ناول تحریر کیے۔ دنیائے ادب میں، انھیں مقبولیت انھیں تاریخی ناولوں کے ذریعے حاصل ہوئی۔

قارئین کی تاریخی ناول سے دلچسپی نے نہ صرف شرر کو مقبول بنایا بلکہ اس عہد کے دیگر ناول نگاروں کی بھی توجہ اس طرز نو کی طرف مبذول کرائی۔ شرر کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ان کے معاصرین نے بھی تاریخی ناول کے میدان میں طبع آزمائی کی جس میں پہلا نام حکیم محمد علی طبیب کا ہے۔

حکیم علی طبیب ہردوئی کے رہنے والے تھے۔ پیشے سے ہردوئی میونسپلٹی میں صدر طبیب تھے اور طبیب ہی ان کا تخلص بھی تھا، شرر کے معاصرین میں سے تھے جس زمانے میں شرر دلگداز نکالتے تھے یہ ہردوئی سے ایک ماہنامہ رسالہ 'مرقع عالم' نکالتے تھے۔ حکیم صاحب بیک وقت طبیب، فلسفی، مورخ، ادیب، صحافی اور ناول نگار بھی تھے۔اس عہد کے ملکی مسائل سے متاثر ہوکر قوم کی اصلاح کی طرف مائل ہوئے اور اپنے رسالے اور ناولوں کو قوم کی اصلاح کے لیے آلے کے طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے معاشرتی اور تاریخی دونوں طرز کے ناول تحریر کیے۔ ان کے آٹھ ناول ہیں جن میں پانچ تاریخی اور تین معاشرتی ہیں۔عبرت، نیل کا سانپ، جعفر وعباسہ، رام پیاری اور'خضر خاں دیول دیوی' ان کے تاریخی ناول ہیں۔

شرر کی طرح طبیب کے تاریخی ناولوں میں موضوعات کا تنوع ہے انھوں نے اسلامی تاریخ کے علاوہ یورپ کی تاریخ پر اپنے ناول 'عبرت' کی بنیاد رکھی اور 'رام پیاری' اور 'دیول دیوی' میں ہندوستانی تاریخ کو موضوع بنایا ہے۔ حکیم محمد علی طبیب کی تاریخی ناول نگاری کی بابت ڈاکٹر عبدالحق تحریر کرتے ہیں:

'' طبیب کے ناول تاریخی ہیں۔ ان ناولوں میں تاریخی شخصیتوں، تاریخی واقعات یا دوسرے تاریخی مواد کے اردگرد پلاٹ تعمیر کیا گیا ہے اور واقعات کی تاریخی ثقافت کو بھی بڑی حد تک برقرار رکھا گیا ہے۔ طبیب کے تاریخی ناولوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان واقعات کے علاوہ جو براہ راست ناول کا موضوع ہیں ہمیں اس عہد کے دوسرے اہم تاریخی واقعات اور شخصیتوں کا علم بھی ان ناولوں کے ذریعے حاصل ہو جاتا ہے۔''

(محمد علی طبیب حیات اور تصانیف، ڈاکٹر عبدالحق، خواجہ پریس دہلی 1889)

شرر کے بعد حکیم محمد علی طبیب نے تاریخی ناول نگاری کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے نہ صرف اس کے خزینے میں مزید اضافہ کیا بلکہ اس روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار بھی ادا کیا۔

اردو کے اولین تاریخی ناول نگاروں میں ایک اہم نام منشی امراؤ علی کا بھی ہے۔ یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے انھوں نے بھی تاریخ کو موضوع بناتے ہوئے ایک ناول 'رزم بزم' تخلیق کیا ہے جو مطبع نول کشور سے 1893 میں شائع ہوا۔ یہ ناول دو حصوں پر مشتمل ہے اس میں سلطان شہاب الدین غوری کو موضوع بنا کر اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں فوج کی لڑائی راجہ جے چند کی شکست اور راجپوتوں کی دلیری اور شجاعت کا مرقع دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور اہم نام منشی محمد مصطفیٰ خان کا بھی ہے۔ انھوں نے دو اہم تاریخی ناول تحریر کیے۔ پہلا ناول 'مہر النسا' ہے جو 1897 میں شائع ہوا۔اس ناول میں انھوں نے جہانگیر اور مہر النسا کے معاشقے کے مابین مغلیہ عہد کے ہندوستان کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔اس ناول کے دیباچے میں منشی محمد مصطفیٰ خاں وضاحت کرتے ہیں:

'' خاندان مغلیہ کے شاہنشاہ سلیم (جہانگیر) اور مہر النسا (نور جہاں) کی الفت ومحبت کی داستان سے تو شاید ہی کوئی ناواقف ہو اور جہاں تک اپنا خیال ہے شاید ان کا دلچسپ فسانہ بڑی بڑی رنگ آمیزیوں کے ساتھ ملک میں شائع ہے مگر فکر وکوشش کسی کے ساتھ محدود و مخصوص نہیں ہے اس وجہ سے اس کو ایک نئی صورت میں پبلک میں پیش کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا.....اگر آپ انصاف کریں گے تو اس میں تاریخی تخلیقات۔ راستی حالات، سلاست مضامین التزام تہذیب پا کر ضرور قدر افزائی فرمائیں گے۔''

(سلیم ومہر النسا، منشی محمد مصطفیٰ علی خاں، نامی پریس لکھنؤ، ص 2)

ان کا دوسرا تاریخی ناول 'ماریہ سلطانہ' ہے جس میں انھوں نے پہلی صدی ہجری کے عرب کے حالات اور تہذیب ومعاشرت کا احاطہ کیا ہے۔

سجاد نبی خان بھی اولین دور کے اہم ناول نگار ہیں۔ ان کے دو اہم تاریخی ناول دستیاب ہیں۔ پہلا ناول 'عفت آرا' ہے جو 1897 میں شائع ہوا۔اس ناول میں انھوں نے جہاندار شاہ کے عہد کو موضوع بنا کر شہر بغداد کی تاریخ ومعاشرت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ان کا دوسرا اہم ناول' طارق بن زیاد' ہے جس کا سنہ اشاعت

1903 ہے۔ اس ناول میں انھوں نے طارق بن زیاد کے کارناموں اور فتح اسپین کو موضوع بنایا ہے جس کے تناظر میں اس عہد کی تاریخ کو بہت پرکشش انداز میں پیش کیا ہے۔

نوبت رائے بھی ابتدائی دور کے ناول نگار ہیں۔ 1866 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اردو ادب میں ان کی اصل شناخت بحیثیت شاعر کی ہے۔ انھوں نے دو ناول 'حسین رانی' اور 'عروج و زوال' تحریر کیے ہیں۔ ان میں عروج و زوال کی حیثیت تاریخی ہے۔ اس ناول میں انھوں نے پرتھوی راج چوہان اور محمد غوری کے مابین ہونے والی جنگوں کو موضوع بنایا ہے۔

ابتدائی عہد سے متعلق ایک اہم نام منشی محمد احسن وحشی کا بھی ہے ان کا بھی شمار اردو کے اولین تاریخی ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ 'محبوس کنشت' ان کا اہم تاریخی ناول ہے جو نامی پریس لکھنؤ سے 1899 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انھوں نے سبکتگین اور محمد غوری کے حملوں اور اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ کو بنیاد بنا کر اس ناول کا تانا بانا بنا ہے۔ 1001 میں سومنات پر غزنوی کے حملے اور اس عہد کی ہندو تہذیب و معاشرت کی مکمل طور پر عکاسی کی ہے۔

سید عاشق حسین بھی ابتدائی عہد کے اہم تاریخی ناول نگار ہیں۔ انھوں نے متعدد اہم ناول تخلیق کیے۔ جس میں بیشتر ناول معاشرتی موضوعات پر ہیں تارا، نشیب و فراز، اسلم اور حبیبہ، جذب الفت، کاوش دل، شادی و غم اور 'مظفر اور راما بائی' ان کے اہم ناول ہیں۔ ان کے ناولوں میں 'مظفر اور راما بائی' اور 'نشیب و فراز' تاریخی ناول ہیں۔ یہ ناول سیٹھ کندن لال پریس سے شائع ہوا۔ اس میں عاشق حسین نے اورنگ زیب کے سپہ سالار مظفر اور راما بائی کے معاشقے کو بنیاد بنا کر مغلیہ عہد کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ مظفر خاں کی حیثیت تاریخی ہے یہ اورنگ زیب کا ایک جری، نڈر اور بہادر سپہ سالار تھا۔ سید عاشق حسین نے اس ناول میں مظفر کے کردار کو دوبارہ زندگی بخشی اور اس کے کارناموں کو اس طرح سے پیش کیا ہے جس طرح سے تاریخ میں درج ہے، اس کردار کو بہادری اور جواں مردی کا نمونہ بنا دیا۔ 'نشیب و فراز' میں ہمایوں کا عہد موضوع بیان ہے جس میں ہمایوں کی تخت نشینی، شیر شاہ سوری سے محاربے اور ایران کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔

منشی احمد حسین خاں کا بھی شمار ابتدائی عہد کے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اردو ناول کی روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ معاشرتی ناولوں کے ساتھ انھوں نے چند تاریخی ناول بھی تخلیق کیے ہیں۔ جن میں 'جواں مردی'، 'مہر النساء' اور 'نادر شاہ' اہمیت کے حامل ہیں ان کے تینوں ناول مغلیہ عہد کے ایک طویل عہد کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جس میں عہد جہانگیر سے لے کر نادر شاہ کے حملے اور اس کے بعد 1857 کے خونین انقلاب کی تاریخ کو اپنے تینوں ناولوں میں سمیٹا ہے۔

حکیم محمد سراج الحق، عبد الحلیم شرر کے معاصرین میں سے ہیں۔ آپ رسالہ دلگداز کے پبلشر تھے۔ شرر کی تقلید میں انھوں نے بھی دو تاریخی ناول تخلیق کیے جن میں پہلا ناول 'فیروز شاہ' اور دوسرا ناول 'ماہ دخت' ہے۔ تاریخی اعتبار سے ناول 'فیروز شاہ' اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ناول 1930 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں فیروز شاہ بہمنی کے عہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس موضوع کے تناظر میں ناول نگار نے فیروز شاہ بہمنی اور راجہ دیورائے وال بیجا نگر کے محاربوں کے ساتھ سچے تاریخی واقعات کو نہایت ہی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

موہن لال فہم بھی اردو کے اولین تاریخی ناول نگار ہیں۔ آپ لکھنؤ کے رہنے والے تھے شرر کے ناولوں سے متاثر ہو کر آپ نے بھی متعدد تاریخی ناول تخلیق کیے ہیں جن میں 'بزم اکبری' بلاس کماری، چاند سلطانہ، شیر دکن، مقدس دیوی، سیلاب خون، ترکی حرم سرا، اورنگ زیب عالم گیر اور چنچل کماری تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

موہن لال فہم کے ناولوں میں خالص ہندوستان نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی عہد بہ عہد تاریخ، تہذیب و تمدن ان کے ناولوں میں مرکزیت رکھتے ہیں۔ ناول بلاس کماری جو 1920 مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا۔ اس ناول میں عہد عالم گیر کا مرقع ہے جس میں انھوں نے راجپوت قوم کے اوصاف قومی پاسداری اور حب الوطنی کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک راجپوت لڑکی بلاس کماری کی عصمت و عفت کے تحفظ کے لیے اٹھائے گئے بہادری کے اقدامات کا نہایت شاندار بیان بھی ملتا ہے۔ ان کا دوسرا اہم ناول 'چاند سلطانہ' ہے جو 1930 میں سیٹھ کندن لال پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع دکن کی تاریخ سے متعلق ہے جس میں انھوں نے بیجاپور اور احمد نگر کے تاریخی حالات کو قلم بند کیا ہے۔ ان کا تیسرا اہم ناول 'سیلاب خون' پہلی جنگ آزادی کے واقعات، انگریزوں کی کارروائیاں، ملک کی تباہی نانا صاحب اور جھانسی کی رانی کے اقدامات کا احاطہ کیے ہوئے شیواجی اور ان کے کارناموں کو موضوع بنا کر شیر دکن تخلیق کیا۔ اس ناول میں مغلوں اور مرہٹوں کے مابین ہونے والے معرکوں کو تاریخی جزئیات کی روشنی میں پیش کیا۔ موہن لال فہم کے ناولوں میں مغلیہ عہد کے ہندوستان کی تاریخ نظر آتی ہے۔ اس عہد کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اتھل پتھل، حکمرانوں کی کارروائیاں اور اس عہد کے اہم تاریخی واقعات کو ناول کے پیرائے میں نہایت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ موہن لال فہم نے اگرچہ عبد الحلیم شرر کی تقلید میں تاریخی ناول نگاری کی ابتدا کی تھی مگر ان کے ناولوں پر شرر کے اثرات نہیں مرتب ہوئے۔ انھوں نے شرر سے علیحدہ اپنی ایک راہ نکالی اور موضوعات بھی اپنی ہی سر زمین کی تاریخ کو بنایا۔ موہن لال فہم کی تاریخی ناول نگاری سے متعلق ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں رقم طراز ہیں:

''شرر کے مقابلے میں بنکم چند سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ شرر کے مقلدین نے ہندوستان کے مقابلے میں دور دراز کے علاقوں سے زیادہ دلچسپی دکھائی ہے لیکن فہم کے نالوں کا پس منظر ہندوستان کی تاریخ ہے۔ ان کی ذہنیت اور انداز تحریر پر بھی بنکم چند کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔''

(اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء، ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں، نامی پریس لکھنؤ، نومبر 1982، ص 149)

ایڈوکیٹ سراج الدین بھی اردو کے اولین تاریخی ناول نگاروں میں سے ہیں۔ ان کا مشہور ناول داستان پاستان ہے جو حمید یہ اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع فتح اندلس اور اس عہد کی تاریخی صورت حال ہے جس کو ناول نگار نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا اور اس عہد کے تاریخی حقائق کو بھی بڑی مستعدی سے افسانوی انداز میں بیان کیا ہے۔

مذکورہ بالا ناول نگار اردو کے اولین تاریخی ناول نگار ہیں جن کا عہد 1888 سے 1930 تک ہے۔ ان میں عبد الحلیم شرر کی حیثیت اردو میں تاریخی ناول نگار کی بنا رکھنے والوں میں سے ہیں۔ شرر نے نہ صرف تاریخی ناول کی بنیاد رکھی بلکہ کثرت سے دو درجن سے زائد تاریخی ناول لکھ کر اردو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت کا آغاز کیا۔

شرر کی اس تاریخی روایت سے متاثر ہو کر ان کے معاصرین نے بھی تاریخی ناول کے میدان میں طبع آزمائی کی اور بہ کثرت تاریخی ناول تخلیق کیے اور اردو تاریخی ناول کے خزانے میں اضافہ کیا۔ یہ تمام تاریخی ناول نگار اردو میں تاریخی ناول نگاری کے بنیاد گزار ہیں، جنھوں نے اس روایت کو رواج بخشا اور اردو میں تاریخی ناول نگاری کے فن کو فروغ دیا۔

■

Ammar Shahid
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.:8853656283
Email.: ammaralig1992@gmail.com

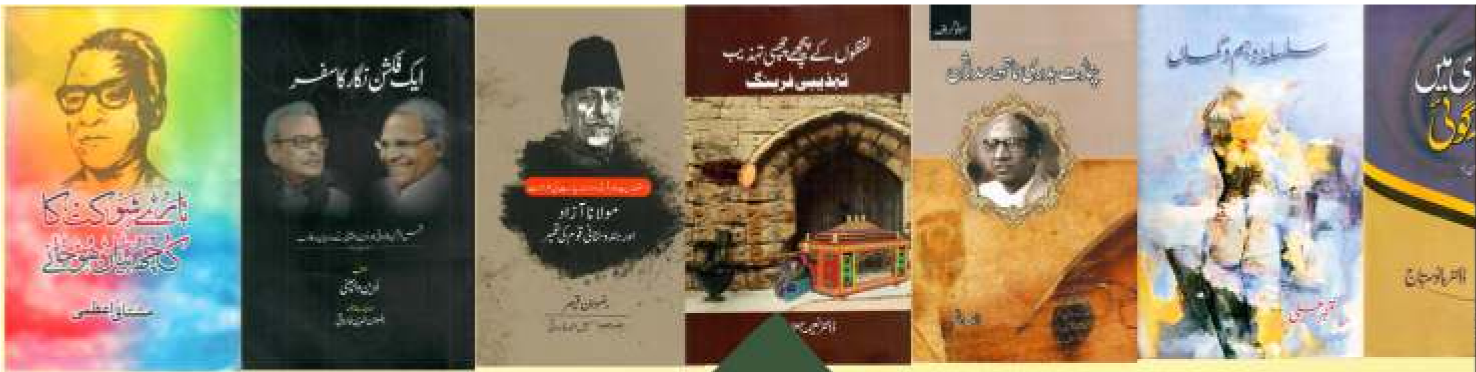

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

استعماریت اور فرقہ وارانہ سیاست کی مزاحمت: مولانا آزاد اور ہندوستانی قوم کی تعمیر

مصنف: رضوان قیصر

مترجم: ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی

صفحات: 425، قیمت: 240 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: نایاب حسن، ہلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

ممتاز مجاہد آزادی، پہلے وزیر تعلیم اور نابغۂ روزگار مفکر، عالم دین، دانشور و ادیب مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور افکار پر اردو سمیت مختلف زبانوں میں سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور وقتے وقتے سے اب بھی ان پر اہل علم و دانش لکھ رہے ہیں۔ اس سال کے اوائل میں معروف مؤرخ سید عرفان حبیب کی انگریزی میں ایک کتاب 'ابوالکلام آزاد: اے لائف' آئی تھی جس میں کئی خامیاں بھی ہیں، مگر من حیث المجموع انگریزی خواں طبقے کو نئے زمانے میں مولانا کی سوانحی معلومات فراہم کرنے کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔ ابھی جولائی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ایک کتاب 'استعماریت اور فرقہ وارانہ سیاست کی مزاحمت: مولانا آزاد اور ہندوستانی قوم کی تعمیر' کے نام سے شائع کی ہے۔ یہ کتاب اصلاً انگریزی زبان میں ہے، جس کا نام Resisting Colonialism & Communal Politics: Maulana Azad & the Making of the Indian Nation ہے اور اس کی اولین اشاعت منوہر پبلی کیشنز کے زیر اہتمام 2011 میں عمل میں آئی تھی، 2012 میں اس کا پیپر بیک ایڈیشن آیا تھا۔ اس کے مصنف رضوان قیصر مرحوم ہیں، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر تھے، مئی 2021 میں کورونا وبا کے دوران ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر صہیب عالم نے 'أبو الکلام آزاد و تشکل الأمة الهندية في مناهضة الاستعمار والسياسات الطائفية' کے نام سے کیا، جو 2013 میں موسسۃ الفکر العربی بیروت سے شائع ہوا ہے۔ زیر نظر اردو ترجمہ معروف مترجم ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے کیا ہے۔

یہ کتاب مروجہ معنوں میں مولانا کی سوانح حیات نہیں ہے؛ بلکہ اس میں مولانا کے سیاسی افکار کی تشکیل، آزادی کی تحریک میں ان کے کنٹری بیوشن، کانگریس کی صدارت اور اس کی پالیسیوں، اقدامات میں ان کی حصے داری، تقسیم ہند کے تعلق سے ان کے نظریے، تقسیم کو ٹالنے کی ان کی عملی کوششوں اور اس ضمن میں کانگریس کے مختلف لیڈران سے ان کے اختلافات اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب بنیادی طور پر (طبع اول و دوم) کے دو دیباچوں، اظہار تشکر، چھ ابواب، اختتامیہ اور کتابیات پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں مصنف نے مولانا پر دستیاب لٹریچر کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ان کی سیاسی فکر کے ارتقا کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ کتاب کا پہلا باب ہے 'تاریخی پس منظر: آزاد مستحکم نظریاتی اور سیاسی بنیادوں کی تلاش میں (1906-1918)' اس میں انھوں نے عابد حسین، محمد مجیب، ایان ہنڈرسن ڈگلس، وی این دتا، پی این چوپڑا، اعجاز احمد، فاروق

قریشی، سیدہ سیدین حمید وغیرہ جیسے دانشوران اور مصنفین کے اقوال و آرا کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا کے نیشنلسٹ سیاسی رجحانات کے آغاز کا سراغ لگایا ہے اور خود 'الہلال' وغیرہ کی تحریروں کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا جن دنوں پان اسلامزم یا جامعہ اسلامیہ کی دعوت دے رہے تھے، ان دنوں بھی وہ مشترکہ قومی جدوجہد میں ہی یقین رکھتے تھے اور اس دوران بھی انھوں نے جب جب ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر لکھا یا اظہار خیال کیا، تو ہندوستان کے تمام شہریوں کے اشتراک پر زور دیا۔ اسی باب میں 1902 سے 1910 تک کے عرصے میں مولانا کی مذہب سے دوری، تامل و تفکر اور بازواپسی کی روداد بھی بیان کی گئی ہے۔ بنگال کے انقلاب پسندوں سے وابستگی اور شیام سندر چکرورتی سے رابطہ، 1912 میں 'الہلال' کی شروعات اور اس کے پلیٹ فارم سے قومی جدوجہد میں باضابطہ داخلہ، حکومتی عتاب، 'الہلال' کی بندش اور رانچی کے مورا باڑی میں مولانا کی نظر بندی پر اس باب کا اختتام ہوتا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ہے 'پان اسلامزم اور ہندوستانی قوم پرستی کے درمیان ہم آہنگی کی کوششیں (1922-1919)' اس کا آغاز مصنف نے مولانا کی رانچی میں نظر بندی کے دنوں کی مصروفیتوں کی تفصیلات سے کیا ہے، کہ مولانا نے وہیں اپنی مشہور کتاب 'تذکرہ' لکھنا شروع کی، لوگوں سے ربط و ارتباط بڑھایا اور ان کی سماجی و اخلاقی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، انجمن اسلامیہ قائم کیا اور اس کے تحت ایک مدرسہ بھی شروع کیا گیا، قرآن کریم کا خصوصی مطالعہ کرتے رہے، جس کے نتیجے میں ان کی معرکۃ الآرا ترجمہ و تفسیر قرآن 'ترجمان القرآن' منظر عام پر آئی۔ رانچی میں مولانا کی سرگرمیوں پر جمشید قمر (مولانا آزاد کا قیام رانچی: احوال و آثار) اور پروفیسر منظر حسین (مولانا آزاد کی علمی و دینی خدمات قیام رانچی کے حوالے سے) کی کتابیں تفصیلی روشنی ڈالتی ہیں۔ مصنف نے اس باب میں یہ بھی بتایا ہے کہ نظر بندی کے دنوں میں بھی مولانا ملکی سیاست سے بے خبر نہ تھے، سید سلیمان ندوی، محمد علی قصوری اور دگر مختلف الخیال شخصیات سے سیاسی، علمی و فکری معاملات پر ان کی مراسلت جاری تھی۔ دسمبر 1919 کے اواخر میں مولانا کی رہائی عمل میں آئی، اوائل جنوری تک وہ رانچی میں ہی رہے، 18 جنوری 1920 کو مولانا کی گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ باہر آئے تو ملکی سیاست کا احوال بدلا ہوا تھا، تحریک خلافت کا ڈول اکتوبر-نومبر 1919 میں ہی ڈالا جا چکا تھا، مختلف سطحوں پر قائدین اس حوالے سے سرگرم تھے، اس کے ساتھ ہی ترک موالات کی تحریک بھی شروع کی گئی، مولانا باہر آنے کے بعد ان تحریکوں میں شامل ہو گئے۔ مصنف نے قدرے تفصیل سے تحریک خلافت و ترک موالات کے مختلف عناصر کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ دونوں تحریکیں اصلی ہدف کے حصول کے اعتبار سے ناکام رہیں، ترکی میں خلافت کے خاتمے سے تحریکِ خلافت کی معنویت جاتی رہی اور گورکھپور کے چوراچوری میں تشدد کا ایک واقعہ رونما ہوا، جس کے بعد گاندھی نے دوسرے رہنماؤں سے مشورہ کیے بغیر تحریک ترک موالات کی واپسی کا اعلان کر دیا، اس وقت تحریک کے دگر بہت سے رہنماؤں کے ساتھ مولانا آزاد بھی علی پور جیل میں بند تھے، ان کے مقدمے کی سماعت چل رہی تھی، اسی موقعے سے انھوں نے اپنا تحریری بیان دیا تھا، جو 'قول فیصل' کے نام سے مشہور و متداول ہے اور مولانا کی بے خوبی و بے باکی، اپنے نصب العین کے تئیں غیر متزلزل وابستگی اور فکر و نظر کے استحکام پر دلالت کرتا ہے۔ تحریک خلافت و ترک موالات کے دوران ملک کے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان غیر معمولی اتحاد و اتفاق دیکھا گیا تھا، مگر اس کے خاتمے کے ساتھ ہی وہ اتحاد بھی جاتا رہا۔ مصنف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"تحریک کی واپسی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی عمارت میں دراڑ سی پڑ گئی، جو دوران تحریک بڑی جانفشانی سے کھڑی کی گئی تھی۔ تاہم جو چیز واضح شکل میں دیکھی جا سکتی تھی، وہ خود مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی تفریق تھی جب تحریک سے مایوسی کی وجہ سے بعض افراد نے فرقہ وارانہ سیاست کا رخ کیا، جبکہ دوسرے اتحاد کی سیاست پر مبنی قوم پرستی کے ہی وفادار رہے، آزاد نے مؤخر الذکر راستہ اختیار کیا۔" (ص 87)

یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد ہندوستانی سیاست کا رخ بڑی تیزی سے بدلا اور جہاں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والا اتحاد جاتا رہا، وہیں خود مسلمان مجموعی طور پر دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ مسلمانوں کی سطح پر تحریک خلافت کا یہ پہلو بڑا دلچسپ ہے کہ بہت سے وہ لوگ، جو اس سے قبل لبرل طرز سیاست کے حامی اور اس کے پیروکاروں میں تھے، انھوں نے اس کے بعد فرقہ وارانہ سیاست کا دامن تھام لیا، جبکہ ان لوگوں کی اکثریت مشترکہ قومی سیاست اور نظریے کی حامی رہی، جنھوں نے اس تحریک میں شمولیت یا اس کی قیادت خالص مسلم مسئلے کی حیثیت سے کی تھی۔ تحریک خلافت کی موزونیت یا ناموزونیت اور اس کے حاصلات و نتائج پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے، مصنف نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے، مگر اردو میں ایک اہم کتاب قاضی عدیل عباسی کی ہے 'تحریک خلافت' (ط: ترقی اردو بورڈ/قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی 1978) کے نام سے۔ قاضی عدیل عباسی خود بھی بڑے سرگرم مجاہد آزادی رہے، تحریک خلافت کے دنوں میں وہ مشہور اخبار 'زمیندار' کے ادارۂ تحریر میں تھے، انھوں نے زیادہ مبسوط، مفصل اور جامع انداز میں اس تحریک کا جائزہ لیا ہے۔

کتاب کے تیسرے باب کا عنوان ہے 'یکجہتی کی سیاست: آزاد اور انڈین نیشنل کانگریس 1934-1923'، اس باب میں مصنف نے تحریک خلافت کے بعد دس سالوں کے دوران سیاسی حالات، ہنگاموں اور قومی سطح کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ پیش کیا ہے، جس میں شدھی تحریک، موپلا بغاوت، مولانا آزاد کو کانگریس کی صدارت کی تفویض اور کانگریس کے دو دھڑوں میں مفاہمت قائم کروانے کی ان کی کوششوں، تحریک خلافت کے تئیں ان کی رائے میں تبدیلی، فرقہ وارانہ ہنگاموں کے حل کے تئیں ان کے عملی اقدامات اور نظریہ، نہرو رپورٹ کا ظہور اور اس کے تئیں مسلمانوں کے شکوک و شبہات، ان کے چودہ نکاتی مطالبات، مختلف سیاسی جماعتوں اور گروپوں کا ظہور، ان کے نظریات اور طرزِ فکر و عمل، گول میز کانفرنس، کمیونل اوارڈ اور سائمن کمیشن کی پیش کردہ رپورٹ وغیرہ کا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے بڑی گہرائی سے ان واقعات کا مطالعہ کیا، ان کی کڑیوں کو ایک دوسرے سے ملایا اور ان میں مولانا آزاد کے کردار پر خصوصی روشنی ڈالی ہے۔

چوتھا باب 'اشتراکِ اقتدار کا تصور اور تہذیبی شناخت' کے عنوان سے ہے، جس میں 1935 تا 1940 کے دورانیے کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ دور ہندوستانی سیاست کے لیے تو اہم تھا ہی، ساتھ ہی مولانا آزاد کے لیے بھی بڑی آزمائش کا دور تھا، کہ اس زمانے میں سیاسی حالات خالص فرقہ وارانہ خطوط پر پلٹا کھا رہے تھے، ہر دن گویا ایک نئی آندھی آتی تھی، جس میں فکر و دانش کے بڑے بڑے پیڑ اکھڑ کر ادھر یا اُدھر گر رہے تھے، فہم و فکر کا توازن قائم رکھنا اچھے اچھوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ مصنف نے اس باب میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 37-1936 کے عام انتخابات، ان کے نتائج اور مختلف ریاستی حکومتوں کے قیام میں مولانا آزاد کے رول، یوپی میں مسلم لیگ کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کے سلسلے میں مولانا آزاد کے موقف اور دیگر کانگریسی لیڈران کے

عمل، مسلمانوں کی حکومت میں حصے داری کے تئیں مولانا آزاد کی کوششیں، مسلمانوں کی بے اطمینانی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کی عوامی رابطہ مہم، اردو ہندی تنازعات اور ان پر مولانا آزاد کے نقطۂ نظر، مختلف کانگریسی ریاستوں کے سماجی، سیاسی و ثقافتی حالات، لیگی الزامات اور ان کی حقیقت، فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے پر مولانا آزاد کی خصوصی توجہات اور 1940 میں مولانا کے دوبارہ کانگریس صدر منتخب ہونے تک کا احاطہ کیا ہے۔اس باب کے مطالعے سے ہمیں 1935 سے 1940 کے دوران ہندوستان میں بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ مسائل، ان کے تئیں کانگریس اور مسلم لیگ کے مجموعی رویے اور مولانا آزاد کے خصوصی رویے، طرزِ فکر اور عملی اقدامات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

پانچویں باب میں 'متحدہ اور وفاقی ہندوستان کی طرف' کے عنوان سے 1940 سے 1947 یعنی آزادی و تقسیم ہند تک کے سیاسی احوال کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب کی شروعات مصنف نے کانگریس کے رام گڑھ سیشن اور اس میں مولانا کے تاریخی صدارتی خطبے کے مختلف نکات و اجزا پر گفتگو سے کی ہے اور خصوصاً اس عرصے میں بدتر ہوتے فرقہ وارانہ حالات کا جائزہ لیا ہے۔اس میں دوسری جنگ عظیم کے تئیں کانگریس کے موقف اور اس پر مختلف رہنماؤں میں اختلاف پر بھی بحث کی گئی ہے۔اسی طرح عدم تشدد کے مسئلے پر مولانا آزاد کے گاندھی سے اختلاف اور اس مسئلے پر کانگریس پارٹی میں اندرونی خلفشار، عبوری حکومت میں شمولیت کے مسئلے پر مسلم لیگ اور جناح سے ان کی مکاتبت اور جناح کے جنگ آمیز رویے کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس باب میں مصنف نے جنگ عظیم دوم کے مسئلے پر برطانوی حکومت کی 'اگست پیش کش' اور اس پر کانگریس و مسلم لیگ کے موقف، ہندوستان کی کامل آزادی کے مسئلے پر گاندھی اور کانگریس کی ستیہ گرہ مہم، مولانا آزاد کی ستمبر 1940 میں گرفتاری اور دسمبر 1941 میں رہائی، کرپس مشن کی آمد اور مذاکرات، 1942 میں ہندوستان چھوڑو تحریک اور اس کے تئیں مولانا کا موقف، مولانا کی گرفتاری اور 1945 میں رہائی، اس عرصے میں ملک کے سیاسی حالات میں تیز تر تبدیلی اور فرقہ وارانہ حالات کی سنگینی، شملہ کانفرنس اور اس کے نتائج، فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے مولانا کا منصوبہ، اس حوالے سے گاندھی کو ان کا خط اور ان کا جوابی رویہ، کیبنٹ مشن کی آمد اور اس سے مولانا کے مذاکرات اور ملک کی تقسیم کو ٹالنے کی ان کی آخری حد تک کوشش کا جائزہ پیش کیا ہے۔

رضوان قیصر کی زیر مطالعہ کتاب کا چھٹا باب ہے 'قوم کے لیے علمی، سائنسی اور ثقافتی اداروں کی تعمیر'، اس باب میں انھوں نے آزادی کے بعد بحیثیت وزیر تعلیم مولانا کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔اس کی شروعات انھوں نے آزادی سے قبل کی عبوری حکومت میں بحیثیت وزیر تعلیم مولانا کی شمولیت کے پس منظر پر اشارے کے ذریعے کی ہے اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی جو خدمات رہیں، ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔یہ باب اردو والوں کے لیے خصوصاً بہت معلومات افزا ہے، کہ آزادی کے بعد دس سال کے عرصے میں تعلیم کے میدان میں جو پیش رفتیں ہوئیں، ابتدائی و اعلی سطح پر تعلیم کو بہتر اور منظم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے، جو اہم ادارے قائم کیے گئے، ثقافتی و سائنسی اداروں کے قیام میں مولانا نے جو دلچسپی لی؛ ان سب سے متعلق اہم اور مستند حوالوں کی روشنی میں دستاویزی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

رضوان قیصر نے 'اختتامیہ' میں اپنی کتاب کے مباحث کو سمیٹتے ہوئے مولانا کی سیاسی فکر اور ان کے طرزِ عمل کا نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولانا کی سیاست حقیقت پسندانہ تھی؛ چنانچہ ہر موقعے پر انھوں نے عوام پسندانہ مصلحتوں کی بجائے زمینی صورت حال کو سامنے رکھ کر کوئی بھی موقف اختیار کیا، البتہ مصنف کی نظر میں تحریک خلافت کا موقع ایسا تھا، جب وہ عوامی حمایت پسندی کے جوش میں بہہ گئے؛ حالانکہ اس کے پس پشت بھی دراصل ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ اور اس میں تمام ہندوستانیوں کو شامل کرنے کا مقصد کارفرما تھا۔اسی طرح مصنف نے اس سوال پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کیا مولانا آزاد اپنی سیاست میں ناکام رہے؟ وی این دتا اور ایان ہنڈرسن ڈگلس کے تجزیوں کا سہارا لیتے ہوئے وہ تقسیم ہند کو صرف آزاد کی بجائے مجموعی طور پر کانگریس پارٹی کی قوم پرستانہ تحریک کی ناکامی قرار دیتے ہیں۔

کتاب کے مترجم ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی (سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) اردو کے سینئر ادیب، ناقد اور دانشور ہیں، منجھے ہوئے مترجم ہیں اور درجنوں کتابیں انھوں نے ترجمہ کی ہیں، ان کے تراجم متن کی بھرپور عکاسی کے ساتھ سلاستِ زبان و بیان کا بھی عمدہ نمونہ ہوتے ہیں، ایک نمونہ یہ کتاب بھی ہے۔کہیں کہیں کچھ کمپوزنگ کی ہلکی پھلکی غلطیاں رہ گئی ہیں، جو سوا چار سو صفحوں کی کتاب میں مستبعد بھی نہیں ہیں، اختتامیے میں البتہ صفحہ نمبر 396 پر شیخ الہند کا نام 'حسن محمود' لکھا ہوا ہے، اسے ٹھیک کرنا چاہیے؛ کیونکہ ان کا درست نام 'محمود الحسن' ہے، اور بجنل متن میرے پیش نظر نہیں، اگر وہاں بھی یہی لکھا ہے، تو وہاں بھی اصلاح ہونی چاہیے۔دوسری بات کتاب کے اردو نام کے تعلق سے ہے، اس کا پہلا جز ہے 'استعماریت اور فرقہ وارانہ سیاست کی مزاحمت'، یہاں لفظ 'کی' مفہوم کو دھندلا رہا ہے، اس کی جگہ اگر 'کے خلاف' ہوتا، تو زیادہ بہتر اور واضح ہوتا 'استعماریت اور فرقہ وارانہ سیاست کے خلاف مزاحمت'۔تیسری بات حواشی کے تعلق سے ہے، ادارے نے غالباً مصنف کے طریقۂ کار کو فالو کرتے ہوئے ہر باب کے حواشی اس کے آخر میں دیے ہیں، تحقیقی کتابوں اور مقالات میں تحشیے کا یہ طریقہ بھی رائج اور درست ہے، مگر غلطی یہ ہوئی ہے کہ مختلف ابواب میں کئی حواشی سرے سے درج ہی نہیں کیے گئے؛ چنانچہ دوسرے باب میں حاشیہ نمبر 1 سے 13 تک تسلسل درست ہے، اس کے بعد سیدھے حاشیہ نمبر 28 اور آگے کے حواشی آجاتے ہیں، گویا حاشیہ نمبر 14 سے لے کر حاشیہ نمبر 27 تک درج ہی نہیں کیے گئے۔یہ مسئلہ دوسرے ابواب میں بھی ہے، البتہ وہاں ایک دو حاشیے چھوٹے ہیں، یہ بھی بڑی غلطی ہے اور اس کی اصلاح بھی ضروری ہے۔بہرحال مجموعی طور پر کتاب بہت عمدہ، معلومات افزا اور مولانا آزاد پر اردو لٹریچر میں وقیع اضافہ ہے۔

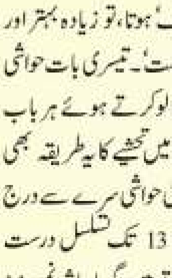

پنڈت بدری ناتھ سدرشن

مصنف: الف ناظم

صفحات: 132، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: نواز شریف، شکری فاکرن ٹولہ پوسٹ شکری ضلع مدھوبنی بہار 847239

پنڈت بدری ناتھ سدرشن محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کی ادبی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں ان کی کتابوں کا ایڈیشن ایک ہی برس میں کئی کئی بار شائع ہو جایا کرتا تھا، ان کے ادبی شہ پارے نہ صرف اردو زبان و ادب میں بلکہ ہندی ادب میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور شوق سے پڑھے جاتے تھے، اس عہد کے تمام بڑے افسانہ نگاروں نے سدرشن کی افسانہ نگاری کا اعتراف کیا ہے۔سدرشن کے مداحوں میں سب سے بڑا نام پریم چند کا ہے۔

پنڈت سدرشن کا شمار پریم چند اسکول کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کی سچی تصویریں پیش کیں جس کی وجہ سے فطرت نگار سدرشن کہلائے اور آریہ سماج کے نظریے سے متاثر ہوکر دعوت وتبلیغ کا کام بھی سرانجام دیا جس سے مہاشہ سدرشن کے نام سے بھی جانے گئے۔ایسی ہمہ جہت شخصیت صدیوں میں دو چار ہی پیدا ہوتی ہیں جنھوں نے افسانہ، ناول، ڈراما، شاعری، ادب اطفال، طنزو ظرافت، صحافت، تراجم، اور فلم کے شعبے میں بھی طبع آزمائی کی ہو۔

ڈاکٹر الف ناظم (افتخار احمد قادری) کا تعلق اتر پردیش کے ضلع پیلی بھیت سے ہے، تحقیق وتدوین اور تراجم ان کی دلچسپی کا مرکز ہے، گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں، ان کی تصنیفات میں مصحفی اور مثنویات مصحفی، بیان مصحفی، سرور جہاں آبادی: تحقیقی وتنقیدی جائزے، سرور جہاں آبادی اور اکسیر سخن، سرور جہاں آبادی کا نو دریافت کلام، سرور جہاں آبادی اور سمگر (ہندی)، باقیات سرور جہاں آبادی اور کلیات سرور جہاں آبادی شائع ہوچکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'پنڈت بدری ناتھ سدرشن' ان کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے، جس میں انھوں نے پنڈت سدرشن کی زندگی، ان کی ادبی خدمات، ان کی تخلیقات کا انتخاب، انشائیہ اور ڈراما کو چار مختلف ابواب اور مزید ذیلی زمروں میں تقسیم کرکے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر الف ناظم نے پنڈت سدرشن کی مختصر سوانح عمری، ذہنی وفکری نشوونما، احوال وکوائف، ادبی زندگی کی ابتدا، افسانہ وناول نگاری، ڈراما، ادب اطفال، گیت اور دیگر مضامین کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔

پہلے باب کا عنوان 'سدرشن کی سوانح اور شخصیت' ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر الف ناظم نے پنڈت سدرشن کی پیدائش، ابتدائی تعلیم، ملازمت، شادی، ملازمت سے استعفیٰ، ملازمت سے برطرفی، معاشی بحران، تحریک آزادی، فلمی دنیا اور ادبی زندگی کی ابتدا تک کا احاطہ کیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان 'پنڈت سدرشن کی تصنیفات وتالیفات کا جائزہ' ہے۔

اس باب میں ان کے افسانوی مجموعوں اور ناولوں کے نام، سن اشاعت، افسانوں کے عنوان اور تعداد بیان کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ڈراما، بچوں سے متعلق کتب اور دیگر مضامین کی تفصیلات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان 'سدرشن کی ادبی خدمات' ہے۔ اس باب میں انھوں نے ان کے افسانوں کے موضوعات اور اسلوب پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور ساتھ ہی ان کی ناول نگاری، ڈراما نگاری، گیت نگاری اور ادب اطفال کا جائزہ پیش کیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان 'سدرشن کی تخلیقات کا انتخاب' ہے

اس باب میں: (الف) افسانہ: وزیر عدالت، شاعر کا انتخاب، باجو باورا، ہار کی جیت

(ب) انشائیہ: سائیکل کی سواری

(ج) مختصر ڈراما: راجپوت کی شکست کو پیش کیا گیا ہے۔

سدرشن کو کم عمری سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، اس زمانے میں سدھار (ریفارم) کا بہت زور تھا، سدرشن اس طرح کی مجلس میں لیکچر سننے کے لیے جایا کرتے تھے کہ ایک دن ان کی ملاقات 'سوامی چتیہ نند' سے ہوئی انھوں نے ان سے کہا ''سدرشن لکھتے ہوتو لکھو لیکن لکھتے وقت یہ سوچ لیا کرو کہ اسے پڑھنے والے کا کچھ بھلا بھی ہوگا یا صرف ناٹک کی طرح وقت ہی برباد ہوگا۔'' اس وقت کے ناٹک بڑے بے ہودہ قسم کے ہوا کرتے تھے، یہ بات سدرشن کے ذہن میں بیٹھ گئی اور اپنی تخلیقات میں اس نکتے کو پیش نظر رکھا اسی لیے ان کے افسانوں میں اصلاحی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کا ایک مشہور زمانہ افسانہ 'ہار کی جیت' ہے۔ ڈاکٹر الف ناظم نے اس کتاب میں اس افسانے کا بھی انتخاب کیا ہے جس کے اندر ایک کردار بابا بھارتی ہے جس کے پاس ایک ایسا خوبصورت، لمبا، چوڑا، چست، تندرست گھوڑا تھا جس کی شہرت پورے علاقے میں تھی، اس گھوڑے کا نام سلطان تھا، بابا بھارتی جب تک شام کو اپنے پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر اس پر چڑھ کر آٹھ دس میل کا چکر نہ لگا لیتے انھیں چین نہ آتا، لیکن اس خوبصورت گھوڑے 'سلطان' کی خبر اس علاقے کے مشہور ڈاکو کھڑک سنگھ کو لگ گئی اور وہ اسے دیکھنے کے لیے بابا کے پاس آگیا، کھڑک سنگھ گھوڑے کی چال دیکھ کر من ہی من یہ کہنے لگا کہ ایسا گھوڑا کھڑک سنگھ کے پاس ہونا چاہیے تھا، کھڑک سنگھ جاتے جاتے باباجی سے بولا بابا جی میں یہ گھوڑا آپ کے پاس نہ رہنے دوں گا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس گھوڑے کو باباجی کو دھوکے میں ڈال کر چھین کر بھاگنے لگا تو باباجی نے اسے آواز دی اور کہا اس واقعہ کو کسی سے ظاہر نہ کرنا، کھڑک سنگھ اس بات سے حیران ہوگیا اسے لگا کہ باباجی مجھ سے اپنا گھوڑا حاصل کرنے کے لیے منت سماجت کریں گے لیکن یہ تو اس کے برعکس ہوا، وہ مزید حیران ہوکر باباجی سے پوچھ ہی دیا کہ اس میں آپ کو کیا ڈر ہے تو باباجی نے جواب دیا لوگوں کو اگر اس واقعہ کا پتہ لگ گیا تو وہ کسی غریب، کمزور پر یقین نہیں کریں گے، دنیا سے یقین اٹھ جائے گا اور لوگ کسی کی مدد کو سامنے نہیں آئیں گے۔

بابا بھارتی کا یہ جملہ ڈاکو کھڑک سنگھ کے کانوں میں گونجنے لگا اور وہ سوچتا چلا گیا کہ کیسے اعلیٰ درجے کے خیالات ہیں، کیسا مقدس جذبہ ہے، اسے اس گھوڑے سے بے انتہا محبت تھی، کہتا تھا کہ اس کے بغیر رہ نہ سکوں گا مگر اس نے ذاتی نقصان کو انسانیت کے نقصان پر نچھاور کردیا اور پھر ڈاکو کھڑک سنگھ رات کے تیسرے پہر سلطان کو بابا کے اصطبل میں اسی جگہ باندھ دیا جہاں وہ اس سے پہلے باندھا جاتا تھا اور کھڑک سنگھ کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو لہرا رہے تھے۔

پنڈت سدرشن نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا پسندیدہ میدان افسانہ نگاری ہی تھا، ان کے افسانوں کی خاص بات اس میں اصلاحی پہلو کا نمایاں ہونا ہے، جو مذکورہ بالا افسانے سے بھی ظاہر ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر الف ناظم کی یہ کتاب اردو ادب میں پنڈت بدری ناتھ سدرشن کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کو سمجھنے اور ان کے مقام و مرتبہ کے تعین میں معاون ومددگار ثابت ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب: تہذیبی فرہنگ

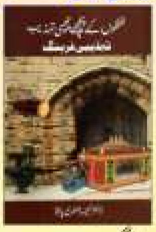

مصنف: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا
صفحات: 1057، قیمت: 1400روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: (ڈاکٹر) نسترن احسن فتیحی، M-43، سیکنڈ فلور
نزد نیوشان الٰہی مسجد، ہری کوٹھی روڈ، ابوالفضل انکلیو نئی دہلی۔ 25

گزری یادیں، گزری باتیں، بیتے دن اور بچھڑے لوگ
وہ تہذیبیں، وہ افسانے، شیریں زباں اور میٹھے لوگ

—نعیمہ جعفری پاشا

تہذیب کسی ملک اور قوم کا میراث ہوتی ہے اور اس کی اہم خصوصیت بھی۔ کسی تہذیب میں قوموں کی زبان یا انداز گفتگو، رہن سہن، پوشاک اور مذہبی امور کے علاوہ دیگر کئی اہم امور شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک مخصوص معاشرے کی مخصوص تہذیب ہوا کرتی ہے اور وہی اس کی شناخت بن جاتی ہے۔ تہذیب کا تعلق ہمیشہ اجتماعی ہوتا ہے، انفرادی نہیں۔ روایات ہمیشہ خاندان میں نمو پاتے ہیں اور خاندانوں سے معاشرہ بنتا ہے۔ اس لیے خاندان اور روایات کی حفاظت میں خواتین پیش پیش رہتی ہیں۔ یعنی کسی تہذیب کو پروان چڑھانے، اسے آراستہ کرنے اور اس کی حفاظت کرنے میں خواتین کی شراکت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

'لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب' سماجی و ثقافتی اصطلاحات کی ایک ایسی قابل ذکر تہذیبی فرہنگ ہے جو انسانی معاشروں کی پیچیدگیوں اور ثقافتوں کی بھرپور تصویرکشی کرتی ہے۔ یہ فرہنگ ہماری دنیا کی تہذیبی روایات کی نہ صرف تعریف پیش کرتی ہے بلکہ اس کے رسم و رواج اور زندگیوں کو تشکیل دینے والے وسیع تر سماجی سیاق وسباق کے درمیان متحرک ردعمل کو سمجھنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے لیے ایک ناگزیر رہنما کے طور پر کام کرتی ہے۔ یہ فرہنگ اپنی تہذیب کو بچانے اور محفوظ کردینے کی ایک ایسی منفرد کاوش ہے جسے ایک خاتون نعیمہ جعفری پاشا کی ہمت اور جفاکشی نے ممکن کردکھایا ہے۔

یہ تہذیبی فرہنگ ایک ایسا انمول وسیلہ ہے، جو تہذیبی اصطلاحات کا نہایت احتیاط سے تیار کردہ مجموعہ پیش کرتا ہے۔ اس میں علم بشریات اور سماجیات سے لے کر لسانیات اور عالمی علوم تک وسیع موضوعات شامل ہیں۔ اس کے اندراجات جامع ہیں، اور گہرائی اور رسائی کے درمیان کامل توازن قائم کرتے ہیں۔ چاہے آپ ایک تجربہ کار اسکالر ہوں یا ایک متجسس نوخیز، آپ کے لیے یہ فرہنگ ایک قیمتی ساتھی ثابت ہوگی۔ اس تہذیبی فرہنگ کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک موضوعات سے اس کی وابستگی ہے۔ یہ ہمارے تہذیبی معاشرے کی متنوع نوعیت کو تسلیم کرتی ہے اور اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ احاطہ کردہ اصلاحات ثقافتوں، نسلوں اور روایات کی ایک وسیع صنف کی نمائندہ ہوں۔ یہ شمولیت انسانی تجربات کی فراوانی اور تنوع کے لیے گہری تعریف کو فروغ دیتی ہے، جو اسے ثقافتی تفہیم اور ہمدردی کو فروغ دینے کے لیے ایک ضروری وسیلہ بناتی ہے۔ اس کتاب کے فلیپ پر جناب حقانی القاسمی صاحب بجاطور پر کہتے ہیں کہ "اس تہذیبی فرہنگ کا شمار ایسی کتابوں میں کیا جائے گا جس کی افادیت کسی بھی عہد میں کم نہیں ہوگی۔"

اس تہذیبی فرہنگ میں اندراجات کی صرف خشک تعریفیں نہیں ہیں بلکہ ایسی بصیرت اور فکرانگیز تفصیلات ہیں جو معنوی پرتوں کو کھول دیتی ہیں۔ ہر اصطلاح کا ایک سیاق وسباق ہوتا ہے جو اس کے استعمال، تاریخی اہمیت اور عصری مباحث میں مطابقت کے بارے میں ایک وسیع تناظر فراہم کرتا ہے۔ یہ سیاق وسباق ان سماجی و ثقافتی تصورات کے باریک معنی اور مضمرات کو سمجھنے میں بے حد مددگار ہے۔

یہ تہذیبی فرہنگ آج اس لیے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے کہ گلوبلائزیشن اور کمیونیکیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں معاشرے اور نسل کی تہذیب یک رنگی ہوتی جارہی ہے۔ زبانیں اپنی خصوصیت کھورہی ہیں۔ رہن، سہن، پوشاک سوچ سب ایک سانچے میں ڈھلتے جارہے ہیں، ہماری نئی نسل اپنی تہذیب بھول چکی ہے۔ ایسے میں ان کی یہ کاوش یقیناً وقت کے ساتھ اور اہم ہوتی جائے گی۔

یہ تہذیبی فرہنگ محض تعریفوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس میں موجود کراس حوالہ جات مطالعے کے لائق ہیں اور یہ حقیقی دنیا کی مثالیں پیش کرتی ہے۔ چاہے آپ شناخت کی پیچیدگیوں کو تلاش کررہے ہوں، عالمگیریت کے اثرات کا جائزہ لے رہے ہوں، یا طاقت کی حرکیات کی پیچیدگیوں سے پردہ اٹھا رہے ہوں، یہ تہذیبی فرہنگ آپ کے فکری سفر میں ایک معاون رفیق ثابت ہوگی۔

ایک ایسے دور میں جہاں ثقافتی حساسیت اور عالمی بیداری انتہائی اہمیت کی حامل ہے، یہ تہذیبی فرہنگ علم کی روشنی کے طور پر سامنے آئی ہے۔ یہ مختلف ثقافتوں کے لیے نہ صرف احترام کو فروغ دیتی ہے، بلکہ مکالمے کو بھی فروغ دیتی ہے اور ان قوتوں کے بارے میں تنقیدی سوچ کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جو ہمارے معاشرے کی تشکیل کرتی ہیں۔ یہ معلمین، طلبا، محققین اور ہمارے اردگرد کی دنیا کے بارے میں گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے ایک لازمی حوالہ ہے۔ سماجی و ثقافتی اصطلاحات کی یہ تہذیبی فرہنگ حوالہ جاتی مواد پیش کرتی ہے اور اس کی وسعت، گہرائی، جامعیت اور پرکشش انداز اسے ان لوگوں کے لیے ایک حقیقی جوہر بناتی ہے جو اس کے سماجی اور ثقافتی تناظر میں انسانی تجربے کی پیچیدگیوں کو کھولنا چاہتے ہیں۔ یہ تہذیبی فرہنگ ہمارے معاشرے کی کثیر جہتی نوعیت کو سمجھنے اور اس کی تعریف میں حقیقی دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شخص کے بک شیلف پر نمایاں مقام کی مستحق ہے۔

مضامین

اردو شاعری میں بدیہہ گوئی

مصنف: ڈاکٹر بانو سرتاج
صفحات: 128، قیمت: 300 روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر غلام اشرف قادری، صدر شعبۂ فارسی
گاندھی فیض عام کالج، شاہجہاں پور 242001

'اردو شاعری میں بدیہہ گوئی' ڈاکٹر بانو سرتاج کی معروف کتاب ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر بانو سرتاج کی اردو ہندی زبانوں میں کم وبیش 120 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ان میں درجن بھر سے زیادہ کتابوں پر وہ انعامات حاصل کرچکی ہیں۔

اس کتاب میں انتساب اور اپنی بات کے علاوہ چھ طویل مضامین ہیں۔ یہ بھی مضامین شعر وشاعری سے متعلق ہیں۔ سب سے طویل مضمون 'اردو شاعری میں بدیہہ گوئی' ہے جو 51 صفحات پر مشتمل ہے۔ واضح کردوں کہ سارے مضامین اسی صفت یعنی بدیہہ گوئی کے معانی ومطالب اور اسی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

پہلا مضمون 'اردو شاعری اور اساتذہ کی اصلاحیں' ہے اس مضمون میں بڑے بڑے ناقدین کی آرا کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین اور ٹی ایس ایلیٹ جیسی شخصیات کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے ان پر بحث کی گئی ہے۔ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شاعری پر اصلاحیں نہ صرف ایک روایت رہی ہے بلکہ ضرورت تھی۔ جب تک استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کرتا وہ استاد شعرا کے زمرے میں نہیں آ سکتا تھا۔ دراصل اصلاح شاعری تعمیری تنقید کا حرف اول ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصلاح سخن استاد کی بدیہی صفت کو اجاگر کرتا ہے اور یہ مکمل طور پر مثبت بدیہہ گوئی پر انحصار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق، سیماب اکبرآبادی، سید شکیل دسنوی وغیرہ کے افکار کو نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اساتذہ کی اصلاحات اور تلامذہ کے فکر وفن کی سو سے زیادہ مثالیں دی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصلاح سے قبل اور بعد کتنا بڑا فرق آتا ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج نے اپنی بات میں لکھا ہے "اردو شاعری کے شگوفے خوب پڑھتی تھی، رجسٹر میں لکھ کر رکھتی تھی۔ فارسی آتی نہیں تھی اگر فارسی شعروں کے ساتھ اردو ترجمے ہوتے تو وہ بھی لکھ لیتی تھی۔ یہی شوق ان مضامین کی بنیاد ہے۔" الغرض نہ صرف اس مضمون بلکہ اس کتاب کے تمام مضامین کو وجود میں آنے میں کافی عرصہ بیت گیا ہوگا۔ دلچسپ پیرایے میں لکھا گیا یہ مضمون ہر لمحہ قاری کے دل کو گدگداتا ہے۔ واقعاتِ شعرا جو بدیہہ گوئی کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں نہ صرف پر مزاح ہیں بلکہ حیرت انگیز بھی ہیں۔ اسی طرح اس کتاب کا تیسرا مضمون 'مغلیہ دور کی خواتین کا ذوق شعری' محض تاریخ پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان کی شعر گوئی اور شعرا نوازی کا آئینہ بھی ہے۔ اس زمانے کی خواتین اپنے ذوق سلیم سے استادانہ کلام کہتی تھیں۔ اس طرح وہاں بھی استادی اور شاگردی کا سلسلہ رہا ہے اور زبردست شاعری بھی ہوئی ہے۔ مغلیہ عہد کے اولین دور میں شاعری فارسی میں ہوتی تھی مگر اورنگ زیب کے عہد تک اردو شاعری کو کافی عروج حاصل ہو گیا تھا۔ یہ مضمون خصوصی طور پر زیب النسا مخفی سے شروع ہوتا ہے۔ اس مضمون میں اورنگ زیب اور زیب النسا سے متعلق کئی شعری خصائص بھی درج ہیں۔ دوسرے شعرا و شاعرات کو بھی جگہ ملی ہے مگر مضمون کا بیشتر حصہ مرد شعرا کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس مضمون کی جو خاص بات ہے وہ یہ کہ طبع بدیہی کا خاصہ ہی شاعری کو جنم دیتا ہے اور مشق سخن ہی پختہ شاعری تک لے جاتی ہے۔ استاد اگر خلوت میں اصلاح سخن کرتا ہے تو بہتر شاعری کا نمونہ قاری کے سامنے آتا ہے۔ ایک مضمون 'فارسی ادب سے' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی سے مزین واقعات کو خوب جگہ دی ہے۔ فارسی شعرا کی بدیہی صلاحیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج نے فارسی دانی سے یکسر انکار کیا مگر اردو کے قادر الکلام شاعروں کے لیے فارسی نہ تو مشکل ہے اور نہ انکار کی گنجائش۔ غرض یہ مضمون بھی بہت ہی عالمانہ اور پُرمغز ہے۔ اس کتاب کو نو مشق قلمکار ضرور مطالعہ میں لائیں، یقیناً مستفیض ہوں گے۔

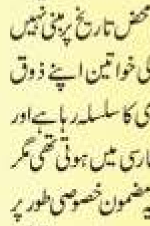

بارے شوکت کا کچھ بیاں ہو جائے

مصنف: مشتاق اعظمی

صفحات: 256، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مطبع: انجمٰی پبلی کیشنز، کولکاتا

مبصر: محمد شاہنواز خان، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مشتاق اعظمی کا تعلق یوپی کے زرخیز علاقے ضلع اعظم گڑھ سے ہے۔ آپ ایک لمبے عرصے تک ٹی ڈی بی کالج رانی گنج، مغربی بنگال میں درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ سبک دوشی کے بعد اردو زبان وادب کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ 'بارے شوکت کا کچھ بیاں ہو جائے' سے پہلے بھی آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جنھیں ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب محمد عمر شوکت تھانوی (1904-1963) کی بعض تحریروں اور ان کی شخصیت پر لکھے گئے اہل قلم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں بقلم خود کے عنوان سے 12 صفحات پر مشتمل مشتاق اعظمی کا مقدمہ ہے، جس میں اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے طنز ومزاح کی ادبی روایت میں شوکت تھانوی کے مقام ومرتبے پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شوکت تھانوی کی کتاب 'قاعدہ بے قاعدہ' شامل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں نقوش کے مدیر محمد طفیل لکھتے ہیں:

"اپنے تمام تغیر وتبدل کے باوجود اس قاعدہ کی ہمہ گیری اور افادیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ یہ قاعدہ پختہ عمر کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے شعور بالغ ہوگا۔"

اس قاعدہ بے قاعدہ میں شوکت تھانوی نے حروف تہجی کے ہر حرف کے مقابل اپنے زمانے کے مشہور ومعروف شعرا اور ادبا کے نقوش کو اختصار و ایجاز کے ساتھ ظریفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ تاکہ قارئین ابتدا ہی میں اپنے محبوب اور پسندیدہ ادبا سے متعارف ہو سکیں۔ جیسے (الف) امتیاز علی تاج (بے) بشیر احمد میاں (پے) پطرس بخاری۔ اس طرح ہر حرف سے ایک شاعر یا ادیب کے خاکے کو ظریفانہ انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

دوسرا حصہ 'متفرقات' کے نام سے ہے۔ جس میں شوکت تھانوی کے چھ مضامین شامل ہیں: جگر مرادآبادی، نقوش کے نقاش، پنڈت مدن موہن مالوی، تعزیت، بے، بخیال خویش خبطے۔

پہلا مضمون جگر مرادآبادی ہے۔ اس میں سب سے پہلے جگر کے حلیے کا نقشہ اپنے ظریفانہ انداز میں کھینچا ہے۔ اس کے بعد جگر کے ساتھ اپنی مصاحبت اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے ایام کا ذکر بڑے ہی دلکش انداز میں کیا ہے، جس سے جگر کی نفسیات اور اخلاق وعادات کی خفیف سی لکیریں صفحات پر نمایاں ہوتی ہیں۔ دوسرا مضمون نقوش کے نقاش (طفیل) ہے۔ اس مضمون میں نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل کی ایک کتاب 'صاحب' کو موضوع بحث بنایا ہے۔ 'صاحب' میں کل سات مضامین سات شخصیتوں کے احوال پر مشتمل ہیں۔ شوکت تھانوی نے اس کتاب میں شامل اپنے نام کے مضمون 'شوکت تھانوی' پر محمد طفیل کی تحریروں کا بڑے ہی طنزیہ انداز میں جائزہ پیش کیا ہے۔ تیسرا مضمون پنڈت مدن موہن مالوی ہے۔ اس مضمون میں پنڈت جی کے نظریات اور ان کی سرگرمیوں کو طنز ومزاح کے پیرایے میں پیش کیا ہے۔

چوتھا مضمون تعزیت ہے۔ شوکت تھانوی نے ہنستے ہنساتے درجنوں الفاظ اور اشعار تعزیت سے متعلق جمع کر دیے ہیں۔ اور ایک سنجیدہ موضوع پر اپنے قلم کا جوہر اس طرح دکھایا ہے کہ اس مضمون کی قرأت کے وقت قاری کے زیر لب مسکراہٹیں دوڑنے لگتی ہیں۔ اس کتاب میں شامل پانچواں مضمون حرف 'بے' ہے۔ شوکت تھانوی نے اس مضمون میں حرف بے سے متعلق اپنی جولانی طبع دکھائی ہے۔ حرف بے سے شروع ہونے والے بے شمار الفاظ کو اپنی بذلہ سنجی کا پیکر عطا کیا ہے، جس سے شوکت تھانوی کی قوت متخیلہ کی بلند پروازی اور لفظیات پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شوکت تھانوی کا اس کتاب میں شامل چھٹا اور آخری مضمون بخیال خویش خبطے ہے۔

اس کتاب کے تیسرے حصے میں شوکت تھانوی کی خودنوشت 'کچھ یادیں کچھ باتیں' شامل ہے۔ اس میں شوکت تھانوی نے اپنی زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، جن

سے ان کی ادبی زندگی کے نقوش نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کو پروان چڑھانے میں جن ادیبوں اور شاعروں کا حصہ رہا ہے، ان کے خاکے بھی پیش کردیے ہیں۔

چوتھا حصہ 'یادِ شوکت' کے نام سے معنون ہے۔ جس میں ان ادیبوں کے مضامین شامل ہیں جنھوں نے شوکت تھانوی کے انتقال کے وقت ان کی شخصیت اور ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ اس میں ایک مضمون 'میری سرگذشت' شوکت تھانوی کی ریڈیو تقریر بھی شامل ہے، جسے شوکت تھانوی نے 10 منٹ میں بیان کیا تھا۔ یہ صحرا کو ذرے میں سمیٹنے اور سمندر کو قطرے میں سمونے کی مثال ہے۔ بقیہ مضامین شوکت تھانوی کے انتقال پر ان کے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کی جانب سے خراج عقیدت ہیں۔ مضمون نگاروں میں ان کی بہن خاتون ارشد اور بیٹے رشید عمر تھانوی کا نام بھی شامل ہے۔ ان مضامین سے شوکت تھانوی کی گھریلو اور نجی زندگی کے ساتھ ان کی بذلہ سنجی، لطافت بیان، ظرافت سے بھرپور تحریریں، بلا کی ذہانت، جولانئ طبع اور آورد و تکلف سے پاک صاف تحریروں کی عکاسی ہوتی ہے۔

الغرض یہ کتاب 'بارے شوکت کا کچھ بیان ہوجائے' شوکت شناسی کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ مشتاق اعظمی نے اس کتاب میں شوکت تھانوی کی ان اہم تحریروں کا انتخاب کیا ہے، جن سے شوکت تھانوی کے احوال و آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

مضامین جذبی

مرتب: ظفرالاسلام

صفحات: 128، سنہ اشاعت: 2022

مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی

مبصر: محمد اعظم، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

مضامین جذبی کے علاوہ ڈاکٹر ظفرالاسلام کی دو اور کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ پہلی کتاب 'ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' 2019 جو دراصل ان کے ایم۔فل کا مقالہ ہے۔ مصنف نے بڑے سلیقے اور دیانتداری سے شکیل اعظمی کے حالات زندگی اور شاعری پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے رسالہ 'نئی کتاب' کا اشاریہ بھی تیار کیا ہے جو مکتبہ جامعہ کے سابق جنرل منیجر شاہد علی خاں کی ادارت میں نکلتا تھا۔ کتاب اگست 2022 میں منظر عام پر آچکی ہے۔

'مضامین جذبی' میں ڈاکٹر ظفرالاسلام نے معین احسن جذبی کے مضامین کو یکجا کیا ہے جو ان کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ اس سے قبل یہ مضامین یکجا نہیں تھے، بلکہ اردو کے عام قارئین تو اس بات سے لاعلم تھے کہ جذبی اتنے بہترین مضمون نگار بھی تھے۔ کتاب میں شامل مضامین مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہیں، زیادہ تر مضامین شخصی نوعیت کے ہیں۔ جن کے مطالعے سے یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ جو مضامین جذبی نے لکھے ہیں وہ جدید اردو ادب کے فروغ اور تحریک میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

زیر نظر کتاب میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں۔ آخر میں جذبی کی تین کم یاب نظموں کو بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے: دعوت جنگ، وبائے تحقیق، سرشام۔ مرتب کا یہ دعویٰ ہے کہ مذکورہ نظمیں جذبی کے کسی مجموعہ یا کلیات میں شامل نہیں ہیں پی، ایچ، ڈی کی تحقیق کے دوران انھیں دستیاب ہوئیں۔ قارئین کے استفادے کی خاطر شامل کتاب کردی گئی ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ پروفیسر نسیم احمد (سابق استاد شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) نے تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد مرتب کا سیر حاصل مقدمہ شامل ہے۔ مقدمہ کی جامعیت سے مرتب کے وسیع مطالعہ اور زور قلم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون 'چند باتیں' کے عنوان سے ہے جو دراصل 'فروزاں' طبع دوم 1951 کا دیباچہ ہے۔ اس مضمون میں ترقی پسند نظریہ اور ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات سے جو عجیب الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں ان پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسرا مضمون 'جگر مرادآبادی' کے تعلق سے ہے جنھیں ہم غزل کا نقیب بھی کہتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت جگر کی زندگی کے وہ چند پہلو جن سے ان کی ادب میں شناخت ہے، یعنی شاعری، رند و مستی، ترنم کی سحرکاری وغیرہ۔ بقول معین احسن جذبی:

''جگر کی زندگی کا ایک حصہ جام و مینا سے کھیلتے گزرا، وہ سرور، نشہ، سرشاری، بدمستی کی کیفیت سے ایک عرصہ تک لذت اندوز ہوتے رہے ہیں، جہاں وہ اس قسم کے تجربات بیان کرتے ہیں تو اشعار میں بلا کی بے ساختگی اور روانی پیدا ہوجاتی ہے۔''

پوچھنا کیا، کتنی وسعت دل کے پیمانے میں ہے
سب الٹ دے ساقیا جتنی بھی میخانے میں ہے
شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست
آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

کتاب کا تیسرا مضمون 'فانی بدایونی' کی شخصیت پر ہے جس کے مطالعے سے یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ فانی زندگی سے کس قدر بیزار ہیں اور یہی بیزاری دھیرے دھیرے ان کی زندگی کا فلسفہ بن جاتی ہے۔ غم ہائے روزگار سے تو مفر نہیں کیوں کہ یہ زندگی کا اہم حصہ ہے۔ مگر فانی اس کو عارضی مان کر اس میں 'غم جاوداں' تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

کتاب کا چوتھا مضمون 'ترقی پسند ادب' کے موضوع پر ہے۔ دراصل یہ مضمون مذکورہ کتاب کی جان ہے اور جذبی کا سب سے بہترین اور طویل مضمون بھی ہے۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جو ادب اور ادیب کو ہزار شبہات میں مبتلا کردیتی ہے۔ ایک ادیب نئے ادب کو پرانے ادب سے چاہے جتنا بھی الگ کرنا چاہے لیکن وہ علیحدہ نہیں کرپاتا۔ اس بات کو ہم مضمون میں شامل کئی ذیلی عنوانات سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ 'قدیم ادب کا سماجی پس منظر، انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک، داخلی اور خارجی ادب، ادب اور جدید رجحانات، انفرادی اور اجتماعی ادب، حقیقت نگاری اور انقلابی ادب' مضمون کے مطالعے کے بعد ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا پرتو کھل کر قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔

پانچواں مضمون ایک سوانحی تحریر ہے، جس میں خود جذبی نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز اور ادبی پہلوؤں پر حتی الامکان روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ 'مجاز کی زندگی کا ایک ورق' یہ مذکورہ کتاب کا چھٹا مضمون ہے، جو جذبی و مجاز کی دوستی اور بے تکلفی کو بیان کرتا ہے۔ مضمون میں مجاز کی مختلف خوبیوں کا بھی تذکرہ ہے۔

ساتواں مضمون 'پروفیسر رشید احمد صدیقی' دراصل ایک شاگرد کا اپنے استاد کو خراج عقیدت ہے۔ یہ بہت ہی جامع اور سبق آموز تحریر ہے۔ اس کے مطالعے سے استاد اور شاگرد کے درمیان کی محبت و اختلافات کے راز افشا ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم مضمون کو پڑھتے جاتے ہیں ہم اس کے سحر میں کھوتے چلے جاتے ہیں۔ آخر میں مضمون قاری پر بالکل جذباتی تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ مضمون رشید صاحب کے انتقال کے برسوں بعد تحریر کیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی ایک مایہ ناز استاد تھے انھوں نے بڑے ہی منطقی نظریے کے تحت اپنے طالب علموں کی تربیت کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے شاگرد دن بدن سنورتے اور نکھرتے چلے گئے۔

اس کتاب کا آخری مضمون 'مجروح میری نظر میں' ہے۔ جذبی کے اپنے جن

معاصر ادبا اور شعرا سے قریبی مراسم تھے اور بے تکلفی تھی ان میں مجروح بہت ہی خاص ہیں۔ مذکورہ مضمون میں مجروح کا علی گڑھ آنا اور رشید احمد صدیقی کی صحبت اختیار کرنا پھر کیسے وہ اپنے آپ کو فلمی جگت میں بلند مقام پر لے گئے، ان سب باتوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔

معین احسن جذبی کی تحریروں میں سادگی، سلاست اور بلا کی روانی ہے وہ منطقی اور فلسفیانہ باتوں کی گتھیوں میں نہ الجھتے ہیں اور نہ ہی قاری کو الجھاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قارئین مفہوم و مقصود کی منزل تک بآسانی پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے تو اہم ہے ہی، اشاعتی حسن و سلیقہ مندی سے بھی مکمل طور پر آراستہ ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام کی مرتب کردہ اس کتاب کو خوب پزیرائی حاصل ہوگی۔

مکالمہ

ایک فکشن نگار کا سفر

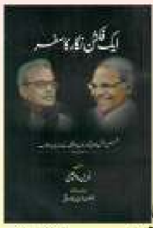

مرتب: ادین واجپئی، ہندی سے ترجمہ: رضوان الدین فاروقی

صفحات: 136 سنہ اشاعت: اپریل 2023

ناشر: اثبات پبلی کیشنز،

تحریر: جاوید رسول، سرسید گیٹ، کشمیر یونیورسٹی۔ 190006 (جموں

تخلیقی عمل سے متعلق کل تک میں یہی سمجھتا تھا کہ اس کا تعلق صرف شعر گوئی، افسانہ یا ناول نگاری سے ہے۔ لیکن میں غلط تھا اور یہ بھول رہا تھا کہ شعوری طور پر انسانی زندگی میں بننے (Becoming) کا ہر لمحہ اسی تخلیقی عمل سے تشکیل پاتا ہے۔ ظاہر ہے ہر انسان شعوری طور پر اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی نیا رنگ بھرنے کی جستجو ضرور کرتا ہے۔ غور کیجیے تو یہ جستجو اصل میں ہستی کے انجماد کو توڑنے اور کوئی نیا آتش پیدا کرنے کی جستجو ہوتی ہے۔ فاروقی صاحب کے مکالمے پڑھیے تو احساس ہوگا کہ وہ ہمیشہ اپنے وجود کے اندر اور باہر کے انجماد کو توڑنے کی جستجو میں تھے۔ لیکن کس نے سمجھا اور کون سمجھتا ہے؟ ہم اردو والوں نے کب چیزوں کو بغیر تعصب کے دیکھا؟ کب منفی نتائج اخذ کرنے کے ساتھ ساتھ مثبت پہلوؤں پر بھی غور کیا؟ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت نے 'روایت سے انحراف' کا جب خط امتیاز کھینچا تو فاروقی صاحب کو نرگسیت پسند اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا۔ حالانکہ انحراف سے ان کا مطلب تنسیخ ہرگز نہیں تھا، ان کی تحریریں گواہ ہیں کہ مفاہیم میں ایلیٹ سے مختلف ہی سہی مگر وہ عصری حسیت کے لیے شعور ماضی کو اہم ضرور سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "پرانے کو نیا نکارتا نہیں ہے، نیا پرانے پر تبصرہ کرتا ہے" (ص 70)

بہر کیف! فاروقی صاحب کی زندگی کا ارتقائی سفر کچھ اسی قسم کی کٹھنائیوں کا سامنا کرتے ہوئے گزرا تھا اور آج یقیناً ان کا نام ہمارے لیے جدیدیت کا ایک مستند اور معتبر حوالہ بن چکا ہے۔

'ایک فکشن نگار کا سفر' فاروقی صاحب کی شخصیت کے جس پہلو کو نمایاں کرتی ہے اس پر ابھی تک سب سے کم توجہ صرف کی گئی ہے۔ یہ ادین واجپئی جی کا حسن ظن ہے کہ انھوں نے مرکزی موضوع کے لیے بیانیہ کو چنا، ورنہ وہ چاہتے تو فاروقی صاحب کی شعری تنقید یا فقط شب خون اور جدیدیت کے منظر نامے پر بھی اچھا خاصا مکالمہ کر سکتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے ان پہلوؤں کو چھیڑا نہ ہو بلکہ مجھے اس پورے مکالمے کی ترتیب میں واجپئی صاحب کے تخلیقی شعور کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ جس طرح انھوں نے اصل پہلو تک رسائی کے لیے ان ہی ضمنی پہلوؤں سے ایک اساس قائم کی ہے اس سے نہ صرف مرکزی موضوع کے لیے ماحول بنا بلکہ اس کتاب میں ایک واقعاتی تسلسل بھی پیدا ہوا جو قاری کو اول سے آخر تک جوڑے رکھتا ہے۔ ایسے میں قاری کو فاروقی صاحب کے مزاج اور ان کی ادبی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ وہ مطالعہ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ "شیکسپیئر کو پڑھنے سے ایک بات میری سمجھ میں آگئی کہ اس طرح کا مصنف نہ ترقی پسندی میں جائے گا نہ ملّوں میں، میں اسی کے ساتھ ہوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی کھوج تھی" (ص 31)۔ ممکن ہے کہ اس جملے سے کئی لوگ فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ گویا فاروقی صاحب ترقی پسندوں اور ملّوں کو ناپسند کرتے تھے اس لیے ایسا کہا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فاروقی صاحب تخلیق کار کی آزادی کے قائل تھے جو ان کے مطابق کسی گروہ میں ملنا ممکن نہیں۔ خیر، کچھ اسی قسم کی غلط تعبیریں ان کے کئی جملوں سے نکال کر لوگوں کو گمراہ کیا جاتا رہا۔ مثلاً ایک جگہ وہ آڈن کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں "کوئی نسل تب تک قابل اعتماد نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے سے پہلی والی نسل کو پوری طرح چیلنج نہ کرے بلکہ ایک حد تک اسے خارج نہ کردے" (ص 63)۔ چونکہ اس پورے جملے میں زور "اپنے سے پہلی والی نسل" پر ہے جو کہ صاف طور پر ترقی پسندوں کی طرف اشارہ ہے لیکن اسے اردو کی کل روایت سے جوڑا گیا اور ایک غلط مفروضہ یہ گھڑا گیا کہ فاروقی صاحب ماضی (یعنی کل روایت) کو خارج کرتے ہیں۔

اب یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر فاروقی صاحب کا نظریۂ ادب اور ادیب کیا تھا؟ فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ "ساری محبت تو مجھے ساخت (فارم) سے تھی" (ص 58) یہاں میں ذرا سا اٹک جاتا ہوں کہ رضوان الدین فاروقی نے فارم کے لیے 'ساخت' کا لفظ استعمال کیوں کیا جبکہ 'ہیئت' اس کے لیے ایک مستعمل اور مناسب لفظ ہے۔ خیر! یہ بعد میں بھی دیکھا جا سکتا ہے فی الحال ہماری سمجھ میں یہ تو آجاتا ہے کہ فاروقی صاحب 'ہیئت پسند' نقاد تھے اور انھیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ فن پارے میں کوئی پیغام ہے بھی کہ نہیں۔ ظاہر ہے ان سب چیزوں سے پرے وہ فن میں کرافٹ کو بنیادی طور پر اہم جانتے تھے۔ اب اس سے یہ اخذ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی کہ وہ مواد کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیتے تھے جبکہ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ بُنت ایک تشکیلی عمل ہے اور مواد اس عمل میں کچھ نہ سہی لیکن ایک جز کی اہمیت تو رکھتا ہے اور پھر اس جزوی انسلاک پر ساری توجہ صرف نہ کی جائے تو بھی اسے نظر انداز ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا، آگے چلیے تو فاروقی صاحب جدیدیت والوں کا نظریۂ ادیب واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے کچھ رہنما اصول یہ ہیں:

1 ادیب کو ہمیشہ اپنے دل کی بات کہنے کی آزادی ملنی چاہیے۔

2 اسے کسی سیاسی پروگرام کا ماتحت نہیں ہونا چاہیے۔

3 اسے تجربے کی آزادی ملنی چاہیے۔

4 ادیب پر غیر ادبی ذمے داری نہیں ہونی چاہیے۔

یہ وہ رہنما اصول تھے جن سے ادب کا ترقی پسند ماڈل توڑ جدیدیت کا نیا ماڈل تیار کیا گیا۔

کتاب کے مرکزی موضوع پر بات کرنے سے پہلے میں چند حوالوں کے ذریعے فاروقی صاحب کی اس ادبی دوئی کو بھی سامنے لانا چاہوں گا جس سے میں بہت رنجیدہ ہوا... آپ تو جانتے ہونگے کہ اردو ادب میں لکھنؤ اور دلی اسکول پہلے سے ہی موضوع بحث رہ چکے ہیں۔ کچھ لوگ انھیں ایک دوسرے سے مختلف مانتے ہیں اور کچھ نہیں مانتے بلکہ علی جواد زیدی نے تو اپنی کتاب 'دو ادبی اسکول' میں اس تقسیم کو سرے سے ہی نکارتے ہوئے اسے ایک ادبی مفروضہ قرار دیا ہے۔ فاروقی صاحب کا بھی موقف یہی رہا ہے، ان کے مطابق "اس مفروضے کی پیدائش 1926 کی ہے۔ ایک مولانا تھے، بڑے قابل

تھے شبلی کے شاگرد تھے، ان کا نام تھا عبدالسلام ندوی۔ شعرالعجم کے نام پر انھوں نے بھی ایک کتاب 'شعرالہند' لکھی۔ اسی کتاب کی دوسری جلد میں انھوں نے ایک باب لکھا: اردو شاعری کے دو اسکول؛ دلی اور لکھنؤ۔ دلی اور لکھنؤ کی بات لے دے کر یہیں سے شروع ہوئی'' (ص 86)۔ اب ذرا دیکھیے کہ جدیدیت کے آغاز سے متعلق فاروقی صاحب کیا کہتے ہیں:

''ہم نے ایک من گھڑت تاریخ 1960 کی رکھی تھی، جہاں ہم نے کہا کہ اس سے پہلے 15 سال تک ترقی پسندی کا بہت چلن تھا، 60 تک آتے آتے یہ کم ہونے لگا تھا اور تب کچھ نوجوان ادیب سامنے آئے۔ اس طرح ہماری نسل 1960 کی ہے'' (ص 69)

اب دوئی دیکھیے کہ ایک طرف فاروقی صاحب لکھنو اور دلی اسکول والے مفروضے کو رد کرتے ہیں تو دوسری جانب خود ایک مفروضہ گھڑ لیتے ہیں۔ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ ایسا کرنا ان کے لیے آسان رہا ہوگا لیکن نئی نسل کے لیے بالخصوص محققین کے لیے تو انھوں نے ایک نئی مشکل پیدا کر دی۔ پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ پروفیسر حضرات جو آج بھی ساٹھ کی دہائی کو ہی جدیدیت کا نقطۂ آغاز بتاتے ہیں کیسے اپنی سوچ بدلیں؟

بہر حال! کتاب کے مرکزی موضوع کے حوالے سے میرے خیال میں ابھی تک کئی لوگ لکھ چکے ہیں اور اچھا لکھ چکے ہیں۔ مجھے جو بات اس ساری بحث سے سمجھ آئی وہ یہ کہ ناول نگاری شاعری سے بالکل مختلف اور زیادہ پیچیدہ فن ہے۔ جس طرح فاروقی صاحب نے وزیر خانم اور بالخصوص داغ سے متعلق کئی پرانے غلط خیالات کو درست کرنے کی غرض سے باضابطہ تحقیق کی اور ایک ایسا شجرۂ نسب تیار کیا جس سے وہ سب صلاحیتیں منطقی لگیں جو داغ اور وزیر خانم میں موجود تھیں، وہ اپنے آپ میں اس بات کی دلیل ہے کہ ناول نگاری فن کے علاوہ بلکہ اس سے پہلے ایک تحقیقی عمل بھی ہے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے یہی تو سبق ہے کہ انھوں نے اٹھارویں صدی کی شعری لسانیات کا مطالعہ اس لیے کیا تا کہ وہ اپنے ناول کے تمام اجزا میں وہ ربط قائم کر سکیں جو قاری کو اسی صدی کی فضا کا احساس دلائے۔ یہ نہیں کہ بات غالب کا کوئی شاگرد کر رہا ہو اور زبان بیسویں صدی کی ہو۔ ایسا آج بھی ہمارے کچھ ناولوں اور افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ کردار کشمیری ہوتا ہے لیکن مکالمے وہ لکھنوی زبان میں ادا کرتا ہے۔ اسی طرح بعض ناولوں میں ایک اور فنی سقم ثقافتی تضاد کی صورت میں در آیا ہے۔ مثلاً کشمیر کا ذکر ہو رہا ہے اور کلچر ممبئی کا دکھایا جاتا ہے...

یہ کچھ باتیں تھیں جو میں نے اس کتاب کے حوالے سے لکھنا ضروری سمجھا۔ زبان کی چند ایک غلطیوں اور ٹائپوز سے پرے اس کتاب کی زبان سادہ اور شستہ ہے۔

شاعری

سلسلۂ وہم و گماں

مصنف: قمبر علی

صفحات: 278، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ، بہار

مبصر: فردالحسن فرد، ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، سبزی باغ، پٹنہ

قمبر علی کا شعری مجموعہ 'سلسلۂ وہم و گماں' 2022 کے آخری دنوں میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی ہے اس کے بعد کل 138 غزلیں' 13 نظمیں اور کل 54 دوہے شامل ہیں۔

قمبر علی کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا ایک مجموعہ 'کیکر کے سایے' 2010 میں شائع ہوا ہے۔ 'سلسلۂ وہم و گماں' کے آخری صفحے پر ان کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ہے جس سے ان کی سرگرمی کا اندازہ لگتا ہے۔

یوں تو ان کا ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ ایک افسانوں کا مجموعہ اور ایک انشائیے کا مجموعہ بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ لیکن قمبر علی بنیادی طور پر غزل کہتے رہے ہیں جس میں سماجی' سیاسی' اقتصادی عنوانات کا حسن و خوبی سے احاطہ کیا ہے۔ شعری نہج کا اندازہ ان کے اشعار کی قرأت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اشعار سب کے سب ہر قاری کو پسند آئیں یا نہ آئیں کچھ اشعار تو ایسے ہیں جن کو ہر بندۂ بشر جو شعری ذوق رکھتا ہے اپنے دل کے دروازے پر دستک کے طور پر محسوس کرتا ہے اور یہ اشعار اس کے دماغ کو غور و فکر کی طرف راغب کرتے ہیں۔ نئے پیکر' نئی تصویریں نئے الفاظ اور چند ایسے الفاظ جو متروک کی حد تک درکنار کر دیے گئے ہیں ان کا بحسن و خوبی اظہار بھی قاری کی دلچسپی کا باعث ہے۔

شعری مجموعے آج تو روز شائع ہو رہے ہیں، اچھے اشعار بھی سامنے آ رہے ہیں جن کے جمالیاتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی عنوانات ہماری آسودگی کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ 'سلسلۂ وہم و گماں' میں بھی ہمیں سیاسی، سماجی، اقتصادی نشیب و فراز اور ان کی تصویر کشی سے جمالیاتی آسودگی ملتی ہے۔ یہ آسودگی کس قدر ملتی ہے اس کا اندازہ لگانے سے بہتر ہے کہ ہم اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ تبصرے سے کسی کتاب کا عکس تو دکھائی دے سکتا ہے لیکن کتاب کے مشمولات کے تاثرات، اس سے وابستہ حظ اس کی جزئیات میں اترنے بعد ہی کھلتے ہیں۔ اس کے لیے کتاب کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

اک بھرے گھر میں شب صحرا کا سناٹا ملا   جوتیاں بجتی رہیں میری ہوئیں سرگوشیاں
پھر ہم سے وہ کہیں بھی دوبارہ نہیں ملا   آئینہ اس کے سامنے ہم نے جو کر دیا

○

اب جلتی دوپہر میں طنابوں کے سایے ہیں   کوتاہ دست رہ گئے خیموں کی لوٹ میں
ہم نہ کچھ بولیں گے بستی کا دھواں بولے گا   بستیاں چھوڑ کے جاتے ہوئے لوگوں نے کہا
کیوں میں رسوا سا خود کو پاتا ہوں   میں جو بازار سے گذرنے لگوں

ان کی شاعری سے لطف لینے کے لیے ان کے ایسے اشعار پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہے جہاں اپنے سلسلے میں انھوں نے کہا ہے۔

مرے خیال کے ہر زاویے کو دیکھا کر   مری ردیف مرے قافیے کو دیکھا کر
کتاب دل پہ لکھے حاشیے کو دیکھا کر   حصار متن سے باہر کوئی کلید ملے
مرے ضمیر مرے تذکیے کو دیکھا کر   زبان ہی ہے کسی دم پھسل بھی سکتی ہے

یہاں ایک نظم بھی درج کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا۔

پیپر ویٹ کی تتلی

باہر شور بہت تھا شام گئے تک / پیپر ویٹ کے پھولوں پر / پچھلی رات کو تتلی نے / اپنے بوسے ثبت کیے اور / چلتے پنکھے سے ٹکرا کر / ریزہ ریزہ بکھر گئی /

باہر شور بہت تھا شام گئے تک / میں بھی باہر نکل نہ پایا / بستر سے بھی اتر نہ پایا / ریزہ ریزہ تتلی کے پر / پاؤں رکھو تو دکھ ہوگا / ریزہ ریزہ تتلی کو /

چن چن کر میں کہاں رکھوں / گھر میں ایسی جگہ نہیں ہے / پیپر ویٹ کو گھر سے باہر / کرکٹ کی کوئی گیند سمجھ کر گلی پھینکوں / بچپن کی اس تتلی کو بھی /

تزک حیات کے صفحوں میں / کتنا جھانک کے دیکھیں / اب تو اتنا وقت نہیں ہے / یادوں کی پنگھٹ پر بیٹھا / پاؤں پساروں / آتی جاتی لہروں کا /

رخ بدلوں / اب تو اتنا وقت نہیں ہے / پیپر ویٹ کے پھول اور تتلی / ریزہ ریزہ اس

کا بدن/ ترک حیات کے پھڑ پھڑ صفحے/

سیل رواں سے وقت کے دھارے/ کیسے کیسے بھلائیں

آخر میں بس یہ کہنا ہے کہ شعری مجموعہ 'سلسلۂ وہم وگماں' جس کسی کو جہاں مل جائے وہ پڑھ کر اپنی رائے قائم کرے اور لذت ذہن ودل سے محظوظ ہو۔

رسائل و جرائد

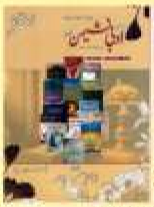

ادبی نشیمن (رباعی نمبر)

مدیر: ڈاکٹر سلیم احمد، معاون مدیر: شاہد حبیب

صفحات: 248، قیمت: 200 روپے سنہ اشاعت: جون تا نومبر 2023

ناشر: ادبی نشیمن، 544-C/168، الماس باغ، ہردوئی روڈ لکھنؤ۔ 226003

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، نئی دہلی

ادبی رسائل کی بھیڑ میں سہ ماہی 'ادبی نشیمن' نے بہت جلد اپنا اعتبار قائم کیا ہے۔ مشمولات کی بنیاد پر اس کی ایک واضح پہچان بھی بن چکی ہے۔ اہم ادبی مباحث اور موضوعات پر تحریروں کی شمولیت کی وجہ سے ادبی نشیمن کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ادبی رسائل میں خصوصی شماروں کی اشاعت کی ایک قدیم روایت رہی ہے۔ ادبی نشیمن نے بھی اسی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے کئی خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ اس ذیل میں رباعی نمبر ایک تازہ ترین پیشکش ہے جس میں ایک ایسی صنف کے آغاز وارتقا اور اس کے جملہ فنی اور فکری زاویوں سے متعلق نگارشات شامل کی گئی ہیں جس پر اردو میں تنقیدی اور تحقیقی سرمایہ قدرے کم ہے۔ اس مشکل ترین صنف کو بہت کم شاعروں نے قابل اعتنا سمجھا مگر ابتدا سے ہی اس صنف سے کچھ ایسی شخصیات جڑی رہی ہیں جن کی وجہ سے اس کی اہمیت اور معنویت قائم رہی۔ گو کہ اس صنف کے مستقبل کے تعلق سے لوگوں کے ذہن میں بہت سے سوالات بھی ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے بھی اپنی کتاب 'اردو رباعیات' میں اس کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس صنف کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی رہی ہے۔ فارسی زبان میں بہت سے شاعروں کو رباعی کی وجہ سے شہرت اور شناخت ملی لیکن اردو میں بہت کم خالص رباعی گو شعرا ہیں جنھیں صرف اس صنف کی بنیاد پر قدر و منزلت ملی ہو۔ مگر یہ مسئلہ صرف رباعی کے ساتھ نہیں ہے۔ اردو میں اب بہت سی اصناف کا مستقبل معرض خطر میں ہے۔ نئے نئے تجربوں کی وجہ سے بہت سی اصناف کی Purity بھی مجروح ہو رہی ہے۔ غزل کی وجہ سے قصیدہ اور مثنوی جیسی توانا صنف کو بھی خسارہ اٹھانا پڑا۔ ان اصناف کے وجود کو خطرہ تو لاحق نہیں ہوا مگر ان کا دائرۂ اثر محدود سے محدود تر ہوتا گیا اور آج جب کہ یہ ٹکنالوجی کا عہد ہے تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ ٹکنالوجی کی وجہ سے بھی بہت سی صنفوں کا دائرہ سمٹتا اور سکڑتا جائے گا اور کچھ بعید از امکان نہیں کہ مستقبل میں ٹکنالوجی کی زبان میں ہی شعر و ادب کی تشکیل ہو اور بہت سی صنفوں کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے۔

'ادبی نشیمن' کے مدیران کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ نظر انداز کردہ صنف رباعی کی طرف توجہ مرکوز کی اور اس کے جملہ فنی و فکری تلازمات کے احاطے کی کوشش کی۔ یہ خصوصی شمارہ تین حصوں پر محیط ہے۔ پہلے حصے کا عنوان 'رباعی: فن و تاریخ' ہے جس میں رباعی، اس کے اوزان، آہنگ وارکان، ہیئت وقوافی اور اس کے آغاز وارتقا کے تعلق سے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اختر ریاض، حافظ کرناٹکی، اسلم حنیف، انس مسرور انصاری، محمد انور ضیا، راشدہ خاتون، سفیان احمد انصاری، احتشام افسر نے رباعی کے فن، روایت اور امکانات کے بیشتر زاویوں کا احاطہ کیا ہے۔ حصہ دوم 'رباعی: تنقید و تحقیق' پر محیط ہے جس میں اردو کے رباعی گو شعرا کو تنقیدی میزان پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص طور پر ان شعرا پر مضامین شامل کیے گئے ہیں جن کی بہ حیثیت رباعی گو ایک امتیازی اور انفرادی شناخت ہے اور ان کے کلیات بھی شائع ہو چکے ہیں یا جنھوں نے دیگر اصناف کے ساتھ رباعی کی صنف میں بھی اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس تعلق سے انیس، جگت لال رواں، عبدالغفور خاں نساخ، خواجہ الطاف حسین حالی، جوش ملیح آبادی، سوامی شیاما نند سرسوتی روشن، شوق نیموی، یاس یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، پرویز شاہدی، اجتبیٰ رضوی، ناوک حمزہ پوری، فضا ابن فیضی، شاہ حسین نہری، صادقین، فرید پربتی، شاہین رضا زیدی، ظہور منصوری نگاہ، عابدہ شیخ، زیب النسا زیبی، ظرفہ قریشی، ظہیر غازی پوری، سید عابد علی وجدی الحسینی، رباب رشیدی، مامون ایمن، کوثر صدیقی، اشراق حمزہ پوری، ظفر کمالی، عاصم شاہنواز شبلی، نور محمد یاس، محبوب سیتھلی، عبدالحق امام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اور کچھ مضامین میں علاقائی اعتبار سے رباعی کے ماضی تا حال کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جن میں کرناٹک، میرٹھ، لکھنؤ وغیرہ شامل ہیں۔ اردو کے غیر مسلم رباعی گو شعرا پر بھی ایک مضمون شامل ہے جس میں کندن لال کندن کا بطور خاص ذکر ہے کہ انھوں نے فن رباعی میں خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ یہ حصہ یوں قابل قدر ہے کہ اس میں مشمولہ مضامین کی وجہ سے رباعی کا ارتقائی منظرنامہ سامنے آتا ہے۔ مگر یہاں بہت سارے ایسے شعرا پر مضامین کی ضرورت تھی جنھوں نے واقعی رباعی کی ثروت میں گراں قدر اضافے کیے ہیں خاص طور پر جنوبی ہند میں کچھ ایسے نام ہیں جن کی شناخت رباعی گو شاعر کی حیثیت سے ہے۔ ان پر بھی مضامین کی شمولیت ہوتی تو یہ شمارہ اور بھی وقیع ہو جاتا۔ اسی میں تخلیق رباعیات کے تحت مخمور کاکوروی، شاہ حسین نہری، عراق رضا زیدی، ظہور منصوری نگاہ، محمد اشرف کمال، اسلم حنیف، عاصم شاہنواز شبلی، سلیم سرفراز، محمد انور ضیا، فرحت نادر رضوی، اعجاز مانپوری، فیضی سنبھل پوری، فہیم بسمل، ساجد عارفی خیرآبادی، ہارون رشید، معید رہبر، زیب النسا زیبی، مصباح انصاری، محسن عظیم انصاری کی رباعیات بھی شامل کی گئی ہیں۔

تیسرے حصے میں رباعیات کے کچھ مجموعوں پر تبصرے شائع کیے گئے ہیں۔ اسی باب میں مجموعہ رباعیات کا ایک اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے جسے تنویر اختر رومانی نے مرتب کیا ہے۔ اشاریے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس صنف سے بے اعتنائی کے باوجود رباعی کا ارتقائی سفر جاری وساری ہے۔ کاش اس باب میں رباعی پر لکھی گئی تنقیدی و تحقیقی کتابوں، صنف رباعی اور رباعی گو شعرا سے متعلق مختلف رسائل وجرائد میں شائع شدہ مضامین کی فہرست بھی شامل کر دی جاتی تو یہ اشاریہ اور وقیع ہو جاتا اور رباعی کے اسکالرس کو اس سے روشنی ملتی۔ اردو رباعی پر ڈاکٹر سلام سندیلوی (اردو رباعیات)، ڈاکٹر فرمان فتح پوری (اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقا)، ڈاکٹر عظیم الرحمٰن (رباعی: ایک عروضی مطالعہ)، امیر حمزہ (رباعی تحقیق) ان کے علاوہ کچھ اور افراد کی تنقیدی و تحقیقی کتابیں ہو سکتی ہیں مگر رباعی پر مزید تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔ ادبی نشیمن نے شاید اسی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔

رباعی تحقیق و تنقید کے باب میں ادبی نشیمن کا یہ شمارہ حوالہ جاتی اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ مدیران ڈاکٹر سلیم احمد اور شاہد حبیب کی شب و روز کی محنت اس خصوصی شمارے کی ترتیب و تشکیل میں شامل ہے۔ بہت عرصے کے بعد رباعی پر کسی رسالے کا اتنا مربوط، مبسوط اور وقیع شمارہ سامنے آیا ہے۔ گو کہ اس سے قبل گلبن (احمد آباد)، دستخط (کولکاتا) اور 'شاعر' (ممبئی) کے رباعی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ادبی نشیمن کا یہ شمارہ ان تینوں رسائل کے رباعی نمبر سے ذرا مختلف ہے۔

■

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویو زشائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذراسی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

'اردو فکشن میں تقسیم ہند کا بیانیہ' کے عنوان سے آن لائن مذاکرہ

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'اردو فکشن میں تقسیم ہند کا بیانیہ' کے عنوان سے آن لائن مذاکرے کا اہتمام کیا گیا، جس میں ملک کے اہم فکشن نگاروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔

مذاکرے کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے شرکائے مذاکرہ اور مہمانوں کا استقبال کیا اور موضوع کا تعارف کرواتے ہوئے تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی منافرت اور ادب اور فکشن میں اس کی عکاسی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ماضی میں ہمارے فکشن نگاروں اور تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج کی رہنمائی کی کوششیں کی تھیں، اسی طرح آج بھی ملک کے تخلیق کاروں اور دانشوروں کی ذمے داری ہے کہ وہ بہتر اور انصاف پرور سماج کی تشکیل کے سلسلے میں غور و خوض کریں اور اپنی تخلیق و تدبیر کے ذریعے اس حوالے سے مطلوبہ کردار ادا کریں۔ شیخ عقیل نے کہا کہ آج کا موضوع گرچہ بہت پرانا ہے، مگر بعض اعتبار سے اس کی اہمیت آج بھی مسلم ہے، اسی لیے ہم نے اس پر مذاکرے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج کے ہمارے مہمانوں میں ہندوستان کے نمایاں فکشن نگار اور فکشن کے ناقدین شامل ہیں، اس لیے مجھے امید ہے کہ ان حضرات کی گفتگو سے موضوع کو سمجھنے اور ہندوستان ہی نہیں، تمام برصغیر میں وسیع تر سماجی ہم آہنگی کے قیام میں ہمیں رہنمائی ملے گی۔

مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے پروفیسر خالد اشرف نے کہا کہ تقسیم ہند ایک سدا بہار موضوع ہے، جس پر ناول اور افسانے دونوں بڑی تعداد میں لکھے گئے ہیں۔ البتہ جو بڑے تخلیق کار ہوئے ہیں انھوں نے اس سانحے کو وسیع تر تناظر میں دیکھا اور اس کے تمام تر سماجی و سیاسی اسباب و عوامل کو پیش نظر رکھ کر اس موضوع کو برتا ہے، جبکہ چھوٹے تخلیق کاروں نے اپنے خاص مقصد و جذباتیت کے تحت کہانیاں لکھی ہیں۔

ناول نگار شبیر احمد نے کہا کہ یہ درست ہے کہ تقسیم ہند کے سانحے پر اردو میں بہت سے ناول اور افسانے لکھے گئے، مگر یہ سانحہ جتنا بڑا تھا اور اس کا دائرہ جتنا وسیع تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے تقسیم ہند کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے، اب بھی اس کے بعض گوشوں پر اچھا فکشن لکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح نئی نسل سابقہ تخلیقی نمونوں کو سامنے رکھ کر نئی راہ اختیار کرسکتی ہے اور پرانے موضوعات و مسائل کے ساتھ نئے مسائل کا بہتر تخلیقی اظہار کرسکتی ہے۔ سینئر تجزیہ نگار شمیم طارق نے کہا کہ یہ موضوع غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اگر عنوان اردو فکشن کا بیانیہ کے بجائے المیہ ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا کیوں کہ اردو فکشن میں تقسیم ہند کے واقعات المیہ کے طور پر ہی بیان کیے گئے ہیں، مثال کے طور پر بیدی کے افسانے لاجونتی میں انسانی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ معروف فکشن نگار پروفیسر غضنفر علی نے کہا کہ تقسیم ہند کے سانحے پر لکھے گئے فکشن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے اس کی مدد سے تقسیم ہند کی پوری تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔ ہمارے ناول نگاروں نے تقسیم کے اسباب و محرکات اور اثرات کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔ جہاں تک بیانیے کی بات ہے تو زیادہ تر اردو ناولوں کا بیانیہ مستحکم اور اچھا ہے، جبکہ کچھ ناولوں کا بیانیہ کمزور ہے۔ انھوں نے اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کیں۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم ہند کے سانحے کو جن لوگوں نے بذات خود جھیلا اور بعد میں اس پر لکھا تو اسے المیہ کے طور پر پیش کیا، جبکہ جو لوگ اس واقعے سے خود نہیں گزرے انھوں نے اسے محض ایک تاریخی واقعے کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہجرت کے پچاس سال بعد ان مہاجروں کی نفسیات کیا ہے، اس پر بھی ہمارے فکشن نگاروں کو توجہ دینا چاہیے۔ انھوں نے زور دیا کہ سماجی اعتبار سے تقسیم سے پہلے ہم جس طرح مشترکہ قدروں سے بندھے ہوئے تھے، خطے میں اس احساس کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں پروفیسر شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر کے ساتھ یہ مذاکرہ اختتام پذیر ہوا۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر زین شمسی نے انجام دیا۔ مذاکرے میں کونسل کے اسٹاف کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم و ادب نے فیس بک لائیو کے ذریعے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 اگست 2023

جموں و کشمیر میں قومی اردو کونسل کے 79 کمپیوٹر سینٹرز کے طلبہ و طالبات کے مابین جلسۂ تقسیم اسناد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنے کمپیوٹر ایپلی کیشنز بزنس اکاؤنٹنگ اور ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس کے ذریعے اردو طالب علموں کو روزگار اور جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے کا غیر معمولی کام جو کر رہی ہے، وہ قابل تحسین ہے اور اس سے ہزاروں طلبہ و طالبات فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر

نیلوفر خان نے قومی اردو کونسل اور کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے گاندھی بھون میں منعقدہ جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جموں و کشمیر میں قومی اردو کونسل کو اردو زبان، تعلیم و تہذیب کے فروغ کے لیے جو بھی تعاون درکار ہوگا، ہم اس کے لیے تیار ہیں اور ہر ممکن تعاون پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ جموں و کشمیر کونسل کی ترجیحات میں سرفہرست ہے۔ انھوں نے یہ بتاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا کہ CABA-MDTP کے جموں و کشمیر میں سب سے زیادہ مراکز ہیں، نیز یہاں کے نوجوان طلبا و طالبات کو روزگار سے جوڑنے کے لیے قومی اردو کونسل پیپر ماشی کا کورس بھی چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہم اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے یہاں کے ادبا و شعرا کی تخلیقات کو کثیر تعداد میں خرید کر یا ان کی اشاعت کے لیے مالی امداد فراہم کر کے تعاون پیش کر رہے ہیں۔ شیخ عقیل نے کہا کہ سرکار بھی چاہتی ہے کہ جموں و کشمیر میں تعلیم و ترقی کے زیادہ سے زیادہ اقدامات کیے جائیں اور نوجوانوں کو بے روزگاری اور بیکاری سے نکال کر انھیں روزگار فراہم کیا جائے تاکہ اس طرح ان کی ذاتی ترقی و خوشحالی کے ساتھ مجموعی طور پر ریاست بھی ترقیات سے ہم کنار ہو۔ شیخ عقیل نے وعدہ کیا کہ ہم آئندہ بھی جموں و کشمیر میں فروغ اردو کے علاوہ نوجوانوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے مختلف اقدامات کریں گے۔

اس موقعے پر پروفیسر عادل امین کاک نے بھی خطاب کیا اور کونسل کے ذریعے پروفیسر عقیل احمد کی قیادت میں اردو زبان و ادب کے لیے اٹھائے جا رہے مختلف اقدامات کی ستائش کی۔ کشمیر یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر نثار احمد میر نے بھی اظہار خیال کیا اور کہا کہ نیو ایجوکیشن پالیسی میں جس نقطے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، قومی اردو کونسل اس پر پہلے سے عمل پیرا ہے یعنی اردو آبادی کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کونسل جو اقدام کر رہی ہے وہ ثمر آور ثابت ہو رہا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اس جلسۂ تقسیم اسناد میں وادی کشمیر میں چل رہے 79 مراکز کے طلبا و اساتذہ نے شرکت کی جن کے درمیان معزز مہمانان کے ہاتھوں اسناد تقسیم کی گئیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 ستمبر 2023

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

حلقۂ تشنگانِ ادب کی 556ویں نشست بیاد کنور مہندر سنگھ بیدی

نئی دھلی: حلقۂ تشنگان ادب کی 556ویں شعری نشست بیاد کنور مہندر سنگھ بیدی سحر غالب اکیڈمی نظام الدین دہلی میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت ہریانہ کے کوی و شاعر ڈاکٹر کے کے رشی اور نظامت دھرم ویر دھیر سیماب سلطانپوری سکریٹری حلقہ نے کی۔ میزبانی ایل نارنگ ساقی سکریٹری کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ نے کی۔ نشست کا آغاز حلقہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ہوا۔ سیماب سلطانپوری نے اپنی ابتدائے گفتگو میں کہا کہ حلقہ کسی خاص زبان کی نمائندگی یا کسی خاص زبان کے لیے محدود نہیں ہے۔ کسی بھی زبان میں آپ شاعری کرتے ہیں تو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے آزاد ہیں، حلقہ محبت کی بات کرنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے، خواہ بات کسی بھی زبان میں کی جائے۔ اس موقعے پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے منتخب کلام پر مبنی آنجہانی کی تصویر سے مزین شعری مجموعہ بعنوان (جشن سحر) شرکا میں تقسیم کیا گیا جس کی اشاعت اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہندی زبان میں بھی کی گئی ہے۔ سیماب سلطانپوری نے کہا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بھی جیتے جی یہی کوشش کی کہ لوگ مل جل کر متحد ہو کر رہیں انسانیت کا بول بالا ہو۔ سکریٹری غالب اکیڈمی ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ سحر معروف شاعر کے ساتھ اردو زبان سے محبت کرنے والے بھی تھے، اور ایک ذمے دار اعلیٰ افسر بھی۔ اصول کے پابند ہونے کی باتیں آپ کے متعلق اکثر کی جاتی ہیں، وہیں دہلی میں اردو کے فروغ کی جو کوششیں آنجہانی سحر نے کیں انھیں بھی یاد رکھا جائے گا، بالخصوص اردو اکادمی دہلی کے قیام اور دیگر فروغ اردو کے ادبی اداروں سے آنجہانی مہندر سنگھ بیدی سحر کی وابستگی قابل ذکر ہے۔ کرشن لال نارنگ ساقی جیسا مخلص شخص سحر کو ان کی حیات میں ملا اور آپ کا ادبی سرمایہ محفوظ ہو سکا یہ بڑی بات ہے۔ نشست میں جن شعرا و شاعرات نے کلام سے محظوظ کیا ان میں کے کے رشی، حسن فتح پوری، سیماب سلطانپوری، حبیب سیفی، شاہد انور، درد دہلوی، اروند اثر، مجیب قاسمی، ہدایت بدایونی، نعیم بدایونی، عمران راہی، خرم نور نگینوری، سارا لیز اخان، آشیش سنہا قاصد، فرید قریشی، روی رشی، راجیو اپادھیائے کامل، عبدالرحمن منصور، کرشنا شرما دامنی، ہاشم دہلوی، راجیو کامل، عرفان اعظمی، پروین ویاس، عبدالحمید ساز دہلوی، سوپریہ وینا، احترام صدیقی، بھوپندر کمار، تابش خیرآبادی، پون کمار تومر، نثار احمد نثار، اجے کمار عکس، شاکر دہلوی، گرچرن مہتا رجت، نسیم بیگم، حشمت بھاردواج، بلال عابد کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اگست 2023

شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا 46واں ان ہاؤس سمینار

نئی دھلی: ریسرچ اسکالر فورم، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے زیر اہتمام پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں شعبہ کی ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی لائبریری میں چھیالیسویں ان ہاؤس سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں شعبہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالر فورم کے جنرل سکریٹری ساجد ایم نے صدر جلسہ، اساتذۂ کرام اور ریسرچ اسکالرز کا استقبال کیا۔ اس کے بعد شعبہ کی ریسرچ اسکالر صائمہ نظیر نے 'عربی اور انگریزی ادب میں فیمنسٹ ناول: اس کا مفہوم، ترقی اور اس کے اہم رائٹرس' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ریسرچ اسکالر نے اپنے مقالے میں عربی اور انگریزی ادب میں نسوانی تحریک و نظریات پر روشنی ڈالی نیز نسوانیت کی تحریک کی ابتدائی تاریخ، نشو و نما و ارتقا پر گفتگو کی۔ نسوانیت کے معنی و مفہوم اور عربی و انگریزی ادب میں اس کی اہمیت و کردار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے امریکی، یوروپی اور عربی ادب میں نسوانیت پر لکھنے والی متعدد خواتین ادبا کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ عربی و مغربی ادب کی ترقی میں اس تحریک کا اہم کردار ہے۔ انھوں نے تحریک نسواں کے حوالے سے عہد قدیم و عصر جدید میں رونما ہونے والی بعض تبدیلیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ مقالہ کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے مقالہ سے متعلق اہم سوالات بھی کیے جن کے جوابات مقالہ نگار نے مدلل انداز میں دیے۔ پروگرام کے آخر میں سمینار کے صدر پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے صدارتی خطاب کے آغاز میں ریسرچ اسکالر صائمہ نظیر کو ایک اچھا مقالہ پیش کرنے پر مبارکباد پیش کیا۔ سوالوں کے جوابات دینے کے انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مقالہ نگار قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے اپنے جوابات میں سوشل سائنس کی اصطلاحات کا بخوبی استعمال کیا۔ صدر مجلس نے ریسرچ اسکالر کو مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ پروگرام کے آخر میں ریسرچ اسکالر فورم کی ایڈوائزر ڈاکٹر ہیفا شاکری نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 12 اگست 2023

اترپردیش

اردو غزل کا ارتقا

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اردو غزل کا ارتقا کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاذ پروفیسر عباس رضا نیر نے اردو غزل کے تدریجی ارتقا پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے کہا کہ اردو غزل کے ارتقا کی روداد بہت دلچسپ اور حیران کن ہے۔ اس روداد میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس صنف کے تئیں ناقدین کے غیر متوازن رویے کے باوصف غزل کا ارتقائی سفر جاری رہا۔ انھوں نے کہا کہ غزل کے دو مصرعوں میں ایک جہان معنی آباد رہتا ہے جس سے آگہی اسی بالغ نظر کو ہو سکتی ہے جو غزل کی روایت اور اس روایت سے وابستہ اس تہذیب سے واقفیت رکھتا ہو جو غزل کے خد و خال

سنوارنے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ امیر خسرو اور دکن کے قدیم شعرا کا حوالہ دیتے ہوئے عباس رضا نیر نے کہا کہ اس اردو غزل نے ابتدا ہی سے شعر و ادب کے شائقین کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا اور یہ سلسلہ دہلی اور لکھنؤ سے ہوتے ہوئے جب عہد حاضر تک پہنچا تو اس صنف میں لفظی اور معنوی سطح پر اتنا تنوع پیدا ہو گیا کہ یہ صنف ہر عہد کے مسائل و معاملات کی ترجمانی کا مؤثر وسیلہ بن گئی۔ غزل کے عشقیہ آہنگ کو اس کی انفرادیت قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شاعری میں اصناف کی سطح پر جتنے بھی تجربات ہوئے ان سب تجربات کو آہنگ کی سطح پر وہ امتیاز حاصل نہ ہو سکا جو اردو غزل کا مقدر بنا اور زبان کی تراش خراش کے باوجود یہ امتیاز آج بھی اس صنف سے مخصوص ہے۔ غزل کے معاصر منظرنامے پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر نیر نے کہا کہ اردو کی نئی بستیوں امریکہ، کنیڈا اور برطانیہ میں اس صنف کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ غزل نے ان ممالک سے وابستہ مخصوص مسائل کو بھی برتنے کا ہنر سیکھ لیا ہے اور غزل کی اس ہنرمندی کا اظہار ہندو پاک کے ان شاعروں کے ذریعے بھی ہو رہا ہے جو الفاظ اور لہجے کی جدت سے اس صنف کے دامن کو مالا مال کر رہے ہیں۔ اس خصوصی لیکچر میں شعبۂ اردو کے طلبا کے علاوہ پروفیسر شفیق احمد اشرفی، پروفیسر ثوبان سعید، ڈاکٹر جمال رضوی، ڈاکٹر اکمل شاداب، ڈاکٹر اعظم انصاری، ڈاکٹر ظفر التقی، ڈاکٹر منور حسین اور ڈاکٹر سدھارتھ سدیپ نے شرکت کی اور اس پروگرام کو کامیاب بنایا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 اگست 2023

ظفر اقبال کی ادبی خدمات

فتح پور: عالمی شہرت یافتہ ہر دلعزیز افسانہ نگار، شاعر و ادیب، درویش صفت قلم کار ظفر اقبال ظفر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک شاندار ادبی محفل بہ عنوان جشن ظفر اقبال ظفر، سمینار و مشاعرہ کا دلہن میرج ہال میں انعقاد کیا گیا۔

'جشن ظفر اقبال ظفر' کا افتتاح فتح پور کی مایہ ناز شخصیت ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد ایڈوکیٹ (سابق صدر شعبۂ اردو، مہاتما گاندھی، ڈگری کالج، فتح پور) نے شمع روشن کر کے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطاب میں ظفر اقبال ظفر کی شاعری اور خاص کر نعتیہ شاعری پر سیر حاصل گفتگو بھی کی۔ بیرونی مہمانان کا سرپرست محمد معین الدین ایڈوکیٹ اور کنوینر محمد اقبال معین ایڈوکیٹ نے پرجوش استقبال کیا۔ پروگرام کے پہلے حصے سمینار میں حصہ لیتے ہوئے معزز مہمانان ڈاکٹر ارشاد سیانوی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، ڈاکٹر قاسم انصاری، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، ڈاکٹر قسیم الدین حقلہ، شعبہ اردو، کرائسٹ کالج، کانپور، ڈاکٹر ضیا تسنیم، شعبہ اردو، مہیلا ڈگری کالج، فتح پور، خلیل احسن نے وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ ظفر اقبال ظفر کے رفقا میں قمر صدیقی اور ڈاکٹر جمال احمد نے بھی موصوف کی حیات و خدمات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ سمینار کی صدارت پروقار شخصیت خلیل احسن نے اور نظامت ڈاکٹر ضیا تسنیم نے کی۔ پروگرام کے دوسرے دور میں مشاعرے کا افتتاح عالمی شہرت یافتہ ناظم و شاعر واصف فاروقی نے کیا۔ افتتاحی خطاب میں انھوں نے فتح پور اور ظفر اقبال ظفر سے اپنی والہانہ محبت اور یہاں کی ادبی فضا کا اپنے مخصوص انداز میں ذکر کیا اور اپنے کلام سے بھی سامعین و حاضرین کو محظوظ کیا۔ صدارت نامور شاعر حسن رائے بریلوی نے کی۔ معروف شاعرہ ترنم کانپوری کی نعت سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ ان کے علاوہ خلیل احسن، شکیل گیاوی لکھنؤ، سلیم تابش لکھنؤ، فاروق عادل لکھنؤ، رام بابو رستوگی رائے بریلی، شاہد جمال فیض آباد، ڈاکٹر محمد شاہد خاں فیض آباد، اشفاق برادر کانپور، ڈاکٹر اقبال احمد انصاری کانپور، انس اظہار الہ آباد، وقار کاشف لکھنوی نے اپنے اپنے بہترین کلام پیش کیے اور سامعین اور حاضرین سے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ ظفر اقبال ظفر کو سرپرست و کنوینر اور صدر نے شال اوڑھا کر اعزاز دیا اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایوارڈ سے سرفراز کیا اور ان کی خدمت میں سپاس نامہ بھی پیش کیا۔ موصوف کی حیات و خدمات پر مبنی بروشر کا اجرا بھی ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد کو ملا داؤد، ایوارڈ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو علامہ نیاز فتح پوری ایوارڈ، خلیل احسن کو زیب غوری ایوارڈ، واصف فاروقی کو مظفر حنفی ایوارڈ، نظامت فرما رہے نامور ناظم معروف رائے بریلوی کو عمر قریشی شان نظامت ایوارڈ، راشد حسین راہی کو نواب گوہر علی خاں ایوارڈ اور سبھی ادیبوں اور شاعروں کو توصیفی ادبی ایوارڈ اور شال پیش کیا گیا۔ آئے ہوئے تمام مہمانان کا محمد معین الدین ایڈووکیٹ نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 اگست 2023

کیرلہ

تحقیق اور اخلاقیات

کالی کٹ: معیاری بحث و تحقیق کے دوران اخلاقی اصول اور اس کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا اور اس کی رعایت کے ساتھ تحقیقی مقالہ تیار کرنا نہایت ضروری ہے، اخلاقیات ریسرچ کے جملہ اصول و عناصر میں سے ایک ہے جس کا لحاظ کیے بغیر معیاری اور مفید ریسرچ کا تصور ممکن نہیں، بحث و تحقیق کے دوران مصادر و مراجع اور جدید وسائل کا استعمال بڑی احتیاط، سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ کرنا چاہیے تاکہ ایسا ٹھوس ریسرچ وجود میں آئے جو انسانی دنیا کو ترقی کی نئی بلندیوں تک پہنچا سکے اور نئے نئے علوم و معارف سے روشناس کرا سکے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے استاذ پروفیسر محمد قطب الدین نے شعبۂ عربی برائے پی جی اینڈ ریسرچ، فاروق کالج، کالی کٹ، کیرالہ کے زیر اہتمام تحقیق اور اخلاقیات کے موضوع پر منعقد لیکچر سیریز کے اپنے چوتھے لیکچر میں کیا۔ انھوں نے عربی زبان میں خطاب کرتے ہوئے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ہر میدان میں دن بدن ریسرچ کا معیار گرتا جا رہا ہے اور نئی نسل معیاری ریسرچ سے کوسوں دور ہوتی جا رہی ہے۔ ریسرچ کے دوران اخلاقی اصول کی ان دیکھی ممنوع اور ناقابل قبول ہے۔ موصوف نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ریسرچ کے دوران سطحی معلومات جمع کرنا اور انھیں اپنی ریسرچ کی بنیاد بنانا انسانی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

مزید یہ کہ ریسرچ اسکالرز اپنی دلچسپی کے مطابق ہی تحقیق کا موضوع منتخب کریں اور اپنا ریسرچ گائیڈ ان کے اختصاص کے مطابق ہی اختیار کریں ورنہ اس کے برعکس حالات میں کی گئی ریسرچ نہ تو اسکالر کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی سماج کے لیے کارآمد بلکہ اوقات اور وسائل دونوں ضائع ہوتے ہیں۔ اس لیکچر میں فاروق کالج کے علاوہ کیرالہ کی کالی کٹ یونیورسٹی و دیگر کالجوں کے اساتذہ و طلبا نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس سیشن کی صدارت فاروق کالج نے شعبۂ عربی پی جی اینڈ ریسرچ کے صدر ڈاکٹر یونس سلیم نے کی جب کہ ڈاکٹر عباس کے پی نے استقبال پیش کیا اور ریسرچ فورم کے کوآرڈینیٹر جناب فتح اللہ احسان نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اگست 2023

لداخ

جدوجہد آزادی اور اردو شاعری

کرگل: شعبۂ اردو کرگل کیمپس یونیورسٹی آف لداخ میں محترمہ کنیز فاطمہ (ریکٹر کرگل کیمپس) کی زیر سرپرستی اور

ڈاکٹر جعفر علی خان (کوآرڈینیٹر شعبۂ اردو) کی زیر نگرانی ایک آن لائن توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں یونیورسٹی آف دہلی کے استاد پروفیسر ابوبکر عباد نے 'جدوجہد آزادی اور اردو شاعری' کے موضوع پر اپنا بلیغ و بسیط اور معلوماتی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر موصوف نے اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری' میں ہمیں ابتدا سے ہی جدوجہد آزادی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اردو شعرا نے نہ صرف یہ کہ اردو شاعری کے ذریعے تحریک آزادی میں حصہ لیا بلکہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ دوران خطبہ انھوں نے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ محققین و ناقدین نے مرد شعرا کے کردار کو آزادی کی جدوجہد میں اہمیت بخشی ہے، مگر جن خواتین شاعرات نے تحریک آزادی میں حصہ لیا انہیں ناقدین و محققین نے نظر انداز کر دیا ہے، جس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر نثار احمد ڈار نے پروفیسر موصوف کا مختصر تعارف پیش کیا۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر محمد رفیع نے نظامت کا فریضہ انجام دیا اور اظہار تشکر کی رسم ڈاکٹر محمد عیسیٰ نے ادا کی۔ اس تقریب میں متعدد ناظرین اور مختلف شعبوں کے اساتذہ و طلبا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بحوالہ قندیل آن لائن ڈاٹ کام

اجرا

مولانا ابوالکلام آزاد: اے لائف

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے 'مصنف سے ملاقات' پروگرام میں ممتاز اسکالر پروفیسر سید عرفان حبیب کی کتاب 'مولانا آزاد: اے لائف' کی رسم اجرا انجام دی۔ کتاب پر مباحثہ کے ساتھ مولانا آزاد چیئر شعبۂ ترسیل عامہ و صحافت کی جانب سے دو روزہ پروگرام 'مولانا ابوالکلام

آزاد' کا اختتام ہوا۔ مباحثہ میں پروفیسر امتیاز حسنین، چیئر پروفیسر، مولانا آزاد، مانو، پروفیسر محمد سجاد اے ایم یو، ڈاکٹر شاو نارا وڈریکس، ارلی کیریئر فیلو، کولمبیا یونیورسٹی، امریکہ اور ڈاکٹر عامر علی، جے این یو، دہلی نے حصہ لیا۔ پروفیسر اشتیاق احمد رجسٹرار بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ ڈاکٹر شاؤ نارو وڈریکس نے عصر حاضر میں مولانا آزاد کی معنویت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے پروفیسر عرفان حبیب کی کتاب پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے کہا کہ کتاب مولانا آزاد سے متعلق ہونے کے باوجود اس میں عصری ہندوستان میں آزاد کے افکار کی معنویت پر اظہار خیال سے گریز نہیں کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد سجاد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 1948 میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقعے پر کی گئی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کس طرح انھوں نے علما کو سیاست میں حصہ لینے کے لیے راضی کیا۔ ڈاکٹر عامر علی نے کہا کہ ''مولانا آزاد جو ہندوستان کے قدآور سیاستداں ہیں نے ہمیں اقتدار کے حصول کی راہ دکھائی ہے۔'' پروفیسر امتیاز حسنین نے مولانا آزاد کے اسلوب کے انتخاب پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کی تقاریر اور مختلف زبانوں پر عبور پر تحقیق ہونی چاہیے۔ جناب دانش اقبال نے مولانا آزاد کی جدیدیت اور اس سے جڑے تصورات پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر دانش معین، صدر شعبۂ تاریخ نے اجلاس کی صدارت کی اور شرکا کی تقاریر پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر فیروز عالم، ایسوی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 اگست 2023

تحریک آزادی اور اردو نثر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر (ڈی ایس ڈبلیو) پروفیسر عبدالعلیم نے ڈپٹی ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی (شعبۂ اردو) کی تصنیف 'تحریک آزادی اور اردو نثر' کا آزادی کا امرت مہوتسو تقریب کے تحت اجرا کیا۔ پروفیسر عبدالعلیم نے کہا کہ یہ کتاب 1857 سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران مجاہدین آزادی کی طرف سے چلائی جانے والی مختلف تحریکوں میں اردو ادیبوں کی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ مجاہدین آزادی جو ادیب و شاعر بھی تھے ان کی خدمات کو بطور خاص نمایاں کیا گیا ہے جیسے کہ مولانا حسرت موہانی جنھوں نے جنگ آزادی کے دوران انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا تھا۔ قابل ذکر ہے کہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی 30 سال سے اردو میں تدریس و تحقیق میں مصروف ہیں اور مختلف موضوعات پر اردو میں دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 27 اگست 2023

اردو طبی ادب میں غیر مسلم اطبا کی خدمات

لکھنؤ: طب یونانی کا رشتہ عام طور پر مسلمانوں سے ہی جوڑا جاتا ہے، جو کہ سراسر غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں غیر مسلم اطبا نے نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ حکیم وسیم احمد اعظمی کی تازہ ترین کتاب 'اردو طبی ادب میں غیر مسلم اطبا کی خدمات' سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر عمیر منظر نے آج لکھنؤ میں نعمانی کیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام کتاب کی رسم رونمائی کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب صرف طب یونانی کی تاریخ کا روشن حوالہ نہیں ہے بلکہ تحقیقی اعتبار سے بھی یہ ایک مستند اور معتبر کتاب ہے۔ حوالہ جاتی کتاب کے طور پر بھی اس کی ایک نمایاں حیثیت ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ موجودہ تناظر میں اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ اس موقعے پر نوجوان قلم کار اور مصنف جناب اویس سنبھلی نے کہا کہ یہ کتاب طب یونانی کے روشن دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ چار سو سے زائد غیر مسلم اطبا کے حالات کو مستند حوالوں کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے اور یہی استناد حکیم وسیم اعظمی کی تحریروں کی پہچان ہے۔ اویس سنبھلی نے کہا کہ لکھنؤ طب یونانی کا ایک اہم مرکز رہا ہے اس حوالے سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ رسم اجرا کے موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کتاب کے مصنف حکیم وسیم احمد اعظمی نے کہا کہ کسی بھی نظام علاج کا اصل مقصد تو مرض سے شفایابی ہے۔ اسے مذہب کے خانوں میں تقسیم کرنے کا مطلب علمی اور فکری افلاس کے سوا کچھ نہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کتاب میں اطبا کی سوانح اور تاریخ کے ساتھ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے مطب کے چند نسخے بھی ضرور نقل کیے جائیں تاکہ ان کے طریقہ علاج کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ جناب

سلمان صدیقی نے حکیم وسیم احمد اعظمی کو ان کی اس اہم تحقیقی کتاب پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اردو کے سرمائے میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اس موقعے پر محمد اطہر خاں ملیح آبادی، صغیر احمد، محمد ارشد، محمد سلیم، محمد اقبال، سعید اختر وغیرہ خاص طور پر شریک رہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 اگست 2023

محبت نام ہے اس کا

نئی دھلی: تازگی اور توانائی سے بھرپور شاعری کرنے والے ایڈوکیٹ زبیر انصاری کے اول شعری مجموعہ 'محبت

نام ہے اس کا' کی رسم رونمائی، مذاکرہ اور مشاعرہ غالب اکیڈمی دہلی میں ہوا۔ مذاکرہ کی صدارت معتبر ناقد و محقق حقانی القاسمی نے کی۔ پروگرام کا اہتمام مشترکہ طور پر شام پیس فاؤنڈیشن اور پوئٹک آتما ٹرانسفارمنگ انڈیا فاؤنڈیشن نے کیا۔ پروگرام کے روح رواں زبیر انصاری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا ارادہ مختلف شہروں میں مزید پروگراموں کا ہے، جن میں مقامی شعرا جنھیں فراموش کردیا گیا ہے انھیں بالخصوص موقع دیا جائے گا تاکہ فنکاروں کے استحصال اور ان کی حوصلہ شکنی کی روش کو ختم کیا جاسکے۔ صدر ذی وقار حقانی القاسمی نے اپنے پرمغز مقالہ میں کہا کہ زبیر کی شاعری میں محبت ہی محبت ہے۔ عداوت، رنجش اور کدورت و کثافت کا گزر نہیں ہے نیز ان کی شاعری کی لوماں کی دعاؤں سے روشن ہے۔ ڈاکٹر خالد مبشر کے مطابق زبیر انصاری کی شاعری میں شریعت اور طریقت کے رنگ موجود ہیں۔ انھوں نے نفرت کی تیز آندھی میں محبت والفت کے چراغ جلانے کی سعی کی ہے۔ معروف صحافی وادیب رضوان فاروقی کی نظر میں زبیر انصاری اپنے لہجہ کے موجد اور خاتم ہیں۔ ان پر کسی کا رنگ نہیں ہے۔ نعمان قیصر کے مقالہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آئی کہ شاعر کے لہجے میں نرمی، شائستگی اور شرافت ہے۔ عبدالباری قاسمی کی رائے میں زبیر انصاری ایک تجربہ کار وسیع النظر شاعر ہیں۔ مضامین میں تنوع اور خیالات میں جدت ہے۔ مذاکرے کی نظامت کررہیں مہر فاطمہ نے لفظ 'ڈھائی اکشر پریم کے' کو کلیدی لفظ قرار دیا اور کہا کہ شاعر کو محاورات کے برجستہ استعمال پر قدرت ہے۔ مشاعرے کی نظامت عالمی شہرت کے حامل ناظم اور شاعر معین شاداب نے اور صدارت کیے بعد دیگرے سید فاروق اور رضوان احمد فاروقی نے کی۔ مشاعرہ میں مقامی شعرا کے ہمراہ لکھنؤ، مغل سرائے، لدھیانہ، برہانپور، جہانگیر آباد، ہردوئی، بھوبنیشور، بجنور، سہارنپور، غازی آباد، احمد آباد، شملہ، چنڈی گڑھ، دیوبند وغیرہ کے شعرا نے شرکت کی۔ شعرا کے اسمائے گرامی یوں ہیں۔ رضوان فاروقی، ڈاکٹر جلیل برہانپوری، پروفیسر رحمٰن مصور، عادل رشید، زبیر انصاری، معین شاداب، ابھیشک تیواری، طاہر سعود، جگجیت سنگھ، کرن سحر، چاند دیوبندی، محسن رحمٰن، وسیم جہانگیر آبادی، اسلم راشد، شارق صدیقی، طارق عثمانی، سید نظم اقبال، سنجیو نگم، راجیش ترپاٹھی، اقرا عنبر، ابوشحمہ، رؤف رامش، خالد اخلاق، سشیل اوجھا۔ واضح رہے کہ انھیں سشیل اوجھا نے زبیر انصاری کو وشوانجلی گروپ کی جانب سے احمد آباد سے آکر ایک مومنٹو اور سند اعزاز سے سرفراز کیا۔ غور طلب ہے کہ اس موقعے پر تمام شعرا کو مذکورہ تنظیموں کی جانب سے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 28 اگست 2023

عابد سورتی کے دو ناول

ممبئی: گجراتی اور ہندی کے معروف قلمکار اور کارٹونسٹ عابد سورتی کے دو ناولوں کی رسم رونمائی 25 اگست کی شام چار بجے باہے پریس کلب میں عمل میں آئی۔ عابد سورتی نے بچوں کے لیے 'نواب رنگیلے' ناول لکھا ہے، جسے نیشنل بک ٹرسٹ نے اردو میں شائع کیا ہے۔ 'نواب رنگیلے' کی رسم رونمائی پنکج چترویدی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ دوسرا ناول 'صوفی: (انڈر ورلڈ کا غائب انسان) ہے جو اب اردو میں شائع ہوا ہے۔ یہ ناول پہلے ہندی میں منظر عام پر آیا تھا اور اسے ہندی سے اردو میں م۔ ناگ (افسانہ نگار، صحافی اور مترجم) نے ترجمہ کیا ہے۔ اس ناول کی رسم رونمائی کوشل جوشی نے کی۔ اس موقعے پر پنکج چترویدی (ایڈیٹر نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی)، کوشل جوشی (نیکس اسٹوری پبلی کیشنز)، رحمان عباس، وقار قادر اور مختار خان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رحمان عباس نے اردو ترجمہ 'صوفی: (انڈر ورلڈ کا غائب انسان)' پر بات کی۔ اسی طرح وقار قادری نے ترجمہ نگار م ناگ (آنجہانی) کا تعارف پیش کیا۔ مختار خان نے ناول نویس عابد سورتی کے فن اور شخصیت کا جائزہ لیا۔ مہمانان میں محمد اسلم پرویز (مصنف)، شاداب رشید (ایڈیٹر نیا ورق)، چترنجن، عرفی اختر، شاہد شیخ اور راجیش دیوان وغیرہ موجود تھے۔ مجموعی طور پر یہ پروگرام بے حد کامیاب رہا اور اس میں متعدد ادیبوں نے شرکت کی۔ محترمہ ویوما مشرا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اگست 2023

پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن کی تین عربی کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: جے این یو کے مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات کی طرف سے کنونشن سینٹر کے کمیٹی روم نمبر 1 میں صدر مرکز پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن کے تین عربی کتابوں کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی جس میں مختلف ممالک کے سفرا، متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ شریک ہوئے۔ نظامت ڈاکٹر سندیسہ ریپا نے کی۔ پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے سعودی عرب کے سفیر برائے ہند صالح بن عیدالحسینی نے کہا کہ پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن کی تین عربی کتابیں ہندوعرب کے قدیم تعلقات کی اہم کڑی ہیں۔ انھوں نے ہندوعرب تعلقات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ ملک عرب ممالک کا آنگن ہے، نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ اقتصادی اور تعلیمی طور پر بھی۔ سعودی عرب اور ہندوستان ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ مرکز کے صدر پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے اپنی تینوں کتابوں کے تعلق سے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ پہلی کتاب ہندی زبان کا شاہکار ناول 'میلا آنچل' کا عربی ترجمہ 'الوشاح المدنس' ہے، دوسری کتاب 'روی حضاریہ' عرب ہند کے تعلقات، مختلف علمی، ادبی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی موضوعات پر مبنی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب پر مشہور عربی ناول نگار اور سوربون یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر واسنی الاعرج کا مبسوط مقدمہ بھی ہے۔ تیسری کتاب 'الترجمة الانجليزية العربية المتقدمة' ہے جو کہ عربی انگریزی اور برعکس زبانوں کے ترجمہ کی کتاب ہے۔ یہ کتاب ترجمہ کے میدان میں

ڈاکٹر شاہینہ تبسم کی مرتبہ کتاب 'ملکہ نسیم کی شعری کائنات' کے اجرا کا منظر

سالوں پر محیط تجربات کا نچوڑ ہے۔اس میں عربی وانگریزی اقتباسات مختلف موضوعات سے متعلق ہیں، مہمان اعزازی اور قطر کے سفیر برائے ہند محمد بن حسن الجابر نے ہندوستان اور قطر کے مضبوط تعلقات پر روشنی ڈالی اور پروفیسر مجیب الرحمٰن کو مبارکباد دی۔ مہمان اعزازی اور عرب لیگ کے سفیر ڈاکٹر محمد یوسف جمیل نے مصنف کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایک ساتھ تین عربی کتابوں کا اجرا مصنف کی علمی وادبی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خصوصی خطاب کرتے ہوئے فلسطین میں ہندوستان کے سابق سفیر پروفیسر ذکرالرحمٰن نے میلا آنچل کے عربی ترجمہ کے بارے میں کہا کہ یہ ایک مشکل ناول ہے، اس میں علاقائی الفاظ اور اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، مگر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے نہایت خوش اسلوبی سے اسے عربی کا خوبصورت جامہ پہنایا ہے۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے جے این یو کے ریکٹر پروفیسر ایس سی گارکوٹی نے کہا کہ جے این یو زبان، ادب، ترجمہ، سماجیات اور سائنس کے میدانوں میں آج کلیدی کردار ادا کر رہا ہے، جس کی ایک جیتی جاگتی مثال آج کا یہ پروگرام ہے۔ پروگرام کے اخیر میں شعبہ عربی کے استاد پروفیسر محمد قطب الدین نے تمام مہمانوں، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں جے این یو کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، اگنو اور ذاکر حسین کالج کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کثیر تعداد میں موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اگست 2023

ملکہ نسیم کی شعری کائنات

جودھپور: ملکہ نسیم ہمارے صوبے کی معتبر شاعرہ ہیں اور ان کی شاعری میں زندگی کے کئی رنگ ملتے ہیں، ان خیالات کا اظہار ممتاز شاعر اور تنقید نگار شین کاف نظام نے بزم اردو اور سروکار کے زیر اہتمام ملکہ نسیم کی شعری کائنات کے اجرا کے موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کیا، اس پروگرام کا انعقاد پروگرام ہوٹل چندرا امپیریل راتاناڈا میں ہوا۔ پروفیسر زماں آزردہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے نسیم کے لہجے کی خوبی کا ذکر کیا، اس موقعے پر دہلی کے ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ نسیم کے یہاں خود کے لہجے کو تلاش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے کہا کہ نسیم نے مشاعرے سے خود کو بچاتے ہوئے اپنی الگ اور منفرد شناخت بنائی ہے اور انھوں نے کبھی معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس موقعے پر نسیم نے اپنی غزل کے اشعار پیش کیے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر نثار راہی نے کی اور آخر میں برجیش عنبر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'وشواس ایکسپریس'، 29 اگست 2023

طرز بیاں اپنا

اورنگ آباد: اقبال اکیڈمی، کتابی سلسلہ عالمگیر ادب،

اورنگ ادب، اورنگ آباد کے اشتراک سے ڈاکٹر عظیم راہی کی تازہ تصنیف 'طرز بیاں اپنا' کی رسم اجرا بروز اتوار بتاریخ 3 ستمبر 2023 کو بیت الیتیم کے عالمگیر ہال میں، ممتاز ادیب واستاد محترم احمد اقبال کے ہاتھوں انجام پائی جبکہ تقریب کی صدارت کہنہ مشق شاعر وادیب، نقاد ومحقق اور تاریخ داں ایڈوکیٹ اسلم مرزا نے کی۔ اس تقریب میں مہمانان خصوصی کے طور پر کہنہ مشق شاعر پروفیسر شاہ حسین نہری، معروف فکشن نگار نورالحسنین، ڈاکٹر ارتکاز افضل، محترم خالد سیف الدین، ڈاکٹر یوسف صابر اور ڈاکٹر مسرت فردوس صاحبہ نے شرکت کی۔ محمود شکیل، فاروق شمیم اور ڈاکٹر شہاب افسر تقریب کے مہمان اعزازی تھے۔ ڈاکٹر اسود گوہر اور خان محمد یاسر نے زیر نظر کتاب پر اپنے مضامین پیش کیے۔ ان کے بعد مہمانان خصوصی نے صاحب اعزاز ڈاکٹر عظیم راہی اور ان کی تازہ تصنیف کے حوالے سے ان کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر عظیم راہی نے جذباتی انداز میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں صدر محفل اسلم مرزا نے اپنے صدارتی کلمات سے نوازا اور ڈاکٹر عظیم راہی کو اس کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کی۔

واضح ہو کہ ڈاکٹر عظیم راہی کی یہ چودھویں تصنیف ہے۔ اس سے قبل افسانوں کے تین افسانچوں کے تین اور افسانچہ کی تحقیق وتنقید پر دو کتابوں کے علاوہ تبصروں اور مضامین کے دو مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ تازہ تصنیف، ادب کی ممتاز ومقبول شخصیات پر تاثراتی مضامین خاکے نما اور خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس محفل میں بڑی تعداد میں اہلیان شہر کے علاوہ علمی وادبی مقتدر شخصیات، ادیب وشاعر اور کئی ادب دوست حضرات شریک تھے۔ اس شاندار تقریب رسم اجرا کی نظامت احمد اورنگ آبادی نے بحسن وخوبی سے انجام دی اور اس یادگار تقریب کا اختتام نوجوان شاعر عمران رضوی کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں کنوینز احمد اقبال، ڈاکٹر اشفاق اقبال، احمد وسیم اور محمد تفہیم الدین نے کلیدی رول ادا کیا۔ پریس ریلیز: عظیم راہی، اورنگ آباد، 4 ستمبر 2023

کہانی پنجاب

علی گڑھ: پنجابی وغیر پنجابی کہانیوں، افسانوں وپنجابی ادبیات کے مشہور سہ ماہی جریدے 'کہانی پنجاب' کے 103 ویں شمارہ کا اجرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے چیئرمین پروفیسر محمد عاصم صدیقی نے جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبہ میں منعقدہ ایک تقریب میں کیا۔ اس جریدے کو اے ایم یو میں پنجابی زبان کے استاد پروفیسر کرانتی پال نے ایڈٹ کیا ہے۔ 103 ویں شمارہ کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر عاصم صدیقی نے کہا کہ 'کہانی پنجاب' ایک اہم جریدہ ہے جو نہ صرف پنجابی بلکہ دیگر زبانوں کے ادب کو بھی خاص جگہ دیتا ہے اور اس طرح پنجابی کے قارئین کو دیگر زبانوں کے ادب سے متعارف کراتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ''کہانی پنجاب نے ادبی اصناف بالخصوص کہانی اور افسانے میں ایک مقام حاصل کیا ہے جو ابھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی تو کرتا ہی ہے، ساتھ ہی قارئین کو مختلف ہندوستانی اور دنیا کی دیگر زبانوں کی کہانیوں سے بھی متعارف کراتا ہے جو کہ بہت گرانقدر خدمت ہے۔'' پروفیسر صدیقی نے کہا کہ کہانی پنجاب کئی برسوں سے ہماچل پردیش کے ڈلہوزی میں کہانی گوشٹھی یعنی کہانی پڑھنے کے سیشن کا بھی انعقاد کرتا آرہا ہے جہاں مختلف زبانوں کے کہانی کار اور نقاد ادب کی اصناف و جہات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس میں علی گڑھ کے ادبا بھی شریک ہوتے رہے ہیں۔ پروفیسر صدیقی نے مزید کہا پنجاب کی تدوین و اشاعت کا آغاز ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ناول نگار اور کہانی نویس رام سروپ انکھی نے 1993 میں کیا تھا اور انھوں نے اس کے 67 شمارے مرتب کیے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے پروفیسر کرانتی پال 68 ویں شمارے سے یہ ذمے داری نبھا رہے ہیں۔ کہانی پنجاب کی مسلسل اشاعت کو سراہتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کو ہمیشہ وقت پر شائع کیا، اسی طرح کہانی پنجاب کا ہر شمارہ وقت پر شائع ہوتا ہے جس سے ایڈیٹر اور ان کی ٹیم کی لگن کا اندازہ ہوتا ہے۔ جریدے کے 103 ویں شمارے کے مندرجات پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر کرانتی پال نے بتایا کہ اس میں ہندوستانی کہانیوں کے زمرہ میں 12 ہندوستانی زبانوں کی کہانیاں شامل ہیں جن میں عبدل بسم اللہ (ہندی)، ولسالن وتھوسیری (ملیالم)، راجیشور سنگھ راجو (ڈوگری)، رام ناتھ رائے (بنگالی)، دیوی پرساد داش (اوڈیہ)، ہجم گنا سنگھ (منیا پوری)، رامیشور گودارا (راجستھانی)، جی آر مہرشی (تیلگو)، جی بی پربھات (انگریزی)، مدھو رائے (گجراتی)، غلام عباس (اردو) اور ریمن (پنجابی) وغیرہ کی تخلیقات قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس شمارے میں سینئر پنجابی کہانی نویس پریم پرکاش کی ایک ادبی تحریر، پروفیسر محمد سجاد کا مضمون جنگ آزادی اور مسلمان: 1857 تا 1947، بھیشم ساہنی کی یادوں پر مشتمل ایک مضمون اور تاریخ کے احساس پر مبنی انجنی کمار کا مضمون بھی شامل ہے۔ رسم اجرا کی تقریب کے دوران پروفیسر مشتاق احمد زرگر، چیئرمین شعبہ جدید ہندوستانی زبانیں، پروفیسر ٹی این ستھیسن، پروفیسر نجم اے، ڈاکٹر طاہر ایچ پٹھان، ڈاکٹر پٹھان قاسم خان، ڈاکٹر آر تمل سیلون اور دیگر افراد موجود رہے۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی 12 اگست 2023

وفیات

شہباز حسین

نئی دھلی: ماہنامہ آجکل کے سابق مدیر شہباز حسین کا مختصر علالت کے بعد ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لنگ انفیکشن کے سبب انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 92 برس تھی۔

پسماندگان میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ خاندانی ذرائع کے مطابق 15 دن قبل انھیں یہاں کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لنگ انفیکشن کے سبب داخل کرایا گیا تھا۔ وہ گزشتہ دو دن سے وینٹی لیٹر پر تھے، بیماری سے جانبر نہ ہوسکے اور انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی تدفین میں سرکردہ لوگوں نے شرکت کی۔ شہباز حسین پہلی بار بال مکند عرش ملسیانی کی سبکدوشی پر نومبر 1967 میں 'آجکل' کے مدیر بنے اور اپریل 1972 تک اس عہدے پر رہے۔ دوسری بار ایمرجنسی کے دور میں اپریل 1976 میں مدیر بنائے گئے۔ مارچ 1981 تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ بعد میں ترقی پانے کے سبب ان کا تبادلہ ہوگیا تھا۔ انھوں نے ترقی اردو بیورو میں بھی خدمات انجام دیں۔ آخری عمر تک علمی و ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی رہائش گاہ پر متعدد بار ادبی پروگرام اور مشاعرے بھی ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اگست 2023

ارتضیٰ نشاط

ممبئی: وسیع التجربہ صحافی، کہنہ مشق شاعر اور انقلاب کے قطعہ نگار ارتضیٰ نشاط 22 اگست منگل کی شب رحلت فرماگئے۔

انتقال کے وقت ان کی عمر 85 سال تھی۔ ان کے انتقال کی خبر سے پورے ملک کی ادبی دنیا مغموم ہوگئی۔ ریت کی رسی، تکذبان، کہرام اور واقعی جیسے شعری مجموعوں کے خالق ارتضیٰ نشاط کا تعلق اترپردیش کے مردم خیز شہر بدایوں سے تھا۔ ان کے والد شاہد بدایونی ممتاز شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ارتضیٰ نشاط کو تخلیق شعر کا فن وراثت میں ملا۔ ابتدا میں بی ای ایس ٹی میں ملازمت کی مگر ان جیسے شاعر نے جز وقتی شاعر بننا پسند نہیں کیا چنانچہ ملازمت سے سبکدوشی اختیار کرلی اور شعر و ادب کی خدمت کو اپنا وطیرہ بنا لیا۔ بعدازاں روزنامہ 'انقلاب' سے وابستہ ہوئے۔ یہ وقت وہ تھا جب انقلاب کی ادارت ظ انصاری صاحب کے ذمے تھی۔ ان کی جوہر شناس نظروں نے ارتضیٰ نشاط کی صلاحیتوں کو آنک لیا تھا لہٰذا انقلاب کے ادارتی عملے میں شمولیت کی خود دعوت دی۔ اس طرح وہ اس اخبار سے کم و بیش بیس برس وابستہ رہے۔ انھوں نے ظ صاحب ہی کے اصرار پر انقلاب کے لیے روزانہ ایک ہزل لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور پھر روزانہ قطعہ ان کی پہچان بن گیا۔ انقلاب کے جتنے قاری انھیں الف نون کے نام سے جانتے تھے، اس سے کہیں زیادہ یہ سوچتے رہتے کہ یہ الف نون ہے کون؟ ارتضیٰ نشاط نے شعرگوئی کا سلسلہ تب شروع کیا جب ترقی پسندی کا سورج نصف النہار پر تھا مگر وہ کسی اور جہان کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ روایت سے خوب خوب استفادہ کرتے ہوئے جدیدیت کی راہ پنائی اور اپنی غیر معمولی شعری صلاحیتوں سے بہتوں کو متاثر کیا۔ طبیعت کی بے نیازی مانع نہ ہوتی تو ان کی شہرت اور مقبولیت کا اور ہی جلوہ ہوتا۔ اولین شعری مجموعہ کے ذریعے ہی وہ اپنی دھاک جمانے میں کامیاب ہوگئے تھے جو ہر نئے شعری مجموعے کے ساتھ مستحکم ہوتی گئی۔ ارتضیٰ نشاط کو الوداع کہنے کے لیے ممبئی، ممبرا، نوی ممبئی، بھیونڈی اور کئی دیگر علاقوں کے ادبا، شعرا، ان کے متعلقین اور مداح بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے۔ ایم ایم ویلی قبرستان (کوسہ) میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ان کے کئی اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اگست 2023

حسیب سوز

بدایوں: عالمی شہرت یافتہ شاعر حسیب سوز بدایونی کا 6 ستمبر بروز بدھ شام 8 بجے انتقال ہوگیا۔ انھوں نے 81 برس کی عمر میں اپنے آبائی شہر میں آخری سانس لی اور اعلیٰ پور میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

حسیب سوز کی پیدائش بدایوں کے چھوٹے سے

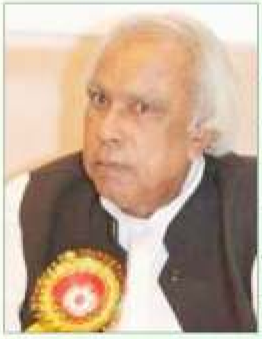

قصبہ اعلیٰ پور میں 5 مارچ 1952 کو ہوئی تھی۔ وہ 'حبو پیڑے والے' کنبہ سے تعلق رکھنے والے واحد شاعر تھے جنھوں نے شاعری میں بلند مقام حاصل کیا۔ سوز نے آگرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ شاعری ان کو بے حد عزیز تھی۔ برسوں بعد (2009)، دھوپ پھر نکل آئی (2017)، چاند گونگا ہوگیا (2019)، دو مٹھی آسمان (2022) ان کے شعری مجموعے ہیں۔ دیوناگری میں بھی ان کی تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ وہ بدایوں سے سہ ماہی رسالہ 'لمحے لمحے' شائع کرتے تھے جس کے 24 سے زائد خصوصی شمارے شائع ہوچکے ہیں جن میں بشیر بدر، زبیر رضوی، مظہر امام، جگن ناتھ آزاد، وسیم بریلوی، راحت اندوری، دلاور فگار، رام لعل، مقیم اثر، مدھور یما سنگھ، کے کے سنگ مینک اکبرآبادی کے علاوہ چندر بھان خیال کی طویل نظم 'لولاک نمبر' بھی شامل ہے۔

حسیب سوز تقریباً 357 مشاعروں میں بدایوں کا پرچم بلند کرچکے تھے۔ انھوں نے ریڈیو ٹیلی ویژن کے لیے ناٹک وڈرامے بھی لکھے۔ ان کو شاعری کی خدمات پر کئی اعزازات بھی مل چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 ستمبر 2023 اور دیگر ذرائع

بدر اورنگ آبادی

اورنگ آباد: اردو کے معروف افسانہ نگار، شاعر اور صحافی بدر اورنگ آبادی کا 7 ستمبر 2023 کو گیا میں انتقال ہوگیا۔ تدفین نیو کریم گنج گیا میں ہوئی۔

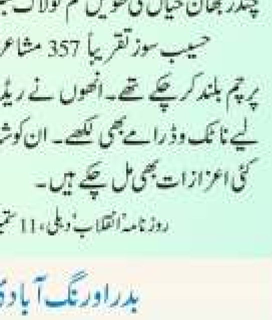

ان کا اصل نام سید بدرالدین قادری ہے۔ اورنگ آباد بہار میں یکم جنوری 1927 کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے بی این کالج پٹنہ سے اردو میں بی اے کی ڈگری لی اور انھیں سفٹن گولڈمیڈل سے نوازا گیا۔ تعلیم کے بعد تلاش معاش میں وہ کلکتہ چلے گئے جہاں انھوں نے ربر فیکٹری میں اکاؤنٹس کلرک کی ملازمت کرلی۔ کلکتہ چھوڑ کر جب آبائی وطن اورنگ آباد واپس آئے تو کچھ عرصے بعد انھیں اکاؤنٹنٹ جنرل بہار رانچی کے دفتر میں آڈیٹر کی ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد انھوں نے ایس اے ایس کے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے اکاؤنٹس آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور 31 دسمبر 1984 کو مگدھ یونیورسٹی کے سینئر اکاؤنٹس ایڈوائزر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے دوران بھی ان کا شعروادب اور صحافت سے رشتہ قائم رہا۔ کئی اخباروں سے ان کی وابستگی رہی۔ کچھ اخباروں میں انھوں نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کا کام بھی کیا، بعد میں وہ صحافت کے میدان میں متحرک اور فعال بھی ہوئے۔ انھوں نے ہفتہ وار 'بودھ دھرتی' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیں اور اس میں بہت سارے اداریے اور مضامین بھی لکھے۔ کلام حیدری کے ہفتہ وار 'مورچہ' میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے تھے جس کا ایک مجموعہ 'دروغ گویاں' کے نام سے 2003 میں شائع ہوا۔

بدر اورنگ آبادی ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ لالچی (1975)، رگِ سنگ (1983)، اگر روشنی نہ ہوتی (2003) ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ شاعر بھی تھے، ان کا شعری مجموعہ 'خواب آرزو' کے نام سے 1999 میں شائع ہوا۔ تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ 'افکار منتشر' شائع ہوا۔ ان کی ایک اہم کتاب 'اردو سیکھیں' ہے جو ہندی سے اردو سیکھنے کا قاعدہ ہے۔ دینی مضامین کا مجموعہ 'سفید وسیاہ' کے نام سے شائع ہوا۔ انھیں مختلف اکادمیوں کی طرف سے انعامات بھی ملے۔ مگدھ یونیورسٹی میں ان پر پی ایچ ڈی بھی ہوچکی ہے۔ مرزا غالب کالج کے استاد ڈاکٹر شفقت رعنا نے 'بدر اورنگ آبادی حیات وخدمات' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار سید احمد قادری ان کے صاحب زادے ہیں۔

فیس بک اور دیگر ذرائع

انور نزہت

نئی دہلی: معروف فکشن نگار انور نزہت کا طویل علالت کے بعد 7 ستمبر بروز جمعرات صبح انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اپنی آخری سانس بٹلہ ہاؤس میں واقع اپنی رہائش گاہ پر لی۔ ان کی عمر 85 برس تھی۔ ان کی تدفین 7 ستمبر کو بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔

انور نزہت کا اصل نام انوری بیگم ہے۔ ان کی پیدائش آگرہ میں 1938 میں ہوئی۔ 1952 میں ان کی شادی

ہوئی۔ انور نزہت نے 1956 میں پہلی کہانی 'شکار' لکھ کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہ کہانی ماہنامہ 'بانو' میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے دس سے زائد کتابیں تحریر کیں جن میں 2 ناول 5 افسانوی مجموعے، ایک خودنوشت اور خاکوں کا ایک مجموعہ شامل ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں نئی روشنی (1976)، سفید سناٹا (1986)، قربتوں کے فاصلے (1998)، تنہائی کا زہر اور موسموں کے رنگ شامل ہیں۔ ان کے دو ناول 'رنگین کانٹے' (1975) اور 'درد کے رشتے' (2002) ہیں جب کہ ان کی سوانح حیات 'بکھرے رنگوں کی خوشبو' (سرگزشت، 2012) کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ وہ پندرہ روزہ 'ہم قلم' کی مدیرہ بھی رہی ہیں اور ادبی تنظیم بنات کی سرپرست بھی۔ کئی اکادمیوں کی طرف سے انھیں انعامات بھی ملے ہیں۔ انھیں امریکہ کی شہریت ملی ہوئی تھی اسی لیے وہ امریکہ میں بھی مہینوں قیام کرتی تھیں۔ ان کے انتقال پر تنظیم بنات اور بزم القلم نے تعزیت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 ستمبر 2023 اور دیگر ذرائع

نسیم عارفی

حیدرآباد: حیدرآباد کے سرکردہ اردو صحافی جناب نسیم عارفی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی صحافتی خدمات تقریباً پانچ دہائیوں پر محیط تھی۔ وہ کافی عرصے سے علیل تھے۔ ان کے انتقال کی اطلاع پر نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر کے اردو صحافتی گوشوں میں صدمہ کی لہر دوڑ گئی۔ مخصوص طرز تحریر کی وجہ سے اردو صحافتی حلقوں میں وہ سرکردہ مقام کے حامل تھے۔ انھوں نے روزنامہ رہنمائے دکن سے اپنی صحافتی خدمات کا آغاز کیا تھا۔ بعد ازاں وہ روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوئے، جہاں پر اداریہ لکھنے کا بھی انھیں اعزاز حاصل تھا۔ ان کی گوناگوں صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے خان لطیف خاں مرحوم نے منصف اخبار کی نئی صورت گری میں ان کا انتخاب کیا تھا۔ عارفی نے روزنامہ منصف کے ہردن نئے سپلیمنٹ اور اخبار کی تخلیقی سرخیوں کے ذریعہ ہندوستان میں اردو صحافت کو ایک نیا رخ دیا تھا۔ تقریباً سات سال تک منصف کو اردو صحافت کی نئی بلندیوں تک پہنچانے کے بعد انھوں نے روزنامہ اعتماد

سے اس کی ابتدا سے ہی وابستگی اختیار کرلی۔ جہاں انھوں نے شبانہ روز مساعی کے ذریعہ روزنامہ اعتماد کو نئے قالب میں پیش کیا۔ یہاں بھی انھوں نے یومیہ سپلیمنٹ کو قارئین کی دلچسپی کا ذریعہ بنایا۔ عارفی تخلیقی و تحقیقی صحافت کے حامل تھے۔ وہ روایتی خبروں کو صحافت کے لیے موت تصور کرتے تھے۔ انھیں مختلف یونیورسٹیوں میں صحافت پر لکچر کے لیے بھی مدعو کیا گیا۔ ان کی زندگی سے جڑی اہم یادوں میں ای ٹی وی اردو سے ان کی وابستگی بھی شامل ہے۔

روزنامہ 'پرتاپ' دہلی، 20 اگست 2023

عبدالرحمٰن صدیقی

ممبئی: معروف صحافی عبدالرحمٰن صدیقی شام تقریباً سات بجے اپنے مالک حقیقی سے جاملے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ اخبار روزنامہ ہندوستان میں انھوں نے موت کو گلے لگا لیا جہاں سے تقریباً چالیس سال قبل انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ 2016 میں جاری ہوئے روزنامہ ممبئی اردو نیوز کے مدیر رہے اور فی الحال اخبار ہذا کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹا ہیں جو کہ آئی ٹی سے وابستہ ہے۔ عبدالرحمٰن صدیقی 64 سال کی عمر میں بھی سرگرم تھے۔ آج بھی وہ آپریٹر کے ساتھ بیٹھ کر مضمون ٹائپ کروا رہے تھے، اس وقت انھیں بے چینی ہوئی اور چند لمحے میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ تدفین ان کے رشتہ داروں کے کانپور سے ممبئی آمد کے بعد مضافاتی شہر ممبرا میں ہوئی۔ تقریباً چالیس برس قبل 1982 میں مرحوم اترپردیش کے شہر کانپور سے ممبئی تشریف لائے اور روزنامہ ہندوستان سے بحیثیت مترجم وابستہ ہوئے اور اپنا صحافتی سفر اسی اخبار سے شروع کیا۔ انھوں نے ممبئی کے تقریباً سبھی اخبارات میں ملازمت کی، لیکن وہ کہیں پابند نہیں رہے، ممبئی کے علاوہ دہلی اور کانپور کے اخبارات میں بھی کام کیا۔ روزنامہ ہندوستان سے قریبی لگاؤ رہا بلکہ ان کی بیٹھکیں یہیں رہتی تھی۔ انھوں نے کئی نوجوانوں کو تربیت دی اور صحافت سے وابستہ کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 2 ستمبر 2023

ماسٹر مسیح الدین شاذی

ارریہ: معروف شاعر اور معلم مسیح الدین شاذی کا انتقال 21 اگست کو ہوا۔ مسیح الدین شاذی ارریہ شہر کے رامپور

کدرکٹی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ تدریس کے میدان میں ان کی ایک الگ شناخت تھی۔ اپنی بہترین شاعری کے حوالے سے وہ جانے جاتے تھے۔ بہت سے اسکولوں سے ان کی وابستگی رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں رامپور کودرکٹی کے اسکول سے اور اعلیٰ تعلیم پورنیہ یونیورسٹی حاصل کی تھی۔ مرحوم شہر و اطراف کی علمی اور ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ ان کا شمار قادر الکلام شاعروں میں ہوتا تھا۔ وہ ارریا کے اے پی ایس اسکول کے بانی وائس پرنسپل تھے جب کہ فی الوقت وہ بہار حکومت کے محکمہ تعلیم میں بطور ہیڈ ماسٹر فعال تھے۔ ان کی پوسٹنگ ضلع کے پلاسی بلاک میں اپ گریڈ ڈ مڈل اسکول موہنیا میں تھی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہیں۔

پریس ریلیز: عبدالغنی، ارریا، 5 ستمبر 2023

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................... بتاریخ.................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

لسانی مطالعے

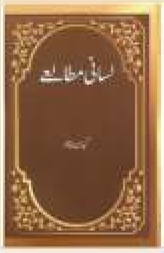

مصنف: گیان چند

پانچویں اشاعت: 2023

صفحات: 232

قیمت: 145 روپے

مولانا آزاد اور ہندوستانی قوم کی تعمیر

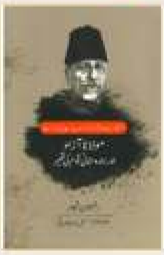

مصنف: رضوان قیصر

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 425

قیمت: 240 روپے

پریم چند باتصویر سوانح

مصنف: کمل کشور گوئنکا

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 92

قیمت: 80 روپے

کلیاتِ پریم چند جلد 9

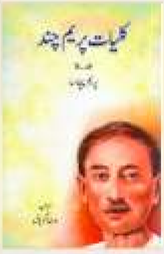

مرتب: مدن گوپال

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 616

قیمت: 335 روپے

اصول تعلیم

مصنف: خواجہ غلام السیدین

چھٹی طباعت: 2023

صفحات: 376

قیمت: 215 روپے

زبان اور قواعد

مصنف: رشید حسن خاں

چھٹی طباعت: 2023

صفحات: 406

قیمت: 225 روپے

پنڈت بدری ناتھ سدرشن

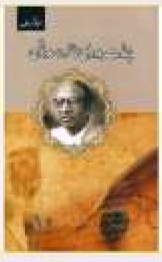

مصنف: الف ناظم

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 132

قیمت: 100 روپے

بشر نواز

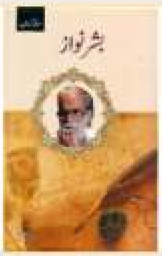

مصنف: صابر

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 145

قیمت: 105 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अक्तूबर-२०२३,वर्ष:२५, अंक:१०
URDU DUNIYA Monthly, October-2023, Vol.25, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2023
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6